

نمبر 8

دیکر

دیکر شمع

URDU TUBE

A HUB OF ENTERTAINMENT

www.urdu-tubes.com

اندونی صفحات
ملاحظہ فرمائیں

چاندنگ روپ آفہ پليکيشنز

دکن

دکن آل پاکستان نوز عجمي رسوسائٹی
دکن نوز آل پاکستان نوز عجمي راليہ طرز

MEMBER
APNS
CPNE

بانی ————— محمود بابو فصل

نیکران ————— محمود ریاض

مدیرہ ————— نادرہ خاتون

مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود

نائب مدیرہ ————— شعاع عمیر

مدیرہ خصوصی ————— اصمت الصبور

ارستہارات ————— خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ————— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈووکیٹ اینڈ لیکل کونسلرز



محمد
تعت

نسرین تہمت سبزواری 11
مصححہ 11



محمد علی خوشن 12
شاین رشید
آواز کی دنیا سے 21
اسمچو پیدی
میری بھی سنتے 17
سید انوار رسول
مقابلہ آئینہ 26
طاہر مغل



ساگر خانے 154
اکٹیفور
جنگ 78
شبنہ گل



شام رنگ سیاہ 132
ایمل رضا
مجاورہ 50
راجہ افتخار
پنچ پھلاں لانی 219
گل ارباب



اللہ کی مرضی 43
صباح علی
آئینہ اور مشارب 187
ریحانہ آفتاب
وٹہ سٹہ 126
فریدہ فرید



ہوا میں رخ بدل گئیں 28
نگہت عبداللہ
شب نیم کی سحر 198
خیچ چوہدری



زور سالانہ بدلیعہ ریگسٹری
پاکستان (سالانہ) 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین، واغٹ اور ادارہ خواتین واغٹ کے تحت شائع ہونے والے مہینہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی جیکل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

کرن کتاب

- 3 بیوٹی کلینک ادارہ
5 فیشن اور اسٹائل ادارہ
6 صحت ادارہ
8 ٹیکنالوجی ادارہ
9 نفسیاتی اور معاشرتی مسائل ادارہ
10 باغبانی ادارہ
11 سچن اور آپ، صائمہ سحر
13 کرن کا دسترخوان خالہ جیلانی
16 مجھے شعر پسند ہے شگفتہ سیلوان
17 مسکراتی کرتیں، رونا بیستہ شریف
18 موتی مٹھنے ہیں ادارہ

مستقل سلسلے

- 235 کرن کرن خوشبو، شعاع عمیر
236 یاد دلاؤ گے دیکھ کے سنے بشری محمود
238 نامے میسر نام، مدیرہ کرن

نومبر 2018

جلد 41 نمبر 8

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ ۲۰۱۵ء تک ۴۴۷۷۷۷۷۷۷۷۷۷۷۷

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



ایسا ممکن نہیں کہ زندگی میں سب کچھ ہماری مرضی اور منشاء کے مطابق ہو۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہم اس چیز کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے مزاج کے خلاف ہوتی ہیں۔ بسا اوقات ہمارے اپنے ہی ہمارے دل کو محسوس پہنچا دیتے ہیں۔ اکثر ایسے موقعوں پر ہمارا رویہ عملیت پسندانہ اور شدت آمیز ہوتا ہے۔ ہم فوری رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خواہاں سلسلے والے کو کبھی کبھی سلسلے میں دیر نہیں لگاتے۔ انفرادی طو پر ہی ہیں، اجتماعی طو پر بھی اکثر اس چیز کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

برداشت، تحمل اور دروادی کا عنصر ہمارے معاشرے سے رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ باقاعدہ دوسرے کا نقطہ نظر نہ، سمجھنے اور برداشت کرنے کی عادت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دلیل کا جواب دلیل سے نہیں کالیوں سے دیا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر ہم سوشل میڈیا پر دیکھ سکتے ہیں۔ انفرسٹ ناک بات یہ ہے کہ اپنے موقف کو منوانے کے لیے ہم برے سے بڑا الزام لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اس کا نتیجہ پیش تر صورتوں میں بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔

ہم جس نبی کے پیروکار ہیں، ان کی پوری زندگی عفو و درگزر اور برداشت کا نمونہ ہے۔ آپ نے اپنے پیروکاروں کو بھی معاف کر دیا۔ کبھی سخت زبان استعمال نہیں کی۔ ہم جو خود کو خیر سے ان کی اہمیت کہتے ہیں، ہم محولی سے نظریاتی اختلاف پر کالم نگار اور بد زبانی کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں۔ معاشرے کو بدلنے کے لیے پہلے خود کو ادب اپنے گھر کو ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنے اور برداشت کرنے کی عادت ڈالیں۔ ایک خوش گوار معاشرہ اسی طرح جنم لے سکتا ہے۔

اس شمارے میں،

- ، ادا کا محمد علی جوش سے شاہین رشید کی ملاقات ،
- ، ادا کا سید افرات رسول کہتے ہیں میری بھی سنیے ،
- ، آواز کی دُنیا سے اس ماہ مہمان ہیں ”آر جے اسد جوہری“ ،
- ، اس ماہ ”عابدہ مغل“ کے ”مقابلہ ہے آئینہ“ ،
- ، نگہبخت جہانداز کا سلسلے ”دارناول“ ہوا میں ”رخ بدل گئیں“ ،
- ، شب نم نمی سحر، ”رخ جوہری کا سلسلے ”دارناول“ ،
- ، ساگر کناٹا ہے ”ام طیفور کا مکمل ناول“ ،
- ، شہید محمل کا مکمل ناول ”جنگ“ ،
- ، شام رنگ سیاہ ، ”ایمل رضا کا ناولٹ“ ،
- ، رابعہ افتخار کا ناولٹ ”مجاہد“ ،
- ، ”بیچ بھلاں رانی“ کل ارباب کا ناولٹ ،
- ، مصباح علی سید فریدہ فریدہ اور رحمتہ آفتاب کے افسانے ،
- اور مستقل سلسلے ،

گھر کا کتاب ،

بہنوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ”کرن کتاب“ کے نئے ایڈیٹر کو مبارکباد۔ اگر آپ کو بھی حسن و صحت سے متعلق کوئی مسئلہ درپیش ہے تو ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کیجئے ماس کے علاوہ اگر کسی سماجی یا نفسیاتی مسئلے کے متعلق کوئی رہنمائی چاہیے یا آپ چاہتی ہیں اس کے بارے میں معلومات دی جائیں تو آپ ہم سے مشورہ لے سکتی ہیں۔

سُؤَالِ مَقْبُول

حکمت

حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے
سلام کے لیے حاضر قلام ہو جائے
میں صرف دیکھ لوں ایک بار صبح طیبہ کے
بلا سے پھر مری دنیا میں شام ہو جائے
تجلیات سے ممبروں میں اپنا کاسہ میاں
کبھی جو ان کی گلی میں قیام ہو جائے
حضور آپ جو سن لیں تو بات بن جائے
حضور آپ جو کہہ دیں تو کام ہو جائے
حضور آپ جو چاہیں تو کچھ نہیں مشکل
سمٹ کر فاصلہ یہ چند گام ہو جائے
مرا تو جب ہے فرشتے یہ قبر میں کہہ دیں
صبحِ مدحتِ خیر الانام ہو جائے
صبحِ رحمانی

ہماری تعالیٰ

حکمت

ترے کرم سے ہی قائم ہے زندگی کا چمن
ہر اک جمال کا تیرا ہی عکس پیرہن
ترے خیال سے رنگینیاں زمelnے میں
تیرے ہی ذکر سے رعنائیاں فلنے میں
ہر ایک رنگ میں تیرا کمال ہے ہر سُر
ہر اک کلی میں ہر اک پھول میں ہے تو ہی تو
ترے بغیر میں خود سے بھی آشنا نہ رہوں
کہوں تو تیرے سوا کس سے دل کی بات کہوں
جز اسزا کا تعین نہیں یہاں مقصود
ہے اس کے واسطے اک اور آسمان موجود
نسرین نکہت سبز داری

محمد علی جوش سے ملاقات

شاہین رشید



میں ”یہ بھی ”ہم نیٹ ورک“ سے آن ایر ہے جبکہ ”رٹنگ“ ایکسپریس انٹرنیٹسٹ اور ”تین خالہ کی بیٹیاں“ اے آر وائی سے آن ایر ہے اور کچھ انڈر پروڈکشن ہیں انہیں ابھی دیر ہے اس لیے ذکر فضول ہے۔“

”اور فلم؟“

”ہم ہیرو ہیں“ ایکشن لوانسٹوری ہے۔ بس دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے فلم میں بھی کامیاب کرے۔“

”ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ آپ کا نام ”محمد علی جوش“ ہے تو کیا یہ نام جوش بخ آبادی سے متاثر ہو کر رکھا تھا؟“

”جوش بخ آبادی سے متاثر ہو کر میرے دادا نے اپنا تخلص رکھا تھا..... اور وہ خود بھی بہت اچھے

بارعب شخصیت کے مالک اس ہیرو ٹائپ فنکار آج کل آپ ہر دوسرے یا تیسرے ڈرامہ سیریل سوپ میں دیکھ رہے ہیں۔ اونچے قد کاٹھ کا یہ ہیرو دن فلموں کا ہیرو بھی بنے گا بس نظر پڑنے کی دیر ہے ڈائریکٹر کی..... ڈراموں میں تو اپنی شخصیت اور فام منس سے ناظرین کو متاثر کرنے میں خاصے میاب ہوئے ہیں۔

”جی..... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”ہوں گلد..... اور کیا مصروفیات ہیں۔ کیا

ن ایر ہے کیا آنے والا ہے؟“

”جو آن ایر ہے ان میں ”میں ہار نہیں مانوں“ ”یہ ہم“ سے آن ایر ہے اور ”کیسی عورت ہوں

ہوئے اور دیگر لوگ بھی..... اور سچ تو یہ ہے کہ دعاؤں اور سپورٹ سے ہی میں اس فیلڈ میں کام ہوا ہوں۔“

﴿”دعائیں تو کام آتی ہیں مگر اس کے محنت بھی تو بہت کرنی پڑتی ہے۔ یعنی دعا کے ساتھ بھی ضروری ہوتی ہے؟“﴾

شاعر تھے اور ان کے گھر میں کافی ادبی محفلیں سجا کرتی تھیں۔“

﴿”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“﴾
 ”جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا نام محمد علی جوش ہے اور میری امی مجھے پیار سے اُٹو کہتی ہیں اور دوست یار ”اے جے“ (A'J) بلاتے ہیں۔“



”جی بالکل..... میں اپنے شوق کی خاطر کر آیا اور میں نے چھ سات پروڈکشن ہاؤسز میں آڈیو دیے..... ویسے میں تھیٹر میں کام کر چکا تھا..... آڈیشن میں کامیابی کے بعد پہلا سیریل ”عاصم حسین“ کا ”بے تصور“ کیا اور میرا خیال ہے کہ سیریل کی مقبولیت سے مجھے پہچان ملی مگر سیریل ”بخت تو“ نے زیادہ شہرت دی۔ ”اے پلس“ سے تھا۔“

﴿”اتنی اچھی ڈگری لینے کے باوجود اس میں آنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟“﴾
 ”بس شوق تھا..... اور مجھے ہمیشہ

23 جولائی 1991ء کو لاہور میں پیدا ہوا..... مجھ سے بڑی ایک بہن اور ایک بھائی ہیں جبکہ میں گھر میں سب سے چھوٹا ہوں اور جناب میں نے ایم بی اے مارکیٹنگ اینڈ میڈیا میں کیا ہے..... اور چونکہ گھر میں چھوٹا ہوں تو ابھی شادی بھی نہیں کی ہے۔“

﴿”شوہر میں آمد کیسے ہوئی؟“﴾
 ”میری امی کی خواہش تھی کہ میں اگر شوہر میں کام کر رہا ہوں تو کرتا رہوں اس میں کوئی برائی نہیں ہے وہ مجھے سپورٹ کرتی تھیں، جبکہ ابو کی خواہش تھی کہ میں ”بزنس“ کروں..... لیکن جب میں شوہر میں آیا اور میرے ڈرامے پسند کیے گئے تو ابو بھی خوش

کو بتاؤں کہ میری ماما بہت اللہ لوک انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت سپورٹ لیا۔ انہوں نے میرے لیے استخارے کیے۔ کراچی آنے سے پہلے انہوں نے میرے لیے استخارے کیے تو انہوں نے میرے لیے بہت خوب صورت چیزیں دیکھیں آم کے درخت دیکھے، تخت دیکھا۔ اور پھر مجھے کہا کہ بیٹا تو ضرور جا کر اچھی۔ اللہ تجھے کامیابی دے گا۔ اور ان کی دعاؤں سے کامیابی ملی۔ اب گھر میں سب میرے اس کام سے خوش ہیں اور میں خود بھی خوش ہوں۔“

”شوہر کی پہلی کمائی تو پھر ماما کے ہاتھ میں ہی رکھی ہوگی؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ بالکل امی کے ہاتھ میں رکھ دی تھی اور امی بہت خوش ہوئی تھیں۔ اور میں تو اپنی ”ماما“ کے بہت قریب ہوں۔ اپنے سارے مسائل ان ہی سے شیئر کرتا ہوں۔“

”بھئی اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا؟“

”جب میں کسی کی مدد کرنا چاہوں اور کر نہ پاؤں۔۔۔۔۔ کوئی بہت مجبور ہے اور مجھ سے مدد مانگ رہا ہے اور میں اس کی مدد نہیں کر پاتا تو بہت تکلیف ہوتی ہے اور میں والد کے ساتھ بزنس میں اس لیے نہیں گیا کہ اگر مجھے کسی کی مدد کے لیے والد صاحب سے پیسے مانگنے پڑ گئے تو میں کیسے مانگوں گا۔ تو اپنی کمائی بہت ضروری ہے اور ہاں۔۔۔۔۔ جب چیک نہیں ملتے بر وقت تب بھی بہت بے بس محسوس کرتا ہوں۔“

”قسمت پہ کتنا یقین ہے؟“

”قسمت پہ بہت زیادہ یقین ہے۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آج تک جو ملا ہے وہ قسمت سے ہی ملا ہے اور میں دیکھتا ہوں دیگر آرٹسٹوں کو کہ وہ کام لینے کے لیے کتنی محنت کرتے ہیں اور میرا نہیں خیال کہ میں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے یا کام کے لیے کوئی بہت زیادہ محنت کی ہے۔ مجھے جو کچھ ملا ہے قسمت

ٹیوڈر کرنے کا شوق تھا میں طالب علمی کے دور میں لکھتا بھی تھا۔ اداکاری بھی کرتا تھا اور ریویو میں ڈانسز وغیرہ کی ویڈیوز بناتا تھا اور ٹھیٹر کے لیے ڈائریکشن بھی دیتا تھا۔۔۔۔۔ گریجویٹن کے بعد میں نے ایک سال والد صاحب کے ساتھ ان کے سٹوڈیو میں ہاتھ بٹایا۔۔۔۔۔ مگر چونکہ اس فیلڈ میں آنے کا شوق تھا تو والد صاحب کا بزنس جو ان کرنے سے ملے میں دو ہفتوں کے لیے کراچی آیا اور مختلف ڈکشن ہاؤسز میں گیا اور کہا کہ میں ٹھیٹر کر رہا ہوں ایک آرٹسٹ ہوں۔ اگر آپ کے پاس کوئی کمرپٹ ہے اور کیرہ ہے تو آپ میرا ڈائریکشن کر لیں۔ ریکارڈ کر لیں۔ اس کے بعد مجھے اداکاری کے شوق سمجھیں تو مجھے کال کر لیجئے گا۔۔۔۔۔ چھ سات بجے آڈیشن دینے کے بعد میں لاہور آ گیا اور والد صاحب کے ساتھ بزنس کرنے لگا۔“

”پھر کال کب آئی عاطف حسین پروڈکشن سے؟“

”آڈیشن دینے کے بعد لاہور آ گیا مگر ہر وقت سوچا کرتا تھا کہ ”علی تم تو اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھتے ہو مگر کسی نے ایک کال نہیں کی۔ میں نے اپنی ملا جلیوں پہ شک کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ خیر پھر تقریباً آٹھ ماہ کے بعد عاطف حسین پروڈکشن سے کال آئی کہ ایک امیر لڑکے کا کردار ہے اور شکل سے آپ امیر لگتے ہیں۔ کراچی آ جائیں، باج اقساط تک آپ کا رول ہوگا۔۔۔۔۔ تو میں یہی سوچا کرتا تھا کہ بغیر سفارش کے میں بھلا ہیرو کے رول میں کیسے آ سکتا ہوں اور میرے پاس تو کوئی پرچی ہی نہیں تھی۔۔۔۔۔ مگر میں آپ

سیرت کی شخصیت

ماڈل ----- فوزیہ خادمہ
میک اپ ----- روز بیگم ہلالی
فرش گوانٹی ----- منسنی رحمان



مذاق اڑاتے ہیں اور اس طرح کا دوپٹا اختیار کر
ہیں کہ پر فارم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کوئی بھی آپ
مشورہ نہیں دیتا، کوئی بھی آپ کا ہاتھ نہیں پکڑتا
بھی آپ کے ساتھ غلط نہیں ہوتا۔“

”دوستوں کو کیسا پایا؟“

”بڑوں نے تو ہمیشہ یہی کہا کہ بیٹا یہ دوست
باریاں کچھ نہیں ہوتیں..... دوستوں میں زیادہ
نہ گزارا کرو..... تو پہلے مجھے یہ باتیں بری لگتی تھیں
جب پریکٹیکل لائف میں آیا اور دوستوں کو پر
اندازہ ہوا کہ بڑے جو کہتے ہیں سچ کہتے ہیں۔
کے ساتھ غلط کوئی بھی نہیں ہوتا سوائے آپ
والوں کے۔“

”فضول خرچ ہیں؟“

”ہاں..... کھانے پینے کی حد تک فضول
ہوں اور میں نے جب سے کمانا شروع کیا ہے
اپنی کمائی ”ماما“ کو دے دیتا ہوں اور کچھ اپنے
رکھ لیتا ہوں کیونکہ مجھے کپڑے جوتے وغیرہ خرچ
ہوتے ہیں۔ اور ان سے جو پیسے بچ جاتے ہیں

سے بنی ملا ہے تو اوپر والے کا جتنا شکر کروم ہے اور
میں اس بات پہ بھی یقین رکھتا ہوں کہ دعا سے اور
محنت سے قسمت بدل جاتی ہے۔“

”فیلڈ میں آنے کی خواہش اس حد تک تھی کہ
چھوٹا موٹا کردار بھی مل جائے تو غنیمت ہے یا ہیرو
سمجھتے تھے اپنے آپ کو؟“

”اس فیلڈ میں میں اس لیے آیا ہوں کہ مجھے
ہیرو بننا تھا، کیونکہ میں جب بھی آئینے میں اپنے آپ
کو دیکھتا تھا بے ساختہ کہتا تھا کہ ”علی تجھے ہیرو بننا
پہیے“ اور میری چٹھی حس بھی مجھے اس بات پہ اکسانی
تھی کہ میں ہیرو بن سکتا ہوں..... بس پھر قسمت نے
ساتھ دیا اور کامیاب ہوا۔“

”اس فیلڈ میں آ کر کیا کچھ نوٹ کیا، توقعات
کے مطابق سب کچھ ملا یا نہیں؟“

”اس فیلڈ میں لوگوں میں منافقت بہت

دیکھی۔ منہ پہ تعریف کرتے ہیں پیٹھ پیچھے برائیاں اور
کاٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیچا دکھانے کی
کوشش کرتے ہیں..... سیٹ پہ پر فارمنس کے دوران

بخت تو بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا..... مجھے بھی بہت پسند ہے۔ پھر ”آدمی گواہی“ میں ہار نہیں مانوں گی۔“ کیسی عورت ہوں میں بس بہت اچھے ہیں اور سب میرے دل کے قریب ہیں۔“

”اپنے آپ کو عام لوگوں سے مختلف تصور کرتے ہیں؟“

”تصور کیا..... میری زندگی عام لوگوں سے کافی مختلف ہے اور میں جب سے پریکٹیکل لائف میں اور خاص طور پر شو بزم میں آیا ہوں عام شخص کی طرح انجوائے نہیں کر سکتا..... تو ہوگئی نا مختلف۔“

”اس فیلڈ میں صرف اداکاری تک ”فوکس“ رہنا ہے یا کچھ مزید کچھ کرنے کی خواہش ہے؟“

”میں فلمیں بنانا چاہتا ہوں..... اس فیلڈ میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ مجھے کامیاب کرے۔“

”ہفتے کا کون سا دن آپ کو بہت برا لگتا ہے؟“

”تہقہہ.....“ مجھے ہی کیا بلکہ بہت سے لوگوں کو اور خاص طور پر نوجوانوں کو پیر (Monday) کا دن برا لگتا ہے اور لگتا ہوگا کیونکہ اتوار کی چھٹی گزار کر پیر کے دن کام کرنے کو بالکل بھی دل نہیں کرتا۔“

”تو چھٹی کا دن ایسے گزارتے ہیں؟“

”پورا دن آرام کر کے مساج کرواتا ہوں۔ کسی اچھے سے پارک میں جا کر گرین گھاس پہ بیٹھ کر زندگی کا مزا لیتا ہوں یا پھر بہت کلوز فرینڈز کے ساتھ کھانا وغیرہ کھانے چلا جاتا ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ”محمد علی جوش“ سے اجازت چاہی۔

☆☆

منے پھرنے اور کھانے پینے میں اڑا دیتا ہوں۔“

”اس بات کا لالچ نہیں ہے کہ ڈیر سارا پیسہ خوب مزے کروں اور.....؟“

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھ میں لالچ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی سے جتنا دے رہا ہے کافی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ سب کا بھلا ہو، سب کی خیر، کبھی کسی کے لیے نگینوں نہیں سوچتا، ہمیشہ دوسروں کے لیے بھی دعائیں ہی مانگتا ہوں..... اپنے آپ سے مقابلہ کرتا ہوں اور اپنے آپ کو بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہوں..... کسی سے جلتا کڑھتا نہیں۔“

”سیاست میں اگر آگئے تو؟“

”تو جناب، ہیلتھ، ایجوکیشن، پولیس، لاء اینڈ

ڈر اور جتنے بھی ادارے برا کام کر رہے ہیں سب کو مست کر دوں گا۔“

”وقت کی پابندی کرتے ہیں؟“

”منیر نیازی کا ایک مصرعہ ہے کہ ”ہمیشہ دیر کر

تا ہوں۔“ تو میرا بھی یہی حال ہے کہ مجھے ہمیشہ دیر جاتی ہے کہیں پہنچ بھی جانا ہو..... حتیٰ کہ میری کسی جگہ فلائٹ ہے تو ایرپورٹ پہنچنے میں بھی دیر کر دیتا۔“

”اس فیلڈ میں خواتین سے تو روز پالا پڑتا ہو کیا بات بری لگتی ہے ان میں؟“

”بالکل پڑتا ہے بہت سی خواتین میری بہت سی دوست ہیں بس مجھے خواتین میں دو باتیں بہت لگتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نگینو سوچتی ہیں۔ پھر سوال ب بہت کرتی ہیں۔“

”اپنے ہی ڈراموں میں کون سا ڈرامہ بہت پسند ہے؟“

”مجھے اپنے سارے ڈرامے بہت پسند ہیں۔ کیونکہ بہت دل لگا کر اور اپنا سو فیصد اپنے کام کو دیتا ہوں۔ میں نے ایک سیریل کیا تھا ”کم

میری بھی سنتے

سید افراز رسول

شاہین رشید



”ہم دہی بھائی ہیں۔ بڑا بھائی اور میں۔“

(7) ”ڈگری لی؟“

”ڈپلومہ لیا ہے تھیٹر آرٹ میں۔“

(8) ”شادی؟“

”الحمد للہ ہو چکی ہے اور باپ بھی بہن ہوں۔“

(9) ”فیلڈ میں آمد؟“

”اپنی اور گھر والوں کی خواہش سے اس میں آیا اور مجھے اس فیلڈ میں ڈائریکٹر ظفر علی آئے۔“

(10) ”پہلی بار جو کمایا؟“

”اپنے والد کے ہاتھ میں رکھا کہ آج جو

(1) ”میرا نام؟“

”سید افراز رسول۔“

(2) ”پکارا جاتا ہوں؟“

”افو کے نام سے۔“

(3) ”زندگی کے کتنے سال گزار چکا ہوں؟“

”یکم اگست 1984ء میں دنیا میں آیا۔۔۔۔۔“

”حساب آپ خود لگالیں کہ کتنے سال گزار چکا ہوں۔“

(4) ”میرا ستارہ؟“

”اللہ کا شکر ہے عروج پہ ہے۔ ویسے لیو ہے۔“

(5) ”قد؟“

”وہ بھی عروج پہ ہے یعنی 5 فٹ 11 انچ۔“

(6) ”بہن بھائی؟“

ہے؟“
”کہ فضول خرچی نہ کیا کرو..... بھی انسان کماتا
کس لیے ہے۔“

(18) ”کھانا مکمل لگتا ہے اگر؟“

”اگر کھانے کے ساتھ دال نہ ہو۔“

(19) ”ٹریولنگ کا موقع ملے تو کہاں جاؤں

گا؟“

”سعودی عرب۔“

(20) ”لڑکیوں کے لیے کہنا چاہوں گا کہ؟“

”بہت پڑھیں لکھیں اور آپ کو بہت

قابل بنائیں تاکہ زندگی میں کسی کے محتاج نہ ہوں۔“

(21) ”کس کے ساتھ (خاتون) کام کرنا

اچھا لگتا ہے؟“

”سب اچھی ہیں۔ مگر بامر بیسٹ ہیں۔“

(22) ”بچت کی عادت؟“

”توبہ کریں..... تب ہی تو سب کہتے ہیں کہ

فضول خرچی نہ کیا کرو۔“

(23) ”کس ملک میں مستقل قیام کرنا چاہتا

ہوں؟“

”سعودی عرب میں۔“

(24) ”میرا بس چلے تو؟“

”مقام سیاست دانوں کو اغوا کر لوں اور پوچھوں

کہ ملک کے ساتھ کیا کیا آپ سب نے۔“

(25) ”انٹرویو میں کون سے سوال برے لگتے

ہیں؟“

”پرس سوال..... بھی آپ ہماری فیلڈ کے

سوال کریں پرسل لائف سے آپ کو کیا لیتا دیتا۔“

(26) ”مشورہ کس سے لیتا ہوں؟“

”لوگوں کے علاوہ اپنے دل سے..... اور دل کی

بات ہی مانتا ہوں۔“

(27) ”سونے سے پہلے کیا دعا مانگتا ہوں؟“

”میں درود شریف پڑھ کر سوتا ہوں۔“

انہی کی وجہ سے ہوں۔ تین ہزار کمائے تھے۔“

(11) ”صبح اٹھ کے پہلا کام؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے والا سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ

سردم جاتا ہوں..... قہقہہ.....“

(12) ”دل کی باتیں کس سے کرتا ہوں؟“

”اپنی بیگم اور اپنی ماں سے۔“

(13) ”مذہب سے لگاؤ؟“

”بہت ہے۔ مگر اپنے آپ کو نماز کا عادی نہیں

پارہا۔ دنیاوی کام حاوی ہو جاتے ہیں۔“

(14) ”میرا مقبول ترین ڈرامہ سیریل؟“

”چھوٹی سی زندگی۔“

(15) ”مجھے شکایت ہے؟“

”شوہر کے لوگوں سے..... یہاں فیورٹ ازم

ہے۔“

(16) ”کب بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے؟“

”جب بلک کافی پیتا ہوں۔“

(17) ”گھر والوں کی ایک بات جو بری لگتی





- (28) ”جب جیب میں پیسے نہ ہوں تو؟“
 ”تو زندگی بہت بری لگتی ہے۔“
 ”تو بڑے سے کچھ سیکھ لیا جائے۔“
 (29) ”شوہر کے علاوہ پسندیدہ پروفیشن؟“
 ”ایئر فورس کا مجھے پائلٹ بننے کا بہت شوق تھا۔“
 (30) ”میری ایک عادت جو گھروالوں کو پسند نہیں؟“
 ”سگریٹ پینا۔“
 (31) ”کیا چیز عورت کو خوب صورت بنا دیتی ہے؟“
 ”اس کی ذہانت، عقل مندی اور ڈینٹ ہونا۔“
 (32) ”ابو یاد آتے ہیں جب؟“
 ”جب میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔“
 (33) ”میں فائدہ اٹھاتا ہوں؟“
 ”دوسروں کے تجربات سے کیونکہ خکر کے نقصان اٹھانے سے بہتر ہے کہ دوسروں کے تجربے سے کچھ سیکھ لیا جائے۔“
 (34) ”دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟“
 ”اولاد اور ماں باپ۔“
 (35) ”محبت کا پیمانہ میری نظر میں؟“
 ”اسے سفر میں آزمائیں یا کسی مشکل آزمائیں۔ سب پتا چل جائے گا کون کس محبت کرتا ہے۔“
 (36) ”کردار جو کرنا چاہتا ہوں؟“
 ”گنہگار کردار کرنا چاہتا ہوں۔ پوزیٹو بہت کر لیتے۔“
 (37) ”اپنی کمائی سے جو اچھا کام کیا؟“
 ”اپنی کمائی سے عمرہ کی سعادت حاصل اچھا لگا تھا۔“

”دال..... مجھے دال بہت پسند ہے۔ بے شک روز کھلا دیں۔“

(49) ”تخنہ دینا اچھا لگتا ہے یا کیش؟“

”مجھے تو ہمیشہ سے ہی تخنہ دینا اور تخنہ لینا ہی اچھا لگتا ہے۔ جو ویلیو تخنہ کی ہوتی ہے وہ کیش کی نہیں۔“

(50) ”کہاں واپس جانے کو دل چاہتا ہے؟“

”پندرہ بیس سال پیچھے..... جب مین اتاج تھی بڑکپن کا دور تھا۔“

(51) ”بچپن کی کوئی یادگار چیز؟“

”میرے پاس ایک بال Ball تھی۔ مجھے اچھی لگتی تھی بس غیر ارادی طور پر اس کو سنبھال کر رکھ لیا۔ اب وہ بال یادگار بن گئی ہے۔“

(52) ”خواب جو اکثر دیکھتا ہوں؟“

”نہیں جی..... میں بہت حقیقت پسند انسان ہوں نہ خواب دیکھتا ہوں نہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔“

(53) ”پیسہ کمانے کے لیے محنت ضروری ہے یا قسمت پہ انحصار؟“

”صرف اور صرف محنت ضروری ہے۔ محنت سے ہی پیسہ ملتا ہے۔“

(54) ”میں متاثر ہوتا ہوں؟“

”دوسرے ملک میں جا کر وہاں کے ڈسپلن کو دیکھ کر وہاں کے قوانین کو دیکھ کر وہاں کی صفائی ستھرائی کو دیکھ کر۔“

(55) ”پاکستان کے لیے سوچتا ہوں کہ؟“

”کب یہاں کے حالات بدلیں گے، کب ہمارے ملک کا ہر صوبہ ترقی کرے گا۔“

☆☆

(38) ”ایک تاریخ جو کبھی نہیں بھولتا؟“

”اٹھارہ مئی..... کیسے بھول سکتا ہوں۔ بھلا.....“

”یونیگم کی سالگرہ کا دن ہے۔“

(39) ”میں سو نہیں سکتا جب تک؟“

”جب تک یونیگم کو نہ دیکھ لوں..... ہنستے۔“

(40) ”کب بہت سکون مل جاتا ہے؟“

”جب میں کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر آ جاتا۔“

(41) ”کھانے کا مزہ لینا ہے تو؟“

”چٹائی پہ بیٹھ کر آلتی پالتی مار کر کھانا کھانے کا۔“

(42) ”خوف زدہ ہو جاتا ہوں؟“

”لفٹ میں چڑھتے ہوئے۔“

(43) ”کون سے پروگرام وقت کاریاں لگتے؟“

”مارننگ شو..... کوئی مصرف نہیں ہے ان راموں کا۔“

(44) ”گھر سے نہیں نکلتا جب تک؟“

”جب تک ماں کی دعائیں نہ لے لوں۔“

(45) ”ایک کام جو دیر سے کیا؟“

”ادا کاری میں آنے کا فیصلہ..... یہ مجھے بہت کر لینا چاہیے تھا۔“

(46) ”کبھی برا وقت آیا؟“

”ہر انسان پہ اچھا اور برا وقت ضرور آتا ہے اور یہ بھی آیا..... بس شکر ہے کہ اللہ نے برے وقت نکال دیا۔“

(47) ”ایک محبت جو بھول نہیں سکتا؟“

”بیوی سے ہی محبت کی ہے اور بیوی سے ہی کرتار ہوں گا۔“

(48) ”ایک پسندیدہ کھانا جو کئی دن تک کھا لیتا ہوں؟“

آواز کی دُنیا سے

اپنے اسد چوہدری

شاہین کرشید



نام کے ساتھ چوہدری اور شخصیت ہے ”دھان پان سی“ یہ ہیں اسد چوہدری جو ایف ایم 94 میں ”دھنک“ پروگرام میں اپنی آواز کا جادو چکاتے ہیں..... آج کل کے نوجوان ماشاء اللہ سے کافی محنت کش ہیں، جاب بھی کرتے ہیں اور پارٹ ٹائم جاب بھی اور اسد چوہدری بھی یہی کرتے ہیں..... مہنگائی نے سب کو مصروف کر دیا ہے۔

”کیا حال ہیں جی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“

”جی..... مصروفیات یہ ہیں کہ ”سر تال“ کے عنوان سے ”دھنک ایف ایم 94“ پہ میرا لائف

پروگرام آتا ہے اور منگل کو صبح دس بجے تک۔ اس کے بعد میں آفس آ دوپہر بارہ بجے سے رات نو بجے تک ہوتی ہے۔ میں کمپیوٹر سائنس گریجویٹ ہو ”نی وی کی طرف رجحان نہیں ہے“ ”رجحان تو ہے مگر کافی ٹائم چاہیے میری جاب نو سے رات بارہ بجے تک آپ بتائیے کہ نی وی تک کیسے جاسکتا، شوق تو بہت ہے۔“

”آواز کی دنیا کے لوگ..... ڈبّے اور دستاویزی فلموں میں بھی اپنی آواز اُ رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے اٹھایا فائدہ؟“

ساتھ کچن میں بھی ان کی مدد کرتا ہوں۔“
 ﴿ ”دیری گڈ..... کھیل اور سیاست..... اگرچہ
 ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ پھر بھی آپ کو کیا پسند
 ہے؟“

﴿ ”کھیلوں سے مجھے لگاؤ نہیں ہے..... اور
 سیاست کے لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کبھی کبھی
 سیاست بہت اچھی لگنے لگتی ہے۔ اور وہ بھی اس وقت
 جب کوئی گرم بحث چل رہی ہوتی ہے تو میں بھی
 حصہ لے لیتا ہوں۔“

﴿ ”آپ نو جوان ”عمران خان“ کو لے کر
 آئے ہیں تو کچھ تبدیلی نظر آئی؟“

﴿ ”عمران خان کو سپورٹ کرنے اور لانے کی
 واحد وجہ یہ تھی کہ ہم کافی لوگوں کو دیکھ چکے ہیں۔ آزما
 چکے ہیں۔ تو جن لوگوں کو نہیں آزمایا ان کو کیوں نہ
 آزمائیں..... سو اس وجہ سے عمران خان کی حمایت کی
 تھی..... اب اگر اچھے کام کریں گے تو یہ بھی ”چلتے“
 رہیں گے ورنہ عوام ان کو بھی ”چلتا“ کریں گے جیسا
 کہ دوسروں کو کیا..... اور ویسے ابھی سے گھبرانے کی
 ضرورت نہیں ہے۔ ان کو بھی ٹھوڑا وقت دیں بجائے
 یہ کہ آپ مایوس ہو جائیں۔“

﴿ ”اگلو تے گھر کے لاڈلے اور نازک مزاج
 ہوتے ہیں۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟“
 ”مزاج کے بارے میں خود سے کیا کہوں، یہ تو

آپ ہی پرکھ سکتی ہیں۔ یا جو میرے قریب ہیں وہ بھی
 صحیح بتا سکتے ہیں کہ میں مزاج کا کیسا ہوں..... اور اگر
 اپنا تجزیہ خود کروں۔ تو میں مزاج کا برا نہیں ہوں۔
 ہاں موڈ کی بہت ہوں۔ جب موڈ خراب ہے تو سب
 کچھ خراب ہے اور جب موڈ اچھا ہے تو سب کچھ اچھا
 ہے۔“

﴿ ”چلو آواز کی دنیا سے کچھ باتیں
 جائیں..... آواز کی دنیا میں آمد کیسے ہوئی؟“
 ”آواز کی دنیا ہی میری پہچان ہے۔ آمد اس

”میں نے ریڈیو کے لیے زیادہ کام کیا ہے۔
 ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے ہیں اور صداکاری بھی کی
 ہے۔ پروموز بہت ریکارڈ کروائے ہیں ”دھنک“
 گرام میں میرے پروموز چلتے رہتے ہیں..... بزم
 بے کے اردو انگریزی پروگراموں کے لیے کافی
 تھا۔ ڈرامے زیادہ لکھے کیونکہ مجھے ڈرامے لکھنا
 وہ اچھا لگتا ہے۔“

﴿ ”ٹی وی کے بھی ڈرامہ لکھنے کا شوق ہے؟“
 ”جی..... بالکل ڈراموں کی دنیا تو آپ کی
 ہی دنیا ہوتی ہے اور قلم کے ذریعے ہم اپنی ایک دنیا بنا
 لیتے ہیں اور مجھے بہت شوق ہے ڈرامے لکھنے کا۔“
 ﴿ ”فیلڈ کے بارے میں تو باتیں ہوں گی ہی۔
 اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟“

﴿ ”بالکل..... بتاتا ہوں..... میں چھ جولائی
 1999ء میں کراچی میں پیدا ہوا۔ والدین جی اکلونی
 لاہور۔ اور اماں ابا کی شادی کے اٹھارہ سال بعد
 اس دنیا میں آیا..... اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ
 ضرورت بتانی چاہیے کیونکہ میری پیدائش اس بات کا
 ثبوت ہے کہ اللہ کی ذات سے بھی مایوس نہیں ہوتا
 ہے..... میرے والد فٹنری آف انفارمیشن میں
 اب گرتے تھے۔ آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے
 ہیں اور اماں ہاؤس وائف ہیں..... اور ہماری مادری
 بان اردو ہے۔“

﴿ ”اکلونی اولاد ہو، نہ بہن نہ بھائی..... تو اماں
 نے تو کھرداری بھی سکھائی ہوگی کہ بیٹا یہ تمہارے کام
 نہ کی۔ بیوی کے آنے میں تو ابھی دیر ہے؟“
 ”جی..... اکلوتا ہوں تو مجھے خود ذاتی طور پر بھی
 کھرداری کا شوق ہے..... گھر کی تزئین و آرائش اور
 دیگر کاموں میں بھرپور حصہ لیتا ہوں..... میری کوشش
 ہوتی ہے کہ گھر میں چیزیں کھری ہوئی نہ ہوں۔ گھر
 صاف ستھرا ہو شاید اماں کی تربیت ہے کہ گھر میں
 کھری ہوئی چیزیں مجھے پسند نہیں ہیں..... اماں کے

تقریباً چار پانچ ماہ چلا..... اس کے بعد
مہمانوں کے انٹرویوز کا سلسلہ دے دیا گیا
مجھے بزم طلبہ کی میزبانی دے دی گئی.....
میری بہت تربیت ہوئی۔ اس پروگرام -
لکھنا شروع کیا۔ صداکاری شروع کی
شروع کیا..... یعنی میں نے بزم طلبہ -
سیکھا۔“

”اداکاری کی طرف تو آپ آ -
کیا صداکاری کرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت
کے جو آپ ٹی وی کی طرف نہیں آتے؟“
”میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ صداکار

طرح ہوئی کہ ایک دن ایف ایم 93 کے پروگرام سن
رہا تھا تو انہوں نے اپنا نام سننے کے لیے اور اپنی پسند کا
گانا سننے کے لیے کال کرنے کو کہا..... اس بات کو
تقریباً ڈھائی تین سال ہو گئے ہیں..... جب میں
نے کال کی تو جو ڈیوٹی آفیسر تھیں انہوں نے کہا کہ میں
آپ کا نام بھی نشر کروں گی اور گانا بھی سنوا دوں گی۔
لیکن مجھے آپ کی آواز ”ریڈیو“ کی آواز لگ رہی
ہے۔ آپ آئیں اور آڈیشن دیں..... میں بہت
خوش ہوا اور میں نے تو سبھی ریڈیو میں جانے کا سوچا
بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس طرح کی آفر کے بارے میں
..... خیر میں ریڈیو گیا میں نے آڈیشن دیا۔ کامیاب



سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ اداکاری میں
ہوتا ہے کیونکہ بندہ آپ کے سامنے پرفا
ہے۔ وہ اپنے ایکسپریشن دکھا سکتا۔
ڈریسنگ، آپ کا سب کچھ ناظرین دیکھ
ہیں اور اسی وجہ سے پرفارمر پر نظر گہری
جبکہ صداکاری میں آپ کے پاس صرف
ہے، ایک ہی ذریعہ ہے۔ سامعین کی

ہو اور اس طرح ریڈیو پہ میرے سفر کا آغاز ہوا۔“
”غیر متوقع طور پر آپ اس فیلڈ میں آئے،
پہلے پروگرام پہ کیا تاثرات تھے؟“
”پہلی بار جذبات کچھ عجیب تھے، خوشی بہت
تھی..... آواز کی دنیا کا آغاز پروگرام بزم طلبہ سے کیا
..... میرا کام یہ تھا کہ چار پانچ منٹ کی ایک تحریر جو کسی
بھی موضوع پہ ہوتی تھی میں پڑھتا تھا اور یہ سلسلہ

بچنے کا، دلوں تک پہنچنے کا اور وہ ذریعہ صرف ”آواز“ ہے، اسی آواز سے آپ کو ایک پیریشن دینے ہیں، عمل بنانا ہے۔ آواز سے ہی آپ کو خوشی ملی اور میٹائی کے تاثرات دکھانے ہیں۔ تو اس لحاظ سے مددکاری بہت مشکل ہے..... اور میرا خیال ہے کہ اس کو مددکاری میں عبور حاصل ہو گیا وہ اداکاری اتنا آسانی سے کر سکتا ہے۔“

”آپ نی دی ڈراموں اور فلم کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟“

”عموماً ڈراموں اور فلم کے لیے لوگ ذرا تنگ نظر ہوتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں..... میں یہ کہتا ہوں کہ شو بزنز کی فیلڈ بظاہر بہت چمک دمک والی فیلڈ مانتی ہے اور لگتا ہے کہ ان لوگوں کی زندگی میں تو کوئی کام نہیں ہے۔ لیکن جب سے میں نے ریڈیو میں کام شروع کیا ہے اور بی دی سے منسلک کچھ کام کیے تو مجھے رازہ ہوا کہ کمرشل ہو یا ڈرامہ ہو اس کے پیچھے بہت منت ہوتی ہے..... اور بہت محنت کے بعد آپ کو مگر یہ نہ کچھ اچھی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس طرح لھٹا۔ ڈائریکشن، پروڈکشن یہ سب کام بہت مشکل ہیں..... مگر اس کے باوجود مجھے میڈیا بہت پسند ہے مجھے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“

”اپنے ریڈیو کے پروگرام کے بارے میں کچھ بتائیں اور زیادہ تر سامعین کس ایجنس گروپ کے ہوتے ہیں؟“

”میرے چینل کا نام ہے ”دھنک 94 ایف ایم“ اور میرے پروگرام کا نام ”سرتال“ ہے پیر اور منگل صبح دس سے بارہ بجے تک ہوتا ہے۔ پیر کے دن پروگرام ہوتا ہے اس کا فارمیٹ یہ ہوتا ہے کہ ہم ملا سیکل میوزک کے گانے سنواتے ہیں جو ایور گرین ہیں اور پرانے ہوتے ہیں۔ منگل کے دن وہ سوئگ سنواتے ہیں جو آج کل کے نئے گانے ہوتے ہیں..... سامعین ہر ایجنس گروپ کے ہوتے ہیں۔ جوان بھی فون کرتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ بھی

فون کرتے ہیں..... البتہ پیر کے دن کے سامعین ہمارے سینئر لوگ ہوتے ہیں، کیونکہ اس دن کا میوزک ان کے زمانے کا ہوتا ہے..... لائیو کالز آن ایر نہیں ہوتیں بلکہ آف ایر ہوتی ہیں لوگ اپنے پیغامات ریکارڈ کرواتے ہیں اور اپنی پسند کے گانے بھی..... اور شروع شروع میں شو کی تیاری میں کافی ٹائم لگ جاتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے اب اتوار کے دن میں اپنے دونوں پروگراموں کی تیاری کر لیتا ہوں۔“

”ریڈیو میں کیا کشش ہے کہ کھنچے چلے گئے؟“

”مجھے خود بھی نہیں معلوم..... لیکن کوئی کشر ضرور ہے کہ میں ریڈیو کے لیے تو ٹائم نکال لیتا ہوں جبکہ بی دی کے لیے میں یہاں بنانا ہوں۔ حالانکہ شوق مجھے بی دی کا بھی ہے..... ریڈیو سے محبت کا ہر عالم ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اپنی آواز کے ذریعے دو دور تک پہنچوں۔“

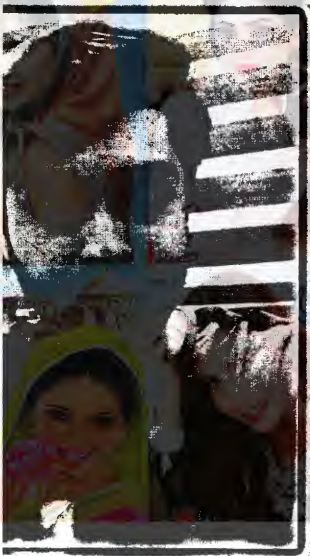
”گھر والے آپ کا پروگرام سنتے ہیں؟“

”جی..... سب سے زیادہ شوق سے میرے پروگرام میرے ”اماں ابا“ سنتے ہیں..... ابا کا تو بہ حال ہے کہ پروگرام کے دوران مجھے ”ایس ایم ایس“ کر رہے ہوتے ہیں۔ شاباش بھی دے رہے ہوتے ہیں اور فرمائش بھی کر رہے ہوتے ہیں کہ میری پسند فلاح سوئگ چلا دو اور میرا نام بھی لو..... اور پھر میں دونوں کا نام لیتا ہوں۔ پروگرام کے دوران۔“

”آپ کا پسندیدہ آر بے اور پسندیدہ ایف ایم چینل کون سا ہے؟“

”مجھے اپنا چینل تو پسند ہے ہی، اس کے علاوہ ”سما ایف ایم“ اور ”ایف ایم 91“ یہ دونوں میرے پسندیدہ چینلز ہیں، سما میں مجھے تحریک بہت پسند ہیں اور ایف ایم 91 میں صوفیہ انجم بہت پسند ہیں۔“

”اپنی صلاحیتوں کو بی دی کے لیے کیوں نہیں



”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آزمانا چاہیے اور میں نے ایک کہانی لکھی ہے مگر ابھی اسے اسکرپٹ کی شکل نہیں دی ہے اور میری خواہش ہے کہ وہ ٹی وی کے ہی کسی چینل سے آن ایر ہو..... کچھ معاملات چل رہے ہیں لوگوں سے اللہ کرے کہ کچھ حل نکل آئے اور کامیابی ہو۔“

﴿”میڈیا کو فل ٹائم ندینے کی کیا وجہ ہے؟“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میڈیا کی پڑھائی کے ذریعے بھی آپ میڈیا میں آ سکتے ہیں..... میں نے کمپیوٹر سائنس میں داخلہ لے لیا اور اب جبکہ اس میں ڈگری لے لی ہے تو دل نہیں مانتا کہ اس کو چھوڑ دیا جائے، تو اس میں بھی اللہ کی بہتری ہوگی کہ میں دونوں فیلڈز میں کام کر رہا ہوں۔ لیکن میرے اندر ایک آرٹسٹ ہے جس کو آرٹس پسند ہے بس کمپیوٹر سائنس اس کی مجبوری ہے..... ورنہ اسد چوہدری کے اندر ایک مکمل آرٹسٹ ہے جسے ہر کام آتا ہے۔“

﴿”ایف ایم میں کبائٹ شو بھی کیا؟“

”جی..... کبائٹ شو بھی کیا ہے، مگر مجھے بالکل بھی مزا نہیں آتا کبائٹ شو میں..... بس آپ مجھے اکیلے چاہے کتنے ہی گھنٹے بلوائیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا..... کبائٹ میں تو پھر میں سوچتا ہوں کہ دوسرا میرے ساتھ ہے تو بس پھر اسے ہی بولنے دو..... مجھے لگتا ہے کہ ریڈیو اگر اکیلے ہی کیا جائے تو بہتر رہتا ہے..... اور میں اکیلا ہی کرتا ہوں۔ اور تہواروں پہ بھی خاص طور پر پروگرام تیار کرتا ہوں..... اور بڑی محنت اور لگن سے کرتا ہوں۔“

﴿”آپ ڈراموں کے پردموز کے بارے میں بتا رہے تھے تو کیا ٹی وی ڈراموں کے پردموز بھی کیے ہیں آپ نے؟“

”میں نے ٹی وی کے لیے کبھی پردموز نہیں کردائے، موقعہ بھی نہیں ملا اور رسائی بھی نہیں ہے۔ صرف ریڈیو تک ہی رسائی ہے۔ سوچتا ہوں کہ پہلے اس میڈیم میں ڈوب جاؤں پھر ٹی وی پہ بھی چلا

جاؤں گا۔“ دھنک ایف ایم 94 میں یہ پردموز چلتے ہیں..... ہر پروگرام کی اوپننگ آواز میں ہوتی ہے اور ایک ڈرامہ میں..... میں اپنی آواز سے ہٹ کر ایک دوسری آواز..... اور میں چاہتا ہوں کہ میری آواز میں ایشن ہو کہ لوگوں کے دل میں اتر جائے یہ ﴿”بچپن کے ہی شوق ہیں یہ سب؟“

”شوق مجھے بچپن سے ہی ہے ان..... اسکول کے زمانے سے ہی تھیر بھی کئی، اسکول میں جب بھی غیر نصابی ہوتی تھیں تو پیچرز میرا ہی نام لیتی تھیں اندازہ تھا کہ اسد ہر فن مولا ہے۔ میمکری ہے۔ کاپی بھی کر لیتا ہے اور شرماتا بھی گا بھی لیتا ہوں اور پرفارم بھی کر لیتا ہوا میں کچھ نہیں کیا..... لیکن یونیورسٹی میں آ۔ کاسلسلہ شروع ہو گیا اور اب دیکھیں کہ کہا ہے یہ سلسلہ۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اسد چ اجازت چاہی۔

عابدہ مغل

ادارہ

ج ”بہت ساری تھیں چیزیں اور وہ تمام چیزیں جو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھیں۔“

س ”اگر آپ کو ایک دن حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟“

ج ”جی پھر تو حکومت ہی کروں گی۔ ویسے ہر علاقے میں کھلی عدالت لگواؤں گی اور قاضی بھی مقرر کروں گی۔ قانون پر سختی سے عمل کرواؤں گی۔“

س ”پسندیدہ شاعر؟“
ج ”علامہ اقبال، فیض احمد فیض، وصی شاہ، راشد ترین راشد۔“

س ”مزا آڑا کا ہیں؟“
ج ”نہیں جی بالکل نہیں۔ سنجیدہ ہوں دوستوں سے ہی گپ شپ لگاتی ہوں بس۔“

س ”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“
ج ”مرد حضرات ذمہ دار، ہنس مکھ، عاجز اور عورتیں مخلص، خیال رکھنے والیاں اور دھیما بولنے والیاں جزل ناز رکھنے والیاں پسند ہیں۔“

س ”اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی؟“
ج ”میں جو بجلی کے آنے پر شکر الحمد للہ کہتی ہوں پھر کب کہتی۔“

س ”اللہ پاک کو یاد کرنے کا سب سے بہترین وقت؟“

ج ”آپ کی خوشیوں کا دور جب آپ کو ہر نعمت میسر ہو تب اللہ پاک کو یاد کرنے کا بہترین وقت ہوتا ہے۔“

س ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟“

س ”اصلی نام کیا ہے۔ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟“

ج ”اصلی نام بی بی عابدہ ہے۔ گھر والے بے عابدہ ہی کہتے ہیں۔ بھتیجی عابدہ اور سعد (کزن) بھی عائدہ بھی عابدہ کہتا ہے۔ دوستیں کچھ عابدہ کچھ بہ کہتی ہیں۔“

س ”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“

ج ”بے زبان ہے بے چارہ۔ البتہ میں آئینہ دیکھ کر یہ ضرور کہتی ہوں کہ اے اللہ، جیسے اچھی صورت لی ویسے ہی اچھے اخلاق دے۔“

س ”حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟“

ج ”حسین صورتیں دیکھ کر دل میں حسن تخلیق کرنے والے کے دیدار کا خیال آتا ہے۔“

س ”اگر آپ کے برس کی تلاش لی جائے تو؟“
ج ”پرس نہیں رکھتی مگر پاؤچ میں صرف سیفٹی ن اور پیسے رومال اور کچھ کارڈز، پین یہ ہی سب نکلے۔“

س ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج ”نہ جی بالکل نہیں۔ انسانوں سے ڈر لگتا ہے بھوتوں سے ملاقات کا شوق ہے۔“

س ”مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟“

ج ”ویسے تو اللہ کی رحمت سارے ہی اچھے لگتے ہیں مگر جو مہمان ذاتی باتوں کی ٹوہ نہ لیں وہ اچھے لگتے ہیں۔“

س ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“

ج ”اے معاملے میں کفایت شعار اور دوسروں کے لیے شاہ خرچ۔“

ج ”کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟“
ج ”جی بالکل ہوتا ہے۔ نام شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔“

ج ”وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے دنیا کیا کہے گی؟“

ج ”جو کام ہیں وہ کر نہیں سکے کیونکہ ہم خود پروا نہیں کرتے کہ دنیا کیا کہے گی۔ مگر گھروالوں کی وجہ سے اس بات کے پیش نظر رک جاتے ہیں کہ دنیا کیا کہے گی۔“

ج ”آپ کسی سنان رستے سے گزر رہی ہوں اور کتنا پیچھے لگ جائے تو؟“

ج ”جی کتوں کو ہم سے فطری محبت ہے اور ہمیں بھی جانوروں سے پیار ہے اور اکثر جو کتے پیچھے لگ جاتے ہیں وہ گھر تک چھوڑنے آتے ہیں اور کچھ تو پھر دروازے پر ہی پڑے رہتے ہیں کہ روٹی پانی ڈال دو بس۔“

ج ”آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟“

ج ”محبت بیماری ہے جی دہی اور جسمانی دونوں لحاظ سے۔“

ج ”کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“

ج ”اپنی امی، پھوپھو، بابا (پھوپھا) ان سب نے ابو کے بعد ہمیں سنبھالا اور اس کے علاوہ ہر شخص کی جس سے زندگی میں کچھ سیکھا۔“

ج ”اپنی تعریف سن کو خوش ہوتی ہیں؟“

ج ”تعریف اور خوشامد میں فرق کرنا آ گیا ہے اس لیے حقیقی تعریف پر خوشی ہوتی ہے مگر میں خوش ہونے سے زیادہ ہوتی ہو جانی ہوں۔“

ج ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

ج ”صرف مشہور رائٹرز اور ڈائجسٹ رائٹرز کے اس کے علاوہ جب اسکول سے چھٹی کرنی ہو تو بہن بھائیوں کے ڈرامے بھی دیکھتی ہوں۔“



قیمت - 400 روپے

کشمیر لائٹس: 37 - (ایم ایم ایف) - فون نمبر: 35021

نگہت عبد اللہ

ہیئرین رنج بیکس

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھادج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

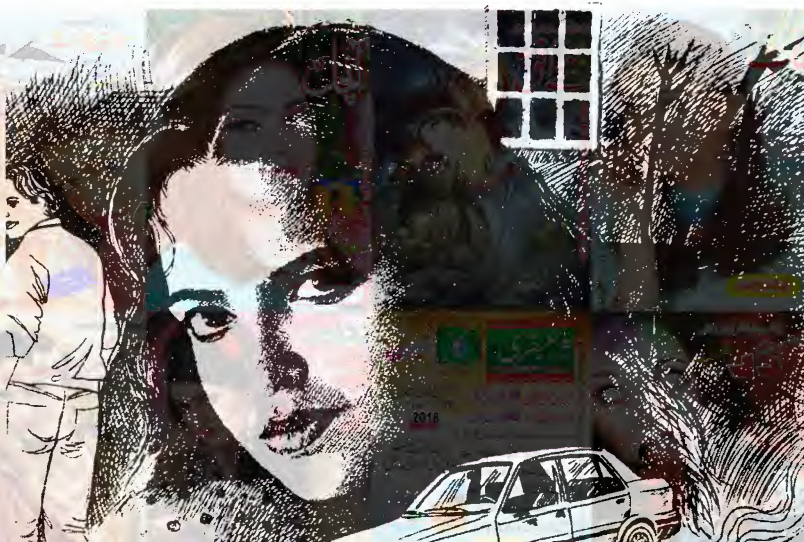
حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بدز بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سپینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سپینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے پاس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شریل اس کو چاہتا ہے اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے حسان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کر لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ ماس کیرج ہونے کی وجہ سے اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، سے اپنی دوست زوبی کا بے بی۔ لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔



سوٹیا لے سورہے پر یہ دوسری سادی لے لیے سوپے لٹا ہے اور کرینہ اسے باس سو روں سہرا
 لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحقیقت
 والے راضی نہیں ہیں اسی لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزینہ
 محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیور خزینہ کو ایک الگ قلیہ
 بیاہ کر لے جاتا ہے۔

تیرہویں قسط



دل ایک پل خوشی کے احساس میں دھڑکتا تو اگلے پل سہم جاتا ان متضاد کیفیات میں وہ سمجھ نہیں پا رہا کہ سارہ کی آواز نے چونکا دیا۔

”یہی تم کب آئے۔“ پھر اس کے ہاتھوں پر نظر پڑی۔ ”یہ کیا ہے؟“

”بے بی، ہمارا بے بی۔“ اس نے بے اختیار بچہ سارہ کی طرف بڑھایا تو وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

”اومانی گاڈیہی یہ ہمارا بے بی ہے۔ اتنا پیارا..... ماما..... ماما آ میں دیکھیں ہمارا بے بی۔“ سارہ سے بے قابو ہو رہی تھی اور تیمور غزنی نے یہ سب اس کی خوشی کے لیے ہی تو کیا تھا پھر اب کیا تھا کہ سارہ آواز اس کی سماعتوں میں بری طرح چھینے لگی تھی اور وہ کانوں پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا کہ ماما کو کمرے سے نکلنے ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیا ہوا سارہ!“ ماما سارہ کی طرف متوجہ تھیں لیکن وہ بول پڑا۔

”میں نے سارہ کی بلکہ آپ سب کی خواہش پوری کر دی ہے ماما۔“

”جی ماما۔“ دیکھیں کتنا پیارا بچہ ہے۔ سارہ فوراً بچے کو لیے ماما کے قریب آ گئی تو ماما عجیب سی نظر دو تیمور غزنی کو دیکھنے لگیں۔

”دیکھیں ناں ماما۔ دادی بن گئی ہیں آپ دادی۔“ تیمور غزنی کو اب اپنے دل پر دباؤ برداشت نہیں تھا۔ خاصے جارحانہ انداز میں بچہ سارہ سے لے کر ماما کے ہاتھوں میں دیا تو اچانک بچہ چیخ مار کر رونے لگا۔ ”ماں..... ماں اس کے رونے میں ماں ماں کی ٹکرا رہی۔ ماما نے بے اختیار اسے سینے سے لگایا تو وہ ہو گیا۔

”ارے..... سارہ خوش گوار حیرت میں تھی۔“ ماما تو آپ کے سینے سے لگ کر چپ ہو گیا۔

”یہ۔“ ماما سارہ کی بات ان سنی کر کے اسے دیکھنے لگیں۔ ”یہ ابھی.....؟“

”جی ماما ابھی پیدا ہوا ہے۔ سیدھا ہسپتال سے لے کر آ رہا ہوں۔“ اس نے بتایا تو ماما پھر بچے کو ہوئے پوچھنے لگیں۔

”اور اس کی ماں؟“

”اوہو ماما اب اس کا پورا شجرہ نسب مت پوچھیں۔ جاؤ سارہ بچے کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔“ وہ تنگ آ گیا تھا۔

”ہیں۔“ ماما نے حیرت سے اسے دیکھا پھر سارہ سے بولیں۔ ”یہ ابھی کچھ نہیں کھائے گا۔“

”مجھے پتا ہے ماما یہ ابھی صرف فیڈر ہے گا۔ میں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔ لائے مجھے دیں۔“ بچے کو لے کر جانے لگی تو بے اختیار ماما اس کے پیچھے چل پڑیں۔ جبکہ وہ وہیں کھڑا رہا۔ پھر اچانک خزانہ آیا تو فوراً حبیب سے موبائل نکال کر سونیا کا نمبر پیش کر دیا۔ اور جیسے ہی سونیا نے ہیلو کہا پوچھنے لگا۔

”آپی خزانہ کیسی ہے۔ ہوش آ گیا اسے؟“

”نہیں تم خزانہ کی فکر مت کرو۔ وہ تھیک ہے۔ میں اسے گھر لے آئی ہوں۔“ سونیا نے بتایا تو وہ پوچھ

”میں آ جاؤں آپی؟“

”بالکل نہیں۔ تم کل صبح آنا۔ خزانہ بھی کل صبح ہی ہوش میں آئے گی۔ باقی یہ جو خاتون تمہارے ہاں

رہی ہے اسے میں نے بتا دیا ہے اور سمجھا بھی دیا ہے۔ وہ خزانہ کو دیکھ لے گی۔ اچھی سمجھ دار عورت ہے۔ تھیک اب میں بھی اپنے گھر جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔“ سونیا نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ جس سے وہ جھک گیا کیونکہ اس کے اندر کتنے سوال اٹھ رہے تھے۔

”آپی بھی عجیب ہیں۔“ وہ اپنے پیچھے صوفے پر گرنا چاہتا تھا کہ بابا کو آتے دیکھ کر رک گیا۔

”حیرتِ تم اس وقت آس لئے نہیں یا جلدی آ لئے ہو؟ بابا نے حریب اے ہوئے پوچھا۔
”گیا تھا آس لیکن وہ بچہ.....“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے.....

”بچہ.....؟“ بابا سوالیہ نشان بن گئے۔

”جی بچہ..... میں نے بچہ ایڈاپٹ کر لیا ہے۔“ کیا ستم ظریفی تھی کہ وہ اپنے بچے کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔

”اچھا کہاں ہے؟“ بابا نے یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے بچہ بھاگتا دوڑتا نظر آ جائے گا۔

”وہ سارہ کے پاس ماما بھی وہیں ہیں۔“ اس نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو بابا نے اس سمت

پھرا سے دیکھنے لگے۔

”میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ آنے میں کچھ دیر ہوگی۔“

وہ بابا کے سوالوں سے بچنے کی خاطر تیزی سے باہر نکلا تھا اور دل تو چاہ رہا تھا سیدھا خزانہ کے پاس اسے دیکھے لیکن اس وقت دل کی مان کروہ اپنے لیے مزید مشکل کھڑی نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی بھی وہ خود کو مشکا محسوس کر رہا تھا۔ جب ہی سونیا کے پاس آ گیا۔ وہی اس کی ڈھارس بندھا سکتی تھی۔

”لومنہ بیٹھا کرو۔“ سونیا فوراً فریج سے کسٹرڈ نکال کر لے آئی اور اپنے ہاتھ سے چمچ بھر کر اس کے

ڈالا پھر بے پناہ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔

”سچی سچی مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں پھوپھو بن گئی۔ تم نے دیکھا کتنا پیارا ہے تمہارا بے بی۔

تمہاری طرح۔ سچ اگر بابا تمہاری دوسری شادی پر پابندی نہ لگاتے تو اس وقت ہم کتنی خوشیاں مناتے

تات؟“

”ہوں.....“ اس کے بند ہونٹوں کے اندر آواز دب گئی تھی۔

”ارے یہ تم منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو۔ تمہیں خوشی نہیں ہو رہی۔ کم آن تھی۔ تم باپ بن گئے ہو

تمہارے پاس تمہارا اپنا بچہ ہے۔ یہی چاہتے تھے نا تم۔“

”ہاں لیکن خزانہ.....! آئی اس کا کیا تصور ہے۔ وہ جب اپنی خالی گود دیکھے گی تو.....“ وہ بھرمانہ

میں گھر گیا تھا۔ سونیا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ریلیکس تھی۔ خزانہ کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر اللہ چاہے گا اس کی گود میں اور بچہ آ جا۔

ادھر تو ایسی کوئی امید ہی نہیں تھی۔“

”پھر بھی آ پی۔ میں کٹی ٹیل کر رہا ہوں اور ہاں آپ کہہ رہی ہیں خزانہ کو کل صبح ہوش آئے گا۔ کیوں

”کیونکہ میں نے اسے انجکشن لگا دیا ہے۔“ سونیا نے بتایا تو وہ زچ ہوا۔

”کیوں۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت تھی سچی۔ سونیا زور دے کر بولنے لگی تھی۔ اگر ابھی وہ ہوش میں آ جاتی تو اپنے گھر والوں

پھر تمہارے لیے کتنا مسئلہ ہو جاتا۔ جبکہ کل تم سب کو فیس کر سکتے ہو اور اب پلیز تم ریلیکس ہو جاؤ اور مجھے تہ

بچے کو لے کر خوش ہے۔“

”بہت.....“

”اور ماما، بابا.....؟“

”ہاں نہیں.....“ وہ تنک آ گیا۔

”فکرت کرو۔ وہ بھی خوش ہو جائیں گے، اور ہاں اب ایسا کرو کچھ دن خزانہ کے ساتھ رہنے کا

سونیا کی دوسری بات پر وہ شام کی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

رات دھیرے دھیرے بھیک رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ جبکہ سارہ اور ماما نے کہا تھا کہ کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے اسے اسلام آباد جانا ہے اس لیے وہ جلدی سونے کے لیے! تھا۔ لیکن ذہن اس قدر منتشر تھا کہ نیند آ کے نہیں دی۔ ایسی صورت حال تو اس وقت بھی نہیں تھی جب سارہ کے لیے ضد کرتی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ ڈیپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ جبکہ سارہ بچے کے ساتھ خوش تھی۔ کتنی سارہ کے بچے کے ساتھ مصروفیت محسوس کرتا رہا تھا۔ پھر شاید اسے سلا کر وہ خود بھی سو گئی تھی۔ اور وہ آ کر روٹ لیٹے لیٹے تھک گیا تھا۔ پھر پہلے اس نے سارہ کے سو جانے کا یقین کیا، اس کے بعد احتیاط سے کمرے سے نکلنا چاہتا تھا کہ بچے کے رونے پر بے اختیار پلٹ کر اس کے پاس آ گیا۔ بچہ جھولے میٹر جھولے کی ڈوری سارہ کے ہاتھ کی انگلیوں میں پکڑی تھی اور وہ بے خبر سو رہی تھی۔ بچے کے رونے کی آواز اس کی آنکھ نہیں کھلی شاید اس لیے کہ بچے نے اس کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا۔

تیور غزنی آہستہ آہستہ جھولا ہلانے لگا لیکن بچہ چپ نہیں ہوا تب اس نے پریشان ہو کر سارہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”ہاں.....“ سارہ ہر بڑا کر اٹھی تو وہ بچے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”یہ کب سے رو رہا ہے۔“

”اوہ انجی تو میں نے سلا یا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی ہے۔“ سارہ بولتے ہوئے اٹھ کر جلدی جلدی بنانے لگی۔ پھر بچے کو گود میں لے کر اس کے منہ سے فیڈر لگا دی۔ وہ یہ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتا اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر بولا تھا۔

”میرا خیال ہے تم اسے نہیں سنبھال سکو گی۔“

”تمہی پلیز ایسی باتیں مت کرو۔“ سارہ نے ناگواری سے ٹوکا تو وہ گہری سانس کھینچ کر اسے دیکھنے ا

”ایک دو دن میں سیٹ ہو جائے گا۔“ سارہ ہنسی سے بچے کا گال چھونے لگی۔

”یہ یا تم.....؟“ یہ سارہ کے لیے پہلی طعنے آمیز چیخ تھی جو اس کے ہونٹوں سے ادا ہوئی تھی اور اس پر

تلعلانا فطری تھا۔

”واٹ ڈیو میں تیور.....؟“

”آئی مین بچہ پالنا آسان نہیں ہے۔ جان ماری پڑتی ہے۔ تم اگر نہ کر سکو تو.....“ سارہ کی ٹیکھی نظرو

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں سب کر لوں گی اور یہ تم ابھی تک کیوں جاگ رہے ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں صبح تمہاری اسلام

فلائٹ ہے۔“ سارہ مزید کچھ کڑوا نہیں سننا چاہتی تھی جب ہی اسے یاد دلایا۔ تو اس نے بھی یاد آنے کی ا

کی۔

”ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلایا۔ لیکن یہ بچہ سونے نہیں دے رہا۔“

”تو تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔“ سارہ نے کہا تو وہ اچھل پڑا۔

”کیا مطلب یعنی.....“

”تمہی پلیز..... کچھ دنوں کی بات ہے۔“ سارہ کی لجاجت پر وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر قصد آروٹ

میں بولا تھا۔

”مجھے پتا تھا بچے کو لے کر تم مجھے بھول جاؤ گی۔ کنارے کر دو گی۔“ سارہ ہنسنے لگی اور وہ یونہی رو

پھر اسلام آباد جانے کا تو بہانا تھا۔ اسے خزانہ کے پاس رہنا تھا۔ سونیا نے تو کہا ہی تھا خود اسے بھی اح
تھا کہ اس وقت خزانہ کو جذباتی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ یوں صبح سات بجے ہی وہ گھر سے نکل آیا تھا۔
آگے اسے جس صورت حال کا سامنا کرنا تھا اسے سوچ کر ہی وہ اتنا پریشان ہوا کہ فوراً خزانہ کے پاس جا۔
ہمت نہیں کر سکا۔ کتنی دیر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ پھر خزانہ کا معلوم کرنے کے لیے اس نے لینا
پرفون کیا تو حسب توقع مجھے خالہ نے فون اٹھایا تھا۔ اور ان کی ہیلو سنتے ہی وہ پوچھنے لگا۔
”خالہ۔ خزانہ کو ہوش آ گیا۔“

”ہاں بیٹا۔ وہ تو بہت سویرے ہوش میں آ گئی تھی۔“ مجھے خالہ شروع ہو گئیں۔ ”بچے کا سن کر بہت رو
ابھی بھی رو رہی ہے۔ پھر اس نے اپنی ماں کو فون کیا۔ اس کی ماں اور بہن آ گئی ہیں۔ اب وہی اسے سنبھال
ہیں۔ تم کب آؤ گے۔“

”جی میں بس آ رہا ہوں۔“ اس نے کہہ کر لائن کاٹ دی اور شاید وہ یہی چاہ رہا تھا کہ اس سے پہلے
بیگم پہنچ جائیں۔ یوں وہ خود کچھ کہنے سے بچ جانے کا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔
مجھے خالہ کو سونیا نے جو بتایا تھا کہ گرنے کے باعث خزانہ کی حالت بہت تشویش ناک ہو گئی تھی۔ پھر
نے مردہ بچے کو جنم دیا اور یہ اللہ کا کرم ہے کہ خزانہ کو نئی زندگی مل گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو مجھے خالہ نے یہی سب
بیگم سے بھی کہہ دیا تھا۔ جب ہی اب حیدرہ بیگم افسوس کے بعد اس سے شکایت کر رہی تھیں۔
”بیٹا تمہیں اسی وقت ہمیں اطلاع دینی چاہیے تھی۔“

”بس آنٹی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خزانہ کو فوری ایمر جنسی میں لے جانا پڑا۔ پھر آپ لوگوں کا نمبر
نہیں تھا میرے پاس۔ وہ تو اچھا ہوا میری بہن آ گئی اس نے خزانہ کو سنبھال لیا۔ ورنہ میں اکیلا.....“ وہ خالہ
ہو کر بیڈروم کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے خزانہ کے سکے کی آواز آ رہی تھی۔
”میں خزانہ کو دیکھ لوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے اور بیڈروم میں داخل ہوا تو ا
دیکھ کر شہرینہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس کی نظریں خزانہ پر تھیں جو آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔
”خزانہ۔ غزنی بھائی آئے ہیں۔“ شہرینہ نے اس کا بازو دھلا کر کہا پھر جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو کمر
سے نکل گئی۔

تیور غزنی نے چونک کر شہرینہ کو کمرے سے جاتے دیکھا پھر آہستگی سے دروازہ بند کر کے خزانہ کے پا
بیٹھا اور اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر یوں دبایا کہ وہ بازو نیچے کر کے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
تیور غزنی نے ہونٹ پیچھ کر سر جھکا لیا تو وہ اس کے ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر پھر سسک پڑی۔ وہ چند لم
خود پر ضبط کر سکا پھر اس کی پیشانی پر اپنی پیشانی رکھ کر اسی قدر کہہ سکا۔
”خدی پلینز میں ٹوٹ رہا ہوں۔“

☆☆☆

سارہ نے سونیا کو فون کر کے بچے کا بتایا اور اسے آنے کو بھی کہا تو سونیا تو اسی انتظار میں تھی فوراً بھاگی
آئی کیونکہ ایک وہی تو جانتی تھی کہ بچہ اس کا اپنا خون ہے اور کل وہ اسے ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پائی تھی۔ نہ ا
سینے سے لگا کر محسوس کیا تھا اور اب اس سے خوشی سنبھال نہیں جا رہی تھی۔ بچے کو سینے سے لگانی کبھی پیار کرتی۔
خاموشی سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ کچھ حیران بھی تھیں کہ وہ کیسے اس بچے پر نثار ہو رہی ہے۔
”ماما۔ پیارا ہے ناں؟“ سونیا نے اچانک انہیں مخاطب کر کے پوچھا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

کے سینے سے آپ ہی آپ کھری سانس خارج ہوتی سی، یوں جیسے کاش بہ پتی کا بچہ ہوتا۔
 ”مجھے تو یہ پتی جیسا لگ رہا ہے۔“ سونیا کی نظر میں بچے پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔
 ”ہاں سونیا آلی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے جی تمہی جیسا لگ رہا ہے۔“ سارہ نے تائید کی تب
 چونک کر اسے دیکھا پھر اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے سنبھل کر کہنے لگی۔
 ”اللہ کی شان، یعنی اب کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ تمہارا بچہ نہیں ہے اور کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں
 تم نے ایڈاپٹ کیا ہے، سچی۔“
 ”جی۔“ سارہ سر ہلانے لگی۔

”نام کیا سوچا اس کا؟“ سونیا نے بچہ سارہ کی گود میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں نے تو بہت سارے نام سوچے تھے آلی لیکن اب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ بتائیں۔“
 ”میں نہیں، ماما بتائیں گی۔ ماما بتائیں کیا نام رکھیں اس کا۔“ سونیا نے دادی کا حق سمجھتے ہوئے
 دیکھا تو وہ تنک کر بولیں۔

”بیٹا، آج کل کے نام میری سمجھ میں نہیں آتے۔ تم دونوں خود ہی سوچ لو۔“
 ”پتی کہاں ہے، اس سے پوچھتے ہیں۔“ سونیا نے انجان بن کر تیمور کا پوچھا۔
 ”وہ تو اسلام آباد گیا ہے۔“ ماما نے بتایا تو سونیا نے قصداً تعجب کا اظہار کیا۔
 ”ہیں..... بچے کو چھوڑ کر وہ اسلام آباد کیا کرنے گیا ہے۔ ماما آپ نے کیوں جانے دیا۔ پہلے بچے
 تو کریں، مٹھائی بانٹیں، دادی بن گئی ہیں آپ اور سارہ تم..... اکیلے اکیلے خوشی نہیں منائی جانی، مٹھائی کھلا
 کو۔“

”صرف مٹھائی نہیں آلی! پتی آ جائے پھر ہم فنکشن کریں گے۔“ سارہ نے خوش ہو کر کہا۔
 ”ہاں، چھٹی کا فنکشن۔ ٹھیک ہے ناں ماما۔“
 ”ہوں.....“ ماما اپنے کسی خیال میں تھیں کہ بچے کے رونے پر چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
 ”اسے بھوک لگی ہے، آلی اسے میرے کمرے میں لے جائیں۔ میں اس کا فیڈر لے کر آتی ہوں۔
 کہتے ہوئے بچے کو سونیا کی گود میں ڈال کر چلی گئی۔

”ماما، کیا سوچتے لگتی ہیں آپ۔ یہی ناں کہ کاش یہ تیمور کا اپنا بچہ ہوتا، تو آپ ایسا ہی سمجھیں ماما
 رویے سے انہیں یہ احساس مت دلائیں کہ یہ ان کا بچہ نہیں ہے اس طرح تو ماما آپ ان کی خوشی بھی خراب
 گی۔“ سونیا عاجزی سے انہیں ٹوک رہی تھی کہ بابا سنتے ہوئے آ گئے۔
 ”سونیا ٹھیک کہہ رہی ہے بیگم، تمہیں بچوں کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔“ پھر سونیا سے پوچھنے لگے
 ”کیوں رہا ہے؟“

”بھوک لگی ہے شاید، سارہ اس کی فیڈر لا رہی ہے۔“ سونیا کہتے ہوئے اٹھ کر سارہ کے کمرے میں
 تو بابا اس کی جگہ پر بیٹھ گئے لیکن فوراً کچھ نہیں بولے۔ کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر
 نے سارہ کو فیڈر ہاتھ میں لیے بھاگ کر جاتے دیکھا اور جب بچے کا رونا بند ہو گیا تب وہ جیسے خود سے
 تھے۔

”چپ ہو گیا۔“
 ”ہیں۔“ ماما نے چونک کر انہیں دیکھا تو پہلے انجان بنے پھر کہنے لگے۔
 ”برسوں بعد اس گھر میں بچے کی آواز سنائی دی ہے۔ اب جو بھی ہے، اللہ کی مرضی۔ تمہاری طرز

مجھے بھی عجیب سا لگ رہا ہے بیگم لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خیر تم دیکھ لو، سارہ بچے کو سنبھال سکے تو نہ ورنہ کسی گورنس کا انتظام کر دو۔“

”یہی کرنا پڑے گا۔“ ماما نے کہا لیکن پھر فوراً اپنی بات کی نفی کر دی۔ ”نہیں، میں ہوں ناں۔ میں دیکھا گی۔“

”تم.....“ بابا نے حیرت سے انہیں دیکھا جیسے اس عمر میں بچے کو کیسے دیکھو گی۔

”جی.....“ ماما ان کی حیرت نظر انداز کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں پھر جاتے جاتے بولیں۔ ”جب اللہ کی مرضی ہے تو ہمیں دل سے قبول کرنی چاہیے۔“

بابا سر ہلا کر رہ گئے تھے۔



حمیدہ بیگم کا خیال تھا انہیں خزینہ کے پاس رکنا پڑے گا لیکن جب تیمور غزنی نے بتایا کہ وہ کچھ دن خزینہ ساتھ رہے تب انہیں رکنا مناسب نہیں لگا اور وہ شام سے پہلے ہی شہرینہ کے ساتھ چلی گئیں۔ جاتے جاتے غزنی سے کہہ گئی تھیں کہ جب وہ اپنے گھر جانے لگے تو خزینہ کو کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس چھوڑ دے گا کیا ابھی اس کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس پر تیمور غزنی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ ماں زیادہ بہتر اس کی دیکھ بھال کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال ابھی تو وہ خود اس کے پاس تھا اور ہر طرح سے اسے سمجھانے اور بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خزینہ گھوم پھر کر پھر بچے کا ذکر کر لے آتی۔ اس کی ماما کو کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً رات میں اسے خڑک دوسری میڈیسن کے ساتھ نیند کی ٹیبلٹ بھی دینی پڑی تا کہ وہ سکون کی نیند لے سکے جو اس کے لیے، ضروری تھی اور واقعی وہ تو سو گئی لیکن تیمور غزنی سے نیند یوں روٹھی کہ وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔ آخر، بستر چھوڑنا پڑا، خزینہ کی طرف سے اطمینان کر کے اس نے سگریٹ، لائٹر کے ساتھ اپنا سیل فون اٹھایا اور احاطہ سے کمرے سے نکل کر میز پر آ گیا۔

وسط نومبر کی قدرے ٹھنڈی رات تھی۔ ہلکی خنکی نے اس کے چٹخے ہوئے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ خواہ کیسا بھی ہو، کراچی شہر میں رات کی رونقیں ماند نہیں پڑتیں۔ دور سڑک پر گاڑیوں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ ”جانے اس وقت لوگ کہاں اور کیوں جاتے ہیں؟“ وہ سوچتے ہوئے ریلنگ کے قریب چیر چرخ کر گیا اور سگریٹ سلگانے کے بعد سیل فون پر ٹائپ دیکھا۔ ایک بجاتا تھا۔ اس کا دھیان سارہ کی طرف چلا گیا۔ نہیں سوری ہوگی یا بچہ سوئے نہیں دے رہا ہوگا۔ یہی چیک کرنے کے لیے اس نے سارہ کو کال ملا دی۔ دو، طرف بیل جانی رہی لیکن کال ریسپونڈ نہیں ہوئی۔ وہ یہی سمجھا سو گئی ہوگی، جب ہی دوبارہ کال نہیں ملائی لیکن دیر بعد ہی سارہ کی کال آ گئی۔

”سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ اس نے کال لیتے ہی کہا تو سارہ جیسے عاجز کھڑی تھی۔

”اب تم کیا ڈسٹرب کرو گے یہی جتنا مجھے اس بچے نے تنگ کیا ہوا ہے۔ خود سو جاتا ہے اور جب میں سو لگتی ہوں تو اٹھ جاتا ہے۔“

”ارے، تم سوئی نہیں۔“

”نہیں۔ اب ماما نے اسے باندھ کر جمو لے میں ڈالا ہے اور کہہ رہی تھیں اب یہ صبح ہی اٹھے گا تو اب بھی آرام سے سوؤں گی۔“ سارہ بولتے ہوئے جھانکی لے رہی تھی۔

”اوکے جانو! تم سو جاؤ۔ میں کل دن میں کال کروں گا۔“ اس نے سارہ کا احساس کر کے کہا۔

”او کے گڈ ٹائٹ۔“ سارہ نے فون بند کر دیا تو اسے لگا جیسے وہ موبائل پھینک کر بیڈ پر ڈھس گئی ہو۔
 ”باگل لڑکی۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا تو دوسری سگریٹ سلاگا کر چیر کی بیک پر سر رکھا تو اس کی نظروں میں
 وقت کتنے منظر آئے۔ غالباً وہ اس وقت سے سوچتا چاہتا تھا جب سونیا نے اسے دوسری شادی کا مشق
 تھا بلکہ اس کا تھا اور اسے یہ سب ناممکن لگتا تھا لیکن اس کی قسمت میں یہ سب لکھا تھا جب ہی سارے مر جا
 طے تو ہو گئے لیکن اسے وہ خوشی نہیں مل رہی تھی جو اس کا حق تھا۔ اس کے برعکس بجر مانہ سا احساس تھا، وہ ظا
 پھر بھی ظلم کر گیا تھا۔

”یا اللہ۔“ وہ معافی طلب کرنے جا رہا تھا کہ اپنے پیچھے آہٹ سن کر چونکنے کے ساتھ ایک دم اٹھ کھڑ
 خزینہ نڈھال کی کھڑی تھی۔

”خزینہ۔“ اس نے فوراً بڑھ کر اسے تھام لیا۔ ”تم یہاں کیوں آ گئیں۔“
 ”اندر ٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اے سی کام نہیں کر رہا۔“

خزینہ نے طویل سانس لے کر ٹھنڈی ہوا اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

”میں نے اے سی آن نہیں کیا تھا خزنی! خیر تم یہاں بیٹھو۔“ اس نے خزینہ کو اپنی جگہ پر بٹھایا پھر دوسر
 قریب کھینچ کر خود بھی بیٹھ گیا تو خزینہ نے اس کا بازو تھام کر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا اور ٹوٹی آواز میں
 تھی۔

”میں خالی ہو گئی غزنی! یوں لگ رہا ہے جیسے میرے لیے دنیا ختم ہو گئی۔“ تیمور غزنی کے دل پر گھونسا
 اپنے بازو پر رکھا اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”نہیں خزنی! ایسا مت سوچو۔ تمہارے سامنے ابھی وسیع دنیا ہے، وہ دیکھو۔“ اس نے دور اشارہ کیے
 ابھی بھی روشنیوں کا سیلاب اندر رہا تھا۔

”ہونہہ.....“ خزینہ کے ہونٹوں سے دکھ برآمد ہوا تھا۔ ”کتنی مگن ہے دنیا کسی کو پتا ہی نہیں، یہاں تو
 بیت گئی۔“

تیمور غزنی نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر گویا اسے سہارا دیا تھا۔

”میں بے خبر سو رہی تھی۔“ قدرے توقف سے وہ اپنے آپ بولنے لگی۔ ”بہت گہری نیند تھی پھر بھی
 آواز پر آنکھ کھل گئی۔ وہ رو رہا تھا۔ ہاں وہ رو رہا تھا۔ میری سماعتوں نے اس کی آواز سنی تھی، آپ..... آر
 بھی سنی ہو گی غزنی۔“

تیمور غزنی کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا بھی تو کچھ بول نہیں سکتا تھا اور اس کے پاس تھا ہی کیا ہو۔
 البتہ اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرنا جا رہا تھا یوں جیسے اسے خود میں سمو لے گا۔

☆☆☆

ریکا اتنی بے وقوف نہیں تھی جو یہ نہ سمجھ سکتی کہ حمزہ اس سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ سب سمجھتے ہو۔
 وہ اسے مجبور کر رہی تھی کیونکہ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں جو چاہا تھا حاصل کر لیا تھا اور حمزہ تو اس کی
 چاہت تھا لیکن اس میں اس کی ضد بھی شامل ہو گئی تھی۔ دوسرے جس طرح حمزہ ہر قدم پر اس کی توہین کر
 اس سے اب اس کی سوچ ایک نیا رخ اختیار کر رہی تھی۔ پہلے تو وہ یہی سوچتی رہی کہ آخر اس لڑکی شہرینہ
 کیا ہے جو حمزہ اس کے حصار سے نکل ہی نہیں پار رہا۔ کیا واقعی وہ اس سے محبت کرتا ہے یا محض اس ڈر سے
 چھوڑنا نہیں چاہتا کہ خاندان والے اسے ملامت کریں گے۔

”بہر حال جو بھی ہے مجھے شہرینہ سے ملنا پڑے گا۔ دیکھوں تو سہی اس میں ہے کیا۔ مجھ سے زیادہ

صورت تو نہیں ہو سکتی۔ میرے سامنے تو کوئی ٹھہر ہی نہیں سکتا۔“ خود پسندی کی انتہا تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اس نے خود کو ہر زاویے سے دیکھا پھر سیل فون اٹھا کر حمزہ کو کال ملا دی۔

”لیس.....“ حمزہ نے غالباً نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کی تھی اور ربیکا نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کہاں کر رہے ہو بلکہ اس کی آواز سنتے ہی بولی تھی۔

”میں ابھی تمہارے گھر آ رہی ہوں حمزہ۔“

”سوری، اس وقت میرے گھر میں کوئی نہیں ہے۔“ وہ پتا نہیں جھوٹ کہہ رہا تھا یا سچ۔ ربیکا پوچھنے نہیں آئی۔

”کیوں، کہاں ہو تم لوگ؟“

”شہرینہ کے گھر۔“ اب غالباً حمزہ نے اسے سلگایا تھا لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ تھی۔

”تو میں وہیں آ جاتی ہوں۔ آئی میں شہرینہ کے گھر۔“

”شٹ اپ۔“ حمزہ نے دانت پیسے تھے۔

”ارے کیا ہوا۔ آخر مجھے ان سب سے ملنا ہی ہے۔ ابھی مل لیتی ہوں۔ وہ بھی دیکھ لیں تمہاری ہو

والی.....“

حمزہ نے کھٹ سے لائن کاٹ دی تھی۔ اس نے تملکا کر اپنے سیل فون کو دیکھا پھر زہر خندانہ انداز میں کہتی تھی۔

”بس حمزہ! اس سے زیادہ نہیں۔ بہت ہرٹ کر لیا تم نے مجھے، اس دو ٹکے کی لڑکی کی وجہ سے۔ میں چھوڑ دوں گی اسے اور تمہیں بھی۔“ وہ ادھر سے ادھر ٹپکنے لگی۔ خاصا جارحانہ انداز تھا جیسے ہر شے تمہیں نہیں کر ڈا گی حالانکہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ حمزہ ہمیشہ ایسے ہی بات کرتا تھا لیکن کب دل میں ترازو ہو جائے پتا نہیں چ اس سے بھی اب اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”بائی فٹ۔“ وہ کارزن ٹیبل کو ٹھوک مارتے ہوئے پہلے کمرے سے پھر گھر سے ہی نکل آئی۔ وہ پری ط سلگ رہی تھی۔ حمزہ کے توہین آمیز رویے نے اس کی اندر آگ لگا دی تھی اور یہ آگ اب بجھنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

تیجور غزنی تین دن خزانہ کے ساتھ رہا پھر اسے حمیدہ بیگم کے پاس چھوڑ کر گھر آیا تو پہلے مرحلے پر ہی اگھر کی فضا بدلی بدلی سی محسوس ہوئی تھی یعنی جہاں خاموشیوں کا راج تھا وہاں زندگی اٹھ اٹھانیاں لے رہی تھی اس تمام عرصے میں پہلی بار اس کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکا تھا۔ قدموں کی رفتار تیز ہو گئی اور یہ بھی پہلی بار کہ وہ ماما، بابا کے بجائے سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا۔ سارہ بچے کی ٹیپی چھیچ کر رہی تھی۔ وہ بے ساختہ اور دبے پاؤں سارہ کے عقب میں گھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ جب بچہ فریش ہو گیا تب اس نے سارہ کی آنکھوں ہاتھ رکھ دیے۔

”تمہی۔“ سارہ فوراً چلائی تھی۔

”ارے میں تو سمجھا تھا، اب تم مجھے نہیں پہچانو گی۔“ وہ اس کی گال پر چٹکی کاٹ کر سامنے آ گیا تو سارہ ا دیکھ کر بولی۔

”وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

”شٹ اپ۔“ وہ ٹوک کر بچے پر جھک گیا۔ ”کیسا ہے ہمارا بیٹا۔ کچھ بولتا بھی ہے یا نہیں۔“

”ہاں بہت باتیں کرتا ہے، اچھی پوچھ رہا تھا۔ میرے پاپا کب آئیں گے۔“ سارہ کھلکھلا کر ہنسی تو دہ

ہی جھکے جھکے گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ کتنی خوش تھی وہ، جیسی وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اچکھ کرنا ہوا تھا۔

”جی! تم اتنی خاموشی سے گئے اور ایسے ہی خاموشی سے آ گئے۔ آئی مین فون کر لیتے ڈرائیور تمہیں آ جاتا۔“ سارہ نے ٹوکتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”سر پرانز پار! پھر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم بچے کے ساتھ کیا کر رہی ہو اور ہاں ماما، بابا خوش ہیں؟“
”ہاں، ماما خوش ہیں لیکن بابا کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے البتہ سونیا آپنی ان کا تو مت پوچھو۔ بچے واری صدقے ہو رہی تھیں۔ جیسے ان کا بیٹا ہو۔ سارہ سونیا کا بتاتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

”ان کے بھائی کا تو ہے۔“ وہ بے ساختہ کہہ گیا۔
”ہاں اور پتا ہے سونیا آپنی تو بار بار یہ کہہ رہی تھیں کہ یہ بالکل تمہاری طرح لگ رہا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ قصداً اپنا پھر فوراً بات بدلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مائی ڈیر سارہ! مجھے آئے ہوئے پندہ ہو گئے ہیں اور تم نے مجھے چیخ کرنے کو کہا نہ چائے پوچھی، پھر کہتی ہو تم مجھے بھول ہی نہیں سکتیں۔“

”اوسوری۔ سوری تھی! چلو تم جلدی سے فریش ہو جاؤ میں چائے لاتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی
”اور یہ بچہ؟“

”اسے ماما کو دے دوں گی۔“ وہ جلدی سے بچہ اٹھا کر چلی گئی تو تیمور غزنی نے داش روم کا رخ کیا
منٹ میں فریش ہو کر ماما کے کمرے میں آ گیا۔

”السلام علیکم!“
”خوش رہو۔ آگے تم۔“ ماما نے بچے پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا تو جانے کیوں ان کی نظریں اس

گئی تھیں جس سے وہ قدرے گھبرا گیا تھا۔
”بابا کہاں ہیں؟“

”وہ کسی کام سے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے آنے میں دیر ہوگی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔“ ماما نے اپنی پاس ا۔
تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر بیٹھتے ہی پوچھنے لگا۔

”بچے نے تنگ تو نہیں کیا ماما؟“
”نہیں بیٹا! زیادہ تنگ نہیں کرتا پھر اتنے بچے تو روتے ہی ہیں۔ چھلے کے بعد جا کر سیٹ ہوتے ہیں

میں دو تین بار اس کے رونے کی آواز آتی ہے لیکن سارہ سنبھال لیتی ہے۔“ ماما پیار سے بچے کو دیکھتے ہو۔
رہی تھیں۔

”جی، میں نے دیکھا ہے سارہ بہت خوش ہے۔“
”ہاں، تمہارے بابا کو بھی یہی اطمینان ہے کہ سارہ خوش ہے۔“ ماما نے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

”اور آپ ماما؟“
”میں بیٹا تم لوگوں کی خوشی میں خوش ہوں۔ یوں بھی بچے تو سب کے سانچے ہوتے ہیں۔ کسی۔

آنگن کا پھول ہمارے آنگن کی زینت بنا دیا ہے تو اب اس کی آبیاری ہم پر فرض ہے۔ اس کی پرورش تربیت میں کوتاہی مت کرنا بیٹا۔“ ماما بچے کی محبت میں بول رہی تھیں۔

”تھینک یو ماما! آپ نے خود پر میرا مان بڑھا دیا ہے۔“ ماما کے گرد بازو جمائل کر کے اس نے انہیں
تب ہی سارہ چائے لے کر آ گئی۔

”ادو، بڑے لاڈ ہو رہے ہیں ماما کے ساتھ۔“

”تم جیلس ہو رہی ہو۔“ اس نے سارہ کو چھیڑا۔

”بالکل نہیں۔ میرے ساتھ لاڈ کرنے والا آ گیا ہے۔“ سارہ نے چائے کا کپ اسے تھا کر ماما کی گو

پچھا اٹھالیا۔ ”میرا پارا میرا گڈا۔“

”اس پیارے گڈے کا کوئی نام بھی ہے کہ نہیں۔“ وہ چائے کا سپ لے کر پوچھنے لگا۔

”تم بتاؤ ناں، کیا نام رکھیں اس کا۔“ سارہ نے کہا تو وہ ماما کو دیکھنے لگا۔

”ہاں بیٹا، تم بتاؤ۔“ ماما نے اس پر ڈال دیا تو سوچتے ہوئے اچانک اس کی سماعتوں پر خزینہ نے دست

تھی۔

”جاذب..... بیٹا، تو ہم اس کا نام جاذب رکھیں گے۔“

”جاذب۔“ اس کے ہونٹوں نے پہلے بے آواز جنبش کی پھر سارہ کو دیکھ کر بولا۔

”جاذب..... جاذب تیسور۔“

☆☆☆

خزینہ کی آمد پر حمیدہ بیگم نے سب کو فون کر دیا تو عالیہ خالہ اسی انتظار میں تھیں سنتے ہی شرجیل کے

آگئیں۔ خزینہ سے بچے کا انوس کیا پھر مسلسل اسے اپنا خیال رکھنے کو کہتی رہیں۔

”اللہ کے کاموں میں ہمارا دخل نہیں ہے بیٹا۔ تم اپنا خیال رکھو، بہت کمزور ہو گئی ہو۔“

خزینہ بالکل خاموش تھی۔ آنسو بھی خشک ہو گئے تھے پھر عالیہ خالہ نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے

دھیان بٹایا، تب خزینہ خود ہی ان سے پوچھنے لگی۔

”شرجیل کی شادی کب کر رہی ہیں خالہ؟“

”ہاں بیٹا، تم اچھی ہو جاؤ پھر تاریخ رکھتی ہوں۔ میں تمہاری وجہ سے رکی ہوئی تھی۔“ عالیہ خالہ نے ا

جیراں ہوئی۔

”کیوں خالہ میرے بغیر شادی نہیں ہو سکتی کیا؟“

”نہیں۔“ عالیہ خالہ سے پہلے شرجیل بول پڑا۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو، تمہارے بغیر شادی کر کے پھر ساری زندگی مجھے تمہارے طعنے نہیں سننے تھے

کیا جلدی تھی کچھ دن صبر نہیں کر سکتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔“

”ہاں مجھے اور تو جیسے کوئی کام ہی نہیں ہے۔“

”کیا کام ہے، سنا ہے۔“

”سنی سنائی پر یقین مت کیا کرو۔“ اس نے فوراً کہا تو شرجیل کندھے اچکا کر رہ گیا تب ہی سپنہ آگ

ماحول قدرے بہتر ہو گیا تھا اس میں سپنہ نے پھر ہائے چا دی۔

”ہائے خزی! یہ تمہارے ساتھ کیا ہو گیا، اللہ نے خوشی دکھانے سے پہلے ہی چھین لی۔“

”ایسا مت کہو بیٹا! اللہ اور خوشیاں دکھائے گا۔“ عالیہ خالہ نے سپنہ کو ٹوکا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”میں نے تو جب سنا میرا کلیجہ پل گیا۔ کسی پل چین نہیں آ رہا تھا مجھے، اذکر تمہارے پاس آنا چاہتی

امی نے منع کر دیا۔ کہا جب تم یہاں آؤ گی تب آنا۔ مت پوچھو یہ وقت میں نے کیسے کاٹا۔ ہائے میرا تو رو

حال تھا تم پر کیا بیتی ہوگی۔“

”مجھے پر کیا بیتی.....“ اس نے آنکھیں بند کر لیں تو اندر آنسو جمع ہونے لگے لیکن وہ کیونکہ سپنہ کی

سے واقف تھی اس لیے اس کے سامنے رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آنسو اندر اتار کر بولی تھی۔ ”اللہ کی مرضی آ

ٹھیک کہہ رہی ہیں، اللہ اور خوشیاں دکھائے گا۔“

”ان شاء اللہ۔ بس تم اپنا خیال رکھو بیٹا۔“ عالیہ خالہ نے کہا تو سیدنا اب ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ہاں خالہ، شرجیل کی شادی کا کیا ہوا۔ سن رہی تھی اسی مہینے ہے۔“

”ہاں بیٹا بس آج کل میں تاریخ رکھ دیں گے، آؤ گی ناں؟“

”کیوں نہیں خالہ! میں تو کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ کتنا عرصہ ہو گیا خاندان میں کوئی شادی نہیں،

خزینہ کی ہوئی تو وہ بھی کوئی شادی تھی، ذرا مزا نہیں آیا۔ شرجیل کی شادی میں خوب انجوائے کریں گے۔“

موقع محل دیکھتی ہی نہیں تھی بس بولے جاتی جب کہ عالیہ خالہ خزینہ کا خیال کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”یہ شرجیل کہاں چلا گیا۔ ابھی تو یہیں بیٹھا تھا اور حمیدہ.....“

”امی شاید کچن کا جائزہ لینے گئی ہیں۔“ خزینہ نے بتایا تو عالیہ خالہ اٹھنے لگیں۔

”ارے، ہمارے لیے نہ کچھ کرے۔ میں اب چلوں گی۔“

”نہیں خالہ! کہیں ابھی، کھانا کھا کر جائے گا۔“ خزینہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے نہیں دیا۔

”ہاں ہاں خالہ! کبھی بھی تو ایسے ملنا ہوتا ہے۔ ابھی بیٹھیں۔“ سیدنا بھی روکنے لگی۔

”بیٹا! شرجیل سے پوچھ لو، اسے کسی کام سے جانا تھا۔“

”میں کہتی ہوں شرجیل سے، کھانا کھا کر جائے گا۔“ سیدنا کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی تو عالیہ خالہ، خزینہ

کر بولیں۔

”بیٹا! تم لیٹ جاؤ، زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”جی۔“ خزینہ بھی یہی چاہ رہی تھی، اپنے پیچھے تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

☆☆☆

جلدی جلدی کرتے بھی حمزہ کو آفس سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ جلدی یوں کر رہا تھا کہ دن میں

نے اسے فون کر کے بتایا تھا کہ خزینہ میکے آئی ہے اور وہ بیلا کے ساتھ اس کے پاس جائیں گی تو حمزہ نے ا

روک دیا تھا کہ وہ آفس سے جلدی آ جائے گا پھر ان کے ساتھ چلے گا۔ لیکن کام کے باعث وہ جلدی نکل ہی

سکا تھا۔ رہی سہی کسر ٹریفک جام نے پوری کر دی۔ وہ گھر میں داخل ہوا تھا کہ فاخرہ ناراض ہونے لگیں۔

”شاباش ہے بیٹا! انہیں آ سکتے تھے تو فون کر دیتے۔ میں بیلا کے ساتھ چلی جاتی۔ کیا سوچتی ہوں گی؟

بھابھی، ایسے تو بہت محبت جتاتے ہیں ہم لوگ۔“

”اوہو اماں! میں نے جان بوجھ کر دیر نہیں کی۔ چلیں اب جلدی کریں۔ بیلا کہاں ہے، بیلا.....“ اس

پوچھنے کے ساتھ بیلا کو آواز بھی دے ڈالی۔

”پہلے منہ ہاتھ تو دھولو۔“ فاخرہ نے کہا تو وہ جیسے بے زار ہو کر بولا تھا۔

”وہیں دھولوں گا۔“

”چلو پھر۔“ اس کی تھکن محسوس کرتے ہوئے فاخرہ نے مزید نہیں ٹوکا اور بیلا کو پکارتے ہوئے

اوڑھنے لگیں۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ حمیدہ بیگم کے ہاں پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور وہ خواتین کا رونا د

سوچ کر حمیدہ بیگم کو سلام کر کے فوراً نماز کے لیے نکل آیا تھا۔

نماز کے بعد بھی کئی دیر وہ مسجد میں بیٹھا رہا اصل میں وہ تعزیت سے گھبرا تا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا

اس لیے جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں ماحول سازگار ہو چکا ہوگا تب وہ لوٹا تو واقعی حمیدہ بیگم اور فاخرہ ادھر ا

کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے خزینہ کو سلام کیا تو وہ بھی اشارے سے جواب دہ بولی۔

”میں تو سمجھی عشا پڑھ کر ہی آؤ گے۔“

”ہاں آج کل اذانیں جلدی جلدی ہو رہی ہیں۔ ایک نماز پڑھ کے ہٹو دوسری حاضر۔ ویسے اچھا۔ جلدی فارغ ہو جاتا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے بیٹھا تب بے ساختہ پوچھا۔

”تم کیسی ہو؟“

”اچھی ہوں۔“ خزینہ انفرادی سے مسکرائی تھی۔

”اللہ ہمیشہ اچھا رکھے۔ مجھے اصل میں آفس میں دیر ہو گئی۔ گھر آیا تو اماں تیار کھڑی تھیں۔ چائے پینے دی۔“ اسے چائے کی طلب تھی۔

”ارے تو شہرینہ سے کہو چائے بنا دے گی۔ وہیں کچن میں ہے۔“ خزینہ نے اس کی خواہش سمجھتے ہوئے شہرینہ کا سن کر اس کا دل میچ گیا لیکن فوراً نہیں اٹھا۔ حمیدہ بیگم اور فاخرہ کو دیکھنے لگا جو جانے کون۔ چھیڑے بیٹھی تھیں۔

”تم پیو گی؟“ اس نے اٹھتے ہوئے خزینہ سے پوچھا۔

”نہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پی تھی۔“

”اچھا پھر دعا کرو مجھے چائے مل جائے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ کچن سے برتنوں۔ شہرینہ اور بیلا کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اس نے لاؤنج میں چند لمحے رک کر کچھ سوچا پھر کچن کے درمیان آن کھڑا ہوا۔

”چائے ملے گی؟“ اس نے کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر کہا تو جہاں بیلا نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا شہرینہ سنک کی طرف گھوم گئی۔

”میں بتاتی ہوں بھائی۔“ بیلا نے کہا تو وہ شہرینہ کی پشت پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”تم نہیں، شہرینہ بتائے گی۔ ہم اس کے مہمان ہیں۔“

”ہو نہ مہمان۔“ رخ موڑے کھڑی شہرینہ نے دانت پیسے پھر تیزی سے پلٹ کر چاہا کہ کچن جائے اور وہ اس کے قریب سے نکل بھی جانی لیکن جزرہ نے جھپٹ کر مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ پھنکاری۔

”بیلا! تم کھانا دیکھو، چائے بعد میں۔“ اس نے بیلا سے کہا پھر شہرینہ کو گھینٹتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”چھوڑو مجھے، بد تمیز، جنگلی۔“ وہ دبے لہجے میں چیختے ہوئے اپنی کلائی چھڑانے کی سعی کر رہی تھی لیکن

گرفت مضبوط تھی۔ چھت پر لے جا کر ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے کر کے بولا۔

”تمہیں میری بات سنی پڑے گی۔“

”نہیں، میں کچھ نہیں سنوں گی۔“ شہرینہ کا تنفر عروج پر تھا۔ وہ بھی آپے سے باہر ہو گیا۔

”سنو کی نہیں تو سمجھو کی کہے۔ اپنے آپ تم نے جو چاہا سوچ لیا، سمجھ لیا۔ حقیقت جاننے کی ضرورت

سمجھی۔ اس کا مطلب ہے تمہیں کبھی مجھ پر اعتبار تھا ہی نہیں اور مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے تم ایسے ہی

کی تلاش میں تھیں۔“

”تم.....“ شہرینہ سناٹے میں آ گئی۔

”ہاں، میں بھی ایسا سوچ سکتا ہوں لیکن میں نے ایسا نہیں سوچا کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

محبت۔ میں تم سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا اور ایسا ہی میں تم سے چاہتا ہوں لیکن تم..... تم نے میرا مان توڑ دیا۔“
شہرینہ کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ بس پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ جنہ
سمیٹنے کی خواہش دباتے ہوئے وہ مزید سخت لہجے میں بولا۔
”بیٹھ جاؤ۔“

شہرینہ خائف ہو کر بیٹھی تھی، کیوں اس نے اتنے غصے میں تو اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تو یوں لگ رہا
جیسے اگر وہ ذرا بھی اس کے خلاف چلی تو وہ سب کچھ تہس نہس کر ڈالے گا۔

حزہ کچھ دیر اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا پھر اس کے سامنے بیٹھ کر کہنے لگا۔
”میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا اور سچ یہ ہے کہ جو تصور تم نے مجھے سچی محبت میں وہ لڑکی ربیکا ہے۔ بڑ
باپ کی بگڑی ہوئی بیٹی۔ پہلے جہاں میں کام کر رہا تھا وہاں کے باس حسان صاحب ہیں اور ربیکا ان ہی کی بیٹی ہے۔
نفسیاتی ہے۔ کوئی مانے نہ مانے میں اسے نفسیاتی ہی سمجھتا ہوں اور اس نفسیاتی لڑکی نے مجھے بہت پریشان کر رکھا۔
یعنی جیسے وہ بازار میں رکھی ہر شے خرید سکتی ہے ویسے مجھے بھی خریدنا چاہتی ہے۔ میں جہاں جاؤں وہیں پہنچ جاتی۔
تنگ آ کر میں نے وہ جاب چھوڑ دی اور اس کے باپ سے بھی کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو سمجھا کر رکھے۔ میں بکاؤ مال
ہوں پھر اپنی چچا زاد سے منسوب ہوں اور جلد چھٹی شادی ہونے والی ہے۔“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر
شاید شہرینہ کچھ بولے گی لیکن وہ ہونٹ سیے بیٹھی تھی تب وہ مزید گویا ہوا۔

”اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے ماں باپ کو بھی مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ خود اس لڑکی کی ضد سے
ہیں، جو کسی کی سنتی ہی نہیں۔ آخر حسان صاحب نے مجھ سے ریکوریسٹ کی بھی کہ میں ہی اسے سمجھاؤں اور میں
ہر حربہ آزماؤں الا لیکن.....“

”چاہتی کیا ہے؟“ شہرینہ کے صرف ہونٹوں نے حرکت کی تھی۔
”شادی.....“ وہ بے ساختہ کہہ کر سٹپٹا تھا۔ ”میرا مطلب ہے مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“
شہرینہ نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تو فوراً بولا۔

”لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر اور یقین کر دوں کہ میں کتنی بار اسے ٹھوکر مارا
ہوں لیکن وہ ڈھیٹ پھر میرے راستے میں آ جاتی ہے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں، کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں
مجھے تو اس کا ایک ہی حل نظر آتا ہے کہ ہم فوراً شادی کر لیں۔ ہے ناں؟“ اس نے تائید چاہی لیکن شہرینہ نے
جواب نہیں دیا۔

”ہاں یا ناں۔ کچھ تو کہو۔“ اس نے شہرینہ کا ہاتھ ہلا کر کہا۔
”پہلے میں اس سے منہ لوں۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی تمہیں مجھ سے چھیننے کی۔ میں اسے چھوڑا
نہیں، حلیہ بگاڑ دوں گی اس کا۔ جھٹکی کیا ہے خود کو۔“ شہرینہ چیخ کر بولے چلی گئی۔
اور حزرہ اطمینان سے ہو گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء)

مصباح علی سید

اللہ کی مرضی



آتا۔ گا بکی کو دیکھ کر آسیہ نے مشورہ دیا تھا، مال ڈبل کر لو، دو تین کی جگہ چار پانچ۔ بچنے لگیں گے، یہی سوچ کر عنایت اللہ سے کچھ فرض لیا، ٹھیلہ اسٹڈیم کے باہر سجایا تھا اور بھگدڑ مچ گئی۔ پہلا دھکا جانے کس کا لگا تھا چاٹ سے بھرا تب پہلے الٹا تھا پھر پھل نیچے گرنے لگے، لوگوں کے پاؤں کے نیچے آتے کیلے انکو زامرو د کو روکتا یا لوگوں کو۔ اسے ہم سے کوئی سروکار نہیں تھا اپنے مال سے مطلب تھا، ہم ہوتا تو پھٹتا، البتہ ریاض کا دل پھٹ گیا تھا۔ گھر آ کر اتار دیا کہ صرف دھاڑوں کی کسر تھی، کل چار ہزار کا سامان تھا، جو ملیا میٹ ہوا، تین تو عنایت اللہ کے تھے، آسیہ نے ہی اسے حوصلہ دیا۔

”اس میں بھی اللہ کی کوئی مرضی ہوگی۔“
 ”کیا مرضی ہوگی۔ ہم ہی پھٹ جاتا کم از کم۔“
 عنایت اللہ ترس کھا کر معاف کر دیتا۔
 ”ایسے مت کہو۔ جان بچ گئی کیا کم ہے۔“ پہلا خیال بھائی سے مدد لینے کا آیا، اس نے اپنے مسائل کی اتنی لمبی فہرست سنا دی۔ آسیہ اس کی روزی کی دعائیں مانگتی واپس آئی اور اگلیوں سے انگوٹھیاں اتار کر ریاض کے ہاتھ پر رکھ دیں۔
 ”یہ دے دینا عنایت اللہ کو۔“

دو ماہ کی دلہن کا زیور بچتا، ریاض کے دل کو دھکا سالگا، ناچاہتے ہوئے بھی بچتا پڑا۔ عنایت اللہ نے عنایت کردی انگوٹھیاں تو نہ لیں البتہ مشورہ دے دیا ان سے ٹھیلہ پھر لگو، کما کر دے دینا۔ کام چل پڑا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے قرض بھی اتر گیا، رزق بھی چلتا رہا معمول کے پیچھے بھانجی زندگی میں خلل تب آیا جب سر شام ریاض کے آنے کے بجائے اس کے ساتھی نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”بھابھی ریاض کی حالت بہت خراب ہے، اسے اسپتال چھوڑ لائے ہیں۔“

مانو آسیہ کے قدموں نیچے زمین مل گئی تھی۔
 ”ہوا کیا بھائی؟“
 ”کھڑے کھڑے الٹی کی، پھر چکر آ گیا۔“

اس کے اندر کے چھائے سکوت کو نہ گرج توڑ سکی نہ سوکھی مٹی پر گرنے والی تڑتاتی بوندیں صرف صفحہ کا انداز و آواز یہ کام کر گیا تھا ورنہ ساری تو ہوتی تھی مسلسل ماں بیٹی کی باتیں سنتے اور یہ جتنے کاش اس کے کان نہ ہوتے اگر ہوتے تو پھر اس کی مانند نہ دکھائی دیتے، نہ گونج سے پیدا ہونے لہریں وجود پر اثر ڈالتیں، اپنی جگہ صحیح سلامت بل کی تھیں کھڑی، چلو کان نہ سہی خود ہی دیوار کی اینٹ کی، مگر وہ تو خود دیوار سے لگا دی گئی تھی یہی بھر بھر کی دیوار سے اور اب مٹی اڑاؤ اس پر گر گئی۔ چند لمحوں میں ڈھیروں گر چکی تھی مگر وجود ہی طرح دبا نہیں تھا۔ بات صرف حق کی تھی جو اللہ مرضی سے تھا، مگر اس کے بندوں کی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ سمجھا سمجھا کھوکھلی ہو گئی تھی اندر باہر سے۔
 جب ڈاکٹر نے کہا۔

”رغم چاہے۔ علاج ہوتا ہے، مگر مفت نہیں۔“
 آسیہ کی پہلی نگاہ اپنی خالی انگلیوں پر گئی تھی، ان میں دو انگوٹھیاں تھیں ایک ماں نے دی تھی۔ میاں نے، علاج کی نذر ہو گئیں، جب ریاض علاج کا مسئلہ نہیں تھا پیٹ کا مسئلہ تھا، یعنی اک کا۔

ریاض کا اچھا بھلا فروٹ چاٹ کا ٹھیلہ تھا براہ وقت کی افو ہوں کا۔ دن کا دوسرا پہر تھا، آج اس کا اسٹڈیم کے باہر سجا تھا۔ لوگوں کی آمد شروع ہو چکی تھی باہر سے آئی ٹیم کے ساتھ تھا، ریاض یقین تھا آج معمول سے زیادہ کمائی ہوگی جانے اس نے اسٹڈیم میں ہم کی خبر اڑادی۔ ریسکیو اور اس سے زیادہ میڈیا حرکت میں آ گیا پھر علاقے میں نے وقت سے پہلے قیامت کا سماں دیکھا ایک جے پر گرتے پڑتے عجیب ہی بھگدڑ، جس کی رگید جانے کس کا کیا کیا آیا۔

ایک تو اللہ کی طرف سے گا بک ان دنوں بہت ہے تھے، ساری چاٹ دوسرے پہر ہی بک جانی، کے دو تین سوخ جاتے تھے کھ کا کھلا خرچ نکل

بڑے اسپتال چھوڑ آئے ہیں کہو تو تمہیں بھی لے چلیں۔“

ایک عمر کم دوسرے آسمان کی لالی پر چھاتی سیاہی سے دل بے ترتیب سا دھڑکا تھا۔ کئی بار سوچ کر خود کو سیاہ چادر میں لپیٹا اس کے پیچھے پیچھے چل بڑی۔ بڑا سا اسپتال طرح طرح کے لوگوں سے بھرا، کہنے کو تو وہ انتہائی نگداشت کا یونٹ تھا لیکن مریضوں سے ابلا جاتا تھا، کسی کو مشکل سے سانس آرہی تھی کسی کی جارہی تھی ایک کونے کے بیڈ پر ریاض بھی دکھائی دیا دو تین ڈاکٹر منہ پر ماسک چڑھائے اس کے اوپر جھکے تھے۔ جب ہی ایک نرس نے اس کا بازو باہر کی جانب کھینچے ڈپٹا تھا۔

”اندر کس نے آنے دیا۔“

وہ صرف اس کا منہ دیکھے گئی۔ ”دعا کرو بی بی۔

تمہارے مریض کو دل کا دورہ پڑا ہے۔“

حلق میں انکا دل دھب سے اندر کہیں جاگرا، دعا تو جانے ان لحوں کوئی یاد آئی تھی یا نہیں، پانچ ماہ پہلے کا ایک منظر یاد آرہا تھا نکاح کا رجسٹر سامنے بچھا تھا انگوٹھا لگانے کے بعد بڑے بھائی نے شفقت کا ہاتھ رکھتے یہی کہا تھا۔

”اس گھر میں جتنا تیرے نام کا دانہ بانی تھا، سو

کھالیا۔ اب تیرا جینا مریاض کے گھر کھایا گیا۔“

وہ تو جینے مرنے کو تیار تھی لیکن اس سے پہلے وہ مر رہا تھا، آسیہ کی رک رک کر تیری سانپوں کو ڈھارس، کچھ دیر بعد ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر دی تھی۔ ”فی الحال خطرے سے باہر ہے، لیکن جلد دل کا آپریشن کرنا پڑے گا۔“

☆☆☆

اس کے دل کے بدلے اگر دل بدلا جاتا وہ سو بار

پورے دل سے حاضر تھی، لیکن وہ تو کسی بینڈ کا کہہ رہے

تھے جو اس کی نالیوں کھولنے کو ڈالنے تھے، کوئی عام ربڑ

بینڈ ہوتے وہ اپنے جہیز بری کے سارے اٹھا کر دے

دیتی، جانے کیسے بینڈ تھے جو لاکھوں کا کہہ گئے۔

دوست، احباب، ساقی اور اس کے میکے والے سب

دیکھنے پوچھنے آئے تھے آتے جاتے پھل جس بھی دے

گئے، بس بینڈ دینے کی کسی کی ہمت نہیں تھی

دس دن اسپتال رہ کر فاقہ امت زدہ

گھر لے آئی، دوائیوں کے ساتھ ڈاکٹر

کے پرہیز بتا دیے تھے۔ گوشت کھائی کا تو

پرہیز تھا گھر میں، اس کی فردا ہی کھی بھو

اب نمک کا بھی کر لے گی۔ بھاری کام

تک پیدل نہیں چلنا یہ مشکل تھا۔ بھرا

رزق کمانے والا نازک قدم کس کے پر

کام ٹھپ ہو کر گھر آ پڑا، کچھ جمع پونجی

گئے دے گئے، دواؤں کا خرچ نکل

اس بینڈ کے جوڑ توڑ بھی پورے نہیں آ

کرایے کا، کام روز کا روز، تعلیم ہنر کوئی

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کوئی چراغ رگڑ کر ایک

میں کم از کم ستراسی ہزار کا انتظام کر لے

دیں گے۔ جس کے پاس ستراسی روپے

نہ ہوں وہ ستراسی ہزار کہاں سے کرے۔

ذہن میں شاید کبھی بھی نہ آتا بات ہی

سامنے والی حاجرہ خالہ کی بہوکانوں میں

”چل تیرا گھر کرایے کا ہے، پر تہ

تو اپنا تھا۔ وہ چل بسا، تیرا حصہ بن گیا نا

پھر ایک پلاٹ بھی سنا تمہارے ابا کے

وہ کہہ اپنے بھائی سے، بیچ کر تیرا حصہ دے۔

بات یہاں سے ہی بگڑی تھی، انہ

سن کر جس طرح اس وقت آسیہ کا منہ ج

بھائی بھابھی کا اس سے بھی بڑا اٹھل گیا۔

”جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں ش

ہے حصے بخرے کرنے، جانتی بھی ہے

کی کھائی سے ایانے گھر بنوایا تھا، مزدورو

ایشیوں ڈھونڈیں، اور وہ پلاٹ، بزر

ہے، چلی ہے بکوانے۔“

بھائی غصے میں اٹھ کھڑا ہوا وہ منمنہ

کھڑی ہوئی۔

”میں کبھی بھی نہ کہتی، لیکن کیا کر

طبیعت سنبھل نہیں رہی۔ ڈاکٹر کہہ رہے

غرضی کی، آسیہ۔“

صغیر نے کانوں کو ایسے ہاتھ لگائے جیسے آسیہ نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لیا ہو، سوائے آنسو بہانے کے کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

آسیہ نے اپنی سی ساری کوشش کر لی مگر کوئی صورت بن کے نہیں دی اچانک سے ذہن میں مولوی شکور کا خیال آیا اسلم کسی کی بات مانے نہ مانے مولوی شکور قبلہ کعبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور کیوں نہ رکھتا صوم و صلوة کا پابند، دین کے سارے ستون چلتے پھرتے بچوں کو ازبر کرواتے تھے۔ آسیہ نے ان ہی کے آگے مدعا رکھا، سن کر لکھو بھر کو وہ بھی ساکت ہوئے تھے جیسے آسیہ نے دین سے پھر جانے والی بات کہہ دی ہو، سکتہ آسیہ نے یہ کہہ کر توڑا۔

”مولوی جی آپ نے ہی قرآن کا ترجمہ پڑھایا تھا نا، وراثت میں بیٹے کے دو حصے بیٹی کا ایک۔ مجھے آدھا ہی دلوادو، وہ بھی صرف پلاٹ سے۔“

”ہاں ہاں میں کروں گا بات اور تو بھی ذرا بھائی کا خیال کر، وہ بھی بیوی بچوں والا ہے سو ضرورت پڑ سکتی ہے، کہاں جائے گا وہ بے چارہ۔“

”مولوی جی آپ ہی کہتے ہیں اللہ پر یقین رکھو، اللہ اگر میرے لیے سبب بنائے گا تو کیا ضرورت پڑنے پر بھائی کے لیے نہیں بنائے گا۔“

مولوی صاحب کو حلق سونٹھا لگا اس کے سر پر شفقت کی چمکی دی۔

”اچھا اچھا اور میں مختیر افراد سے بھی بات کروں گا۔ ہو جائے گا تیرا مسئلہ حل۔“

صدقہ، خیرات، زکوٰۃ سب اُس پر جائز سمجھ رہے تھے حق نہیں؟ اسے بھیک نہیں حق چاہیے تھا۔ اس نے پھر مولوی صاحب کو جا پکڑا۔

”بخشش نہیں حق مولوی صاحب، حق۔ جو اللہ نے رکھا ہے، جو آخری کتاب میں بیان کیا گیا، جس کی تقسیم میں دیر کرنے سے ممانعت کی گئی، مجھے وہی حق چاہیے۔ بھلے آدمی سے آدھا مگر چاہیے۔ آپ

”اوہ بھاڑ میں گئے ڈاکٹر۔“ وہ بات کاٹ کر اڑا تھا ”انہیں تو فیس چاہیے۔ آدمی دنیا دل کی بیض ہے، مر گئے کیا سارے۔ لہسن کھلا خود ہی پاں مھل جائیں گی۔“

”تو اور کیا۔ میرے خالہ زاد کو ہوئی تھی تکلیف سن سر کہہ کی دوائی بنا کر پی۔ لے دیکھ کتنے سال گئے اچھا بھلا ہے۔“

صغیر بھابھی کے قیاس پر اس نے وضاحت دینی سی۔ ”اسے صرف بلڈ پریشر تھا بھابھی، ریاض کو تو۔“

”اوہ کچھ نہیں ہوتا ریاض کو۔ بے فکر رہ تو۔“

بھائی نے پھر بات کاٹی۔

”میں کون سا کوئی خیرات یا ادھار مانگ رہی ہوں، میرا حق ہے، اپنا حصہ مانگ رہی ہوں، چلو پت پر پورا نہیں ہے آپ کے پاس، آدھا ہی دے علاج تو کرواؤں اس کا۔“

”حق.....“ بھائی کا استہزا میں ایک رخسار بلا۔ بھابھی کی توری چڑھ گئی، ذرا جتا کر بولیں۔

”آج تک کسی لڑکی نے مانگا حصہ، خاندان اس پر دوس نہیں بتا دے، عجیب بات کر رہی ہے۔“

”پالا پوسا، سمجھایا بھایا۔ جہیز دے کر شادی کر۔ اب اور کتنا حق رہ گیا تیرا۔ بیٹیوں کا اتنا ہی

”ہوتا ہے۔“

”تو کیا ابانے بھائی کو نہیں پالا پوسا تھا، شادی تھی۔ جب بھائی کا حق ہے میرا کیوں نہیں۔“

”اے معاف کر دے بہن۔“ بھائی تو کپڑے اڑا غصے میں باہر نکل گیا تھا بھابھی نے بہت زور دیا تھا اس کی تالی پیٹ کر اس سے معافی مانگی۔

”اب اللہ نے تجھے چھت نہیں دی، تو بھائی کی بننے آگئی، تجھے حصہ دے دیں خود سڑک پر تنہا لگا کر نہ جائیں، یہ چاہتی ہے نا تو۔“

”بھابھی میں تو اس پلاٹ۔“

صغیر بات کاٹ کر بولی۔

”ایک ذرا سا کلچر اتیری آنکھوں میں کھٹک رہا، بھائی کے پاس ہے تو کیوں ہے، حد ہے خود

ہر موضوع پر وعظ دیتے ہیں، اس مجمعے، ترکے پر دیں۔ اللہ نے بہت زور دیا ہے ترکے پر۔“

ایک دوبار کا اصرار وہ ٹال دیتے، ہر تیسرے دن وہ آدمکتی، شروع میں منہ سے کہتی پھر آیتیں حدیثیں نکال نکال کر لانے لگی۔ مولوی شکور بھی عجیب مشکل میں پڑ گئے تھے۔ آسیہ سے زیادہ ریاض کے ٹھیک ہونے کی دعا میں مولوی صاحب نے اپنی تہجد میں مانگی ہوں گی۔ لیکن ہر معاملہ دعا سے ٹھیک نہیں ہوتا، دوائی دار اللہ کا حکم ہے۔ جو بڑا ہی مشکل کام تھا، مگر روز روز کی منتوں پر ٹھیک آکر مولوی صاحب کو وعظ دینا پڑا۔ مجمعے کے خطبے کے بعد ذرا دے لفظوں میں ترکہ واضح کرنے لگے۔

”سائنس نکلتے ہی بچے ہوئے مال پر وراثت بن جاتی ہے، بھلے بیٹن ہوں، پھٹی قمیص، کھانسی کا سیرپ ہو یا مال مویشی، جو بیچ گیا، وہ اقرباء کا ترکہ ہے، بڑے کے دو حصے، بڑی کا ایک۔“

اتنے لفظوں میں گھر جائیداد پھر بھی گول کر گئے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ مسجد کے پچھواڑے ان کے ابا کے بنے گھر کی کوٹھڑی میں ان کی بیوہ بہن کے کان لفظ ترکہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے تھے ”گھر کھر“ چلاتی سلائی مشین روکی، عینک اتار کر کان کے پیچھے دوپٹے کی کئی اڑتی کوٹھڑی سے باہر نکل آئی، دس سال پہلے جب وہ بیوہ ہو کر آئی تھی روز روز بھادج کے طعنے تشوئوں پر کہا تھا۔

”مولوی جی میرا جو حصہ بنتا ہے اتنے میں دیوار کروادو۔ ہر وقت کی کل کل ختم ہو۔“

”ہوش میں بھی ہے زلیخا۔ باپ کے گھروں میں کبھی دیواریں اٹھیں۔ میری نظروں کے سامنے رہے گی دل مطمئن رہے گا تیرا بھی میرا بھی، آج دس بارہ کا ہے تیرا بچہ، کل بیس بچیں کا ہو جائے گا، مکائے گا، جہاں مرضی گھر ڈال لیتا۔“

دس سال ہو گئے اور بچہ بیس کا، مرضی کا گھر نہیں ڈال سکی، ڈالنی کہاں سے مشین چلا کر اس کی پڑھائی کا خرچہ نکال رہی تھی، ابا نے یہی مشین دی تھی بس

یہی میرا ترکہ ہوا، اس نے لعنت بھیجی کھانسی کے سیرپ پر اور عینک کے صاف کرنی اپنی کھر کھر پر جا بیٹھی۔ اس کے درد کے باعث آج جمعہ گول کر کے میں وعظ کا لفظ ترکہ پڑا سر کا درد اٹھا رکھ کے آرام پر تیزی سے مسجد کی جانب بھاگتا اسپیکر پر تھا۔

”ترکے کی تقسیم میں جتنی دیر ہر میں اتنی بد مزگی۔ جلد سے جلد کا حکم آیا۔ منہ سے پھسلے لفظ چوہدری واپس سکا البتہ حجرے میں جا کر آستنی سے کھاتا۔“ مولوی جی اللہ کا حکم اس کے بند ہے اور بندے بیٹھے ہیں مسجد میں، پھر ضرورت، آپ نے کہہ دیا انہوں نے بیان میں ذرا احتیاط کیا کریں۔“

☆☆☆

آسیہ نے بارہا اسلم کو وعظ یاد دلایا ایک ہی کہی۔

”کس نے کہا تھا نہلانے والے کو ادا دے، نہ دیتی، ایک حصہ کیا بھلے سے سالی لیتی۔ بچی دوائیاں پھینکتے تو نے ہی نہیں بچائے میرے بھائی کو اس سے اور مال مو سامنے دس مرغیاں چھوڑی تھیں، ایک صدے میں ہی چل بسی باقی نو۔ تیرا (سونم) کا۔ بتا پیچھے کیا بچا۔ کیا دوں تجھے۔“

”گھر۔ یہ بھی تو مال میں ہے اور بھی تو وراثت ہے بھائی۔“

”گھر زمین کی بات نہیں کی مولیٰ نے، بھلے جا کر پوچھا۔ میں نے سارا خطا آسیہ کے کہنے سننے کا کوئی اثر نہیں! جب ریاض کی طبیعت بگڑتی، تب تب آگے روٹی، پھر یہ رونا مستقل پڑ گیا، ریا سوچا تھا نجانے کس پہر سینہ مسلتے اٹھا، آہ سے پہلے ہی چل بسا۔ لوگ آئے افسوس

”احسان تھوڑی کرے گا، جو اس کا حصہ بننا ہے اس میں سے دے دے۔ خود سوچ پلوٹھی کی اولاد ہے اس کی اور اتنا بڑا روگ۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں ابھی تو دل کا سورخ چھوٹا سا ہے یہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا ناخوستہ بڑھ گیا۔ پھر۔“

لوہے کے سر یوں کے پیچھے سے جھانکتی خشک سیاہ آنکھیں ایک دم گدلی سی ہوئیں، سوکھی ہنسی ہری ہو کر اکڑی، باہر نکل تن کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی وحشت ناک جیسے گورستان سے بدروح نکل آئی ہو یا پیری سے آسیب وہ ممکن حد تک وحشت ناک آنکھیں پھیلانے کہہ رہی تھی۔

”پھر..... پھر کیا بھابھی منیہ؟ پھر اللہ کی مرضی۔ ڈاکٹروں کے کہنے پر خون پسینے سے بنے گھر تھوڑا بکتے ہیں اور بزرگوں کی جائداد وہ تو آخری نشانی ہے، ہمارے بڑوں کی۔ کچھ نہیں ہوتا شازیہ کے بچے کو فیہ کھلانے دل کا سورخ خود ہی بھر جائے گا۔“

اسلم نے چونک کر دیکھا تو منیہ نے ملاحتی نگاہ سے، وہ تو اپنے بچوں کو اس کی پرچھائی سے بھی بچانی آئی تھی کہیں تحوست پڑ نہ جائے اس موقع پر آگئی اہمیت جتانے۔ البتہ شازیہ حیران تھی گھر بھر میں اسے سب سے زیادہ چاہنے والی پھوپھی کیا کہہ رہی ہے۔ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

”پھوپھی یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔ ابا اتنی مشکل سے مانتا ہے اور تو۔“

”پال پوس کے شادی کر دی بس۔“ اس نے ہاتھ اٹھا اسے چپ کر دیا۔ ”میرے جیسے جی کسی لڑکی کو حصہ نہیں ملنے والا۔ یہ میں اپنی زندگی میں نہیں ہونے دوں گی“

”ہونہ۔“ منیہ نے ناک چڑھائی بھلا بچتے بچاتے اس سے کون پوچھے گا آنکھیں تو تب کھلیں جب اسلم نے کہا گھر ابا کے نام ہے آسیہ ابا کی اولاد۔ اس کے انگوٹھے بتائیں بک سکتا۔

منیہ کا سب سے پہلا مشورہ یہی ہوتا کہ سوتی بڑا کالکالو، خیر تو کاٹ کے لے جاؤ مگر وہ اسکا

مصرم تھی اسلم صدمے سے دیوانہ، سال بھر کی بیانی کو سفید چادر میں لپیٹ کر لانا آسان تو نہیں ہوتا، اس نے تڑپتے دل کے ساتھ ہی صدمہ سہا، سفید رو لپیٹ کر آسیہ کو پڑسہ دیتے اسلم کی ہچکیاں نکلیں جو محلے کے بہت سے لوگوں نے سنی۔

”صبر کر بہن، صبر۔ جو اللہ کی مرضی۔“

پتھر وجود میں جان پڑ گئی، چادر کھینچ کر زمین پر پٹی۔

”اللہ کی مرضی یا اس کے بندوں کی مرضی؟“

اس کے انداز پر اسلم کیا منیہ بھی چوٹی ”اللہ تو چودہ سو سال پہلے مرضی لکھوا دی تھی، سینوں میں ردی۔ ہر مشکل کا حل سیدھے آسان رستے، پر اس کے بندے نہیں چلنا چاہتے ان رستوں پر۔ اپنی اس اللہ کی مرضی کا نام مت دے بھائی۔“

بھائی بھادوچ کو برا نہیں لگا انہیں پورا یقین تھا وہ رے سے ٹھیکائی، شہنائی گئی روٹی گئی، کڑوا زہر بے مول پانی خواہ خواہ ہی سوکھی جلد پر پھسلا گیا، بس پھسلے پھسلے سوکھ گیا۔ پانی کیا سوکھا وہ خود بھی تھکتی چلی گئی، بے کار سوکھی سڑی ہنسی کی طرح، جلاؤ بنا سیک دیے دھڑ دھڑ جل ختم۔ نہ جلاؤ تو ادھر ادھر بے کار کا گند، گند نے اپنی جگہ بستر پر بنائی تھی۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا گود کے کھلانے بھتیجا بھتیجی قد سے نچے ہوئے، شادیاں ہوئیں، اس پلاٹ پر۔ گھر بن تھا، جس کا کرایہ اسلم کی اضافی آمدن کا سبب تھا۔

یہ بچوں سمیت خوش باش زندگی گزر رہی تھی۔

زندگی سب کو معمول پر ہانک رہی تھی کہ اجانک

م کی بڑی بیٹی شازیہ بہت پریشانی میں آئی۔ بچے کو گود

لیے ساری رات ماں کے آگے ٹوے بہانی رہی

وہ رات آسیہ نے کروٹیں بدل بدل گزاری۔ کئی بار

کیا کان سی لے یا کاٹ کر دفنا دے۔ سیاہ بادل نے

اند ستارے کیا سورج تک ڈھانپ لیا تھا، منج پھر بھی

ئی۔ ون چڑھے مقدمہ اسلم کے آگے رکھا گیا بادلوں

کڑک، چک، پھر تڑ تڑ گرتی بوندیں اس کا سکتہ نہیں



سلطان محمد
ملت اسلام کے لازوال کردار "سلطان محمد قاضی"
نہالیاں کی سبق آموز داستان
محقرمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ اور کائی تار

مورت مانتا
جب رشتوں میں کفر رب لالچ اور ہوس شامل ہوگا
گلشن سحر میں تبدیل ہو جائے
اہم الہاس کا خصوصی اعجازِ تحریر

فہم زندگیاں
انسان کو اپنی ظلیفوں کا احساس پہلا وقت ہوتا ہے جب
راشد حبیب کے خیالات کی پرا

دکھا دیا
غدا کی پکڑی سخت ہوتی ہے وہ جس قدر جیڑی سے
اسی جیڑی سے مکمل کیجئے
جاوید راہی کے گرم سے ہمارے رخ

بہشتی شہ
زندگی اور بہشتی شادیوں کا انجام پہنچا دے
مبین شیعہ کی فصاحت

کمرے میں بند ہوئی سارا دن نہیں نکلی رات چھا گئی
بارش برستی رہی باہر بھی اندر بھی، چارپائی کے پاس
جلتے کوئلے کی انگلی بھی بجھ کر راکھ میں بدل گئی لیکن
اس کی زبان کے جملے نہ بدلے پٹی پر سر رگڑتے آسہ
کی زبان پر ایک ہی بات۔

”جیتے جی کسی کو نہیں لینے دوں گی۔“

لکڑی کی چھت سے ساری رات ریاض کی
آنکھیں جھانکتی رہیں سمجھاتی رہیں، لیکن وہ نہ بھی
کڑوا زہر پانی بہانی ایک ہی جملہ ”میرے جیتے جی
برداشت نہیں ہوگا ریاض۔“

پاس ایک عام سا کاغذ دھرا تھا رانا کوئی قلم
بھی، ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ایک جملہ لکھ دیا۔

”جاشازیہ تو بھی کیا یاد کرے گی، پھوپھی نے
اللہ کی مرضی پر چھاپ لگادی۔“

انگوٹھا سیاہ راکھ میں رگڑ کر جملے کے نیچے
چھاپ دیا پھر جواہل اہل کر آنسو گرے، ہچکیوں میں
بازو پھسلا کاغذ پر ہی سیدھا ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

ابا مان گیا یہ بہت تھا۔ شازیہ کو یقین تھا جتنی وہ
پھوپھی کی لاڈلی رہی ہے، ہو ہی نہیں سکتا پھوپھی اس
کا درد نہ سمجھے علیٰ اس نے اٹھ کر پھوپھی کے وضو
کے لیے پانی گرم کیا۔ پھوپھی جتنی صبح کی نماز میں نرم
ہوتی تھی اتنی سارے دن میں نہیں بس اُسی وقت منا
لے گی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ پھوپھی کو جگانے لگی،
پھوپھی نرم تو کیا انڈر کرخ پڑی تھی بے دم، چارپائی
سے لٹکتا بازو اوپر اٹھایا انگوٹھے کی اوڑوالی پور راکھ
سے سیاہ ہوئی تھی۔ جیسے کہیں چھاپ لگی ہو، کاغذ کی
تحریر شازیہ کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی،
پڑھتی گئی روتی گئی اس نے سیاہ پور چوم لی، کڑوا پانی
آنکھ سے نکلا، اس کا بازو چارپائی پر سیدھا کرتے
رندھے لچے میں آواز آئی۔

”پھوپھی اللہ کی مرضی سمجھ میں تو آتی ہے، پر اس
کے بندے جیتے دم پوری ہونے کیوں نہیں دیتے۔“

☆☆☆

محسار

(20 جولائی 1992ء)

سے سروکار تھا اور نہ کسی یاد سے بس مستقبل ایک ساتھ
ہی تھا۔

”ہم یہاں محفوظ ہیں ناں ثروت؟“ دلشاد نے
اپنی بڑی سی چادر سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بے
پیشی سے ثروت کی سمت دیکھا تھا۔

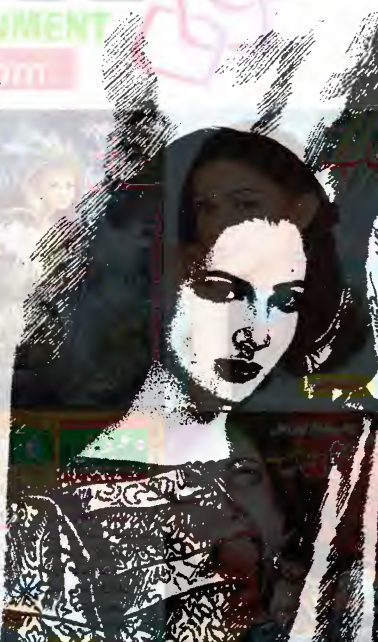
”ہاں شاید۔“ اور پھر آسمان کی طرف نگاہ کی
..... دور بہت دور کہیں اوپر سے بارش کے
قطروں نے نیچے پیاسی دھرتی کی طرف کا سفر شروع
کیا تھا۔

”ثروت یہاں پولیس تو نہیں آئے گی
ناں۔“ دلشاد نے ایک خدشہ دل سے نکالنے کی کوشش
کی۔

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا دلشاد کوئی راہ
نہیں ہے آگے کتواں ہے اور پیچھے کھائی فی الحال بس
کچھ دیر کے لیے ہی سہی، کچھ سانس لے لوں کھل کر
۔“ وہ وہیں سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ زرد چہرے اور دھنسی
ہوئی آنکھوں میں لرزتے خوف کے سائے لمحہ بھر کو
معدوم ہوئے تھے، پانی کے قطرے اس کے چہرے
سے ٹکرائے اور پھر آئین کی کچی مٹی میں جذب
ہونے لگے۔

”دس لاکھ روپے دس لاکھ۔“ دلشاد وہیں
دروازے سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔
”اس وقت مجھے نہ لاکھوں کی پروا تھی نہ جنت
دوزخ کی فکر آنکھوں پر بس اپنی بندھی مٹی گل ریز

دور، دور تک گھٹا ٹوپ اندھیرا، گہرے بوجھل
، کڑکتی بجلی اور آندھی کی صورت چلتی ہوا، تیز تیز
اٹھاتے ہوئے وہ دونوں عورتیں ایک بوسیدہ سے
کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ اندر
نے ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پیسے
کا سانس لیا تھا۔ دونوں کے لیے ہی یہ چھت
وقت کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ دونوں کی اپنی ہی
کہانی تھی مگر ایک بات تو طے تھی کہ اب نہ ماضی



کتاب

پیش

*WINE-2

WU DU LI SE

WORLD OF ENTERTAINMENT

www.wurduubos.com

کتاب

کتاب

2018

”ہاں یاربس دعا کرنا، میری بہن کو کسی کی بددعا نہ لگے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔“ وہ جیسے کہیں کھوسا گیا۔

”بددعا..... اوہ کس نے بددعا دینی ہے لالے، ایویں فالٹو کی فکر میں نہ پالا کر..... ویسے شادی پیاہ کے کاموں پر بڑا پیسہ لگتا ہے، کوئی لائری نکلی ہے کیا جو اماں کا آپریشن بھی کروالیا..... رقیہ کی شادی بھی رکھ لی اور وہ اماں بتا رہی تھی کہ تو نے نیا اسکوٹر بھی لیا ہے۔“ امجد نے قہقہہ لگایا اس کی لائری والی بات پر اس نے چونک کر امجد کو دیکھا۔

”بس یہی سمجھ لے۔“ وہ پیالہ رکھ کر اٹھ گیا۔
”اوئے کدھر..... ذرا کمر تو سیدھی کر لے۔“ امجد نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”نہیں یار..... رب را کھا۔“ وہ صافہ کندھے پر رکھتا دوبارہ ٹرک کی طرف بڑھ گیا دل کا بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ صبح سے غسل خانے کے چکر لگا رہی تھی۔ دلشاد کا وہم یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔
”تو ٹھیک ہے ثروت؟“

”ہاں..... لگتا ہے رات روٹی کچھ زیادہ ہی کھالی..... طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے۔“ وہ ہانپتے ہوئے لفافوں کے آگے بیٹھ گئی اور لٹی بنا کر لفافے بنانے لگی۔

”چھوڑ دے سارے کام ثروت! آرام کر، تجھے آرام کی ضرورت ہے۔“ دلشاد نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

”میری انٹی فلر نہ کر دلشاد، میں ٹھیک ہوں۔“
”تو ٹھیک نہیں ہے ثروت، شام کو ہم سرکاری ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو چیک کروا آئیں گے۔“ دلشاد نے اس سے نظریں چرائی تھیں۔ جو وہم اسے ہوا تھا وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر سکی۔

”ڈاکٹر کے پاس؟ وہ کیوں؟ کچھ نہیں ہوا مجھے، بس ذرا بد چھٹی ہے، تم کھانا بھی تو اتنا مزے دار بنائی

محبت کی پٹی..... مت ماری گئی تھی میری۔“ وہ صیں موندے چہرہ آسان کی طرف اٹھائے بوجھل سے بولی، جو اب دلشاد نے گل ریز کو موٹی سی گالی پر وہیں کہیں جیسے کوئی ان دیکھا جو اس گالی پر کسی خیال کے تحت ثروت نے جھٹکے سے صیں کھولیں اور منہ پر ہاتھ رکھے وہیں اونڈھی ہو

☆☆☆

ٹرک سے اتر کر اس نے دودھ پتی کا آرڈر کیا مٹانے سے صافہ اٹھا کر ماتھے کا پسینہ صاف کرتے چارپائی پر بیٹھ گیا دماغ شائیں شائیں کر رہا کئی دنوں سے نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

”کیا ہوا لالے..... آج پریشان لگ رہا ہے؟“
”اریز نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سامنے امجد کھڑا اس کا یار۔

”ہاں یار..... لگتا ہے دماغ پھٹ جائے گا۔“
”پر ہوا کیا ہے لالے..... کچھ تو بتا؟“ وہ وہیں کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں یاربس ایسے ہی، بے چینی سی ہے، سارے دل پر۔“
”اوکج نہیں یار..... بڑے دنوں سے تیری نیند

ی نہیں ہوئی ناں، اس لیے تو چائی۔“ امجد نے اس شائے پر ہاتھ مارا۔ وہ زبردستی کی مسکراہٹ بھی بے پرنہ سجاسکا۔

”ہوں۔“ اس نے الاچھی کی مہک اڑاتی دودھ کا پیالہ اٹھا کر لیوں سے لگا لیا۔

”اچھا یہ بتا کہ تیری اماں کا آپریشن تو ہو گیا ناں وہ اس کے پریشان چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے

”ہاں ہو گیا، اب تو اماں کی نظر بھی صحیح ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
”اور وہ بہن رقیہ کی بات بھی پکی کر دی تو نے،

اماں بتا رہی تھی کہ گل ریز کے گھر سے مٹھائی آئی ہے۔“ امجد نے بھی پیالہ اٹھا لیا۔

ماہنامہ خشتِ لاہور

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

نمبر 2018 کی شہادت کی ایک

☆ "تو دھڑکن میں دل" رحمان آتاب لکھ

☆ "مجھے آسمان پہ اڑنے دو" مریم ہاشمی

☆ "تم ہاں دھو" درشن کاکل ناول

☆ "بھٹی سیال کھاؤں"

☆ "شہر دل کا واس" حسن اختر

☆ "اک نام تمہارا" رابعہ انوار کا ناول

☆ "سہاس" رحمت انصاری، رمشا احمد، حنا

اور حنا بھٹی نے لکھا ہے۔

☆ "دل گزیدہ" امہریم کاسٹلے وار ناول

☆ "نہایت کہ اس پار کھیں" نایاب

کاسٹلے وار ناول



پیارے نہیں بننے کی پیاری باتیں، انشہ نامہ، ن

سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چ

018

ہوئیں۔" وہ دوبارہ لفافے بنانے لگی۔
اسی گلی کے برکت حلوائی نے انہیں سموسے،
پکوڑے، چلیبی اور مٹھائی کے لیے الگ الگ سائز کے
لفافے بنانے کا کام دیا تھا۔ یہ بوسیدہ سامکان بھی کسی
نے ترس کھا کر رہنے کے لیے گھول دیا تھا۔
"اللہ کرے کچھ نہ ہو، مگر میں نے کہہ دیا ہے کہ
ہم شام کو چلیں گے تو بہت کمزور ہو گئی ہے۔"
"اف خدایا، میں نے کہا ناں دلشاد کہ میں
بالکل ٹھیک ہوں، تو وہم نہ کر۔" وہ کام میں مصروف
ہوئی۔

"میں وہم نہیں کر رہی ثروت، تو آرام کر میں
تجھے قہوہ بنا کر دیتی ہوں۔" وہ اسے زبردستی اندر
کمرے تک لے گئی۔

"اب شام تک تو نے یہاں سے ہلنا بھی
نہیں۔" وہ اسے سختی سے تاکید کرنی باہر نکل گئی۔ ایک
نئی پریشانی کا سامنا تھا اور اسے ثروت کو سہارا بھی دینا
تھا۔

☆☆☆

(7 ستمبر 1992ء)

"سیلاب کا خطرہ ہے۔ بہت بارشیں ہوتی ہیں،
لگتا ہے یہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی ڈیپنس
والی کوئی تقریباً تیار ہی ہے، ہم وہاں بھی شفٹ ہو سکتے
ہیں اور یہ شفتنگ کا کام ہمیں آج کل میں ہی کرنا ہو
گا۔" باہر سے عظمت صاحب بڑے گھبرائے ہوئے
اندر آئے۔

عذرا جوٹی وی پر خبریں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے
چہرے سے بھی پریشانی عیاں تھی۔

"ہاں میں ملازمہ کو کہہ کر تہ خانے سے سارا
زیور اور باقی ضروری کاغذات وغیرہ نکلوا لیتی ہوں۔"
وہ محبت میں انھیں۔

"حد کرتی ہو تم بھی عذرا..... ابھی مشکل سے
چار پانچ مہینے ہوئے، بہت بڑا دھوکا کھایا ہے ہم
نے۔ ہماری ہی ناک کے نیچے وہ ہمارے ہی گھر کی

سلجھانے کے چکر میں درگاہ کے احاطے سے آجا رہے تھے، وہیں آگے کی طرف بڑھتے ہوئے دریا کی طرف جانی سیڑھیوں پر کوئی دکھائی دیا۔ اس کے قدم رک گئے۔ کوئی ناویدہ طاقت اسے یہاں تک لے کر آئی تھی۔

وہ کیوں آئی تھی درگاہ؟ اور پھر درگاہ کے احاطے میں داخل ہو کر مزار پر حاضری دینے کے بجائے یہاں پچھواڑے میں کیوں آئی؟ سیڑھیوں پر بیٹھے وجود کو دیکھ کر دل نے ایک عجیب سا کھل دیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم ان سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں بیٹھی تھی۔ دراز قد، مردانہ ہاتھ جو بالوں سے بھرے تھے چہرے پر شیو کی نیلاٹیش، ہونٹوں پر گہری تیز سرخی اور چادر کی ہل جو کانوں کے پیچھے اڑی گئی تھی۔ ایک لمحے کو اسے دیکھ کر ثروت کی ریڑھ کی ہڈی میں لہری دوڑ گئی۔ وہ عورت تھی..... یا پھر مرد تھا..... اس نے گردن گھما کر دیکھا ایک بار، دوبار، پھر تیسری بار..... ثروت نے ساکت و جامد حالت میں بس سانسوں کا تسلسل جاری محسوس کیا تھا۔

”کیا ہے؟ کوئی کام ہے باجی؟“ اس کی آواز، اس کا انداز، وہ تو بیچو تھا، وہ اس بیچوے کے سامنے کیوں کھڑی تھی؟

”کام..... بن، نہیں۔“ وہ چادر کے پلو سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتی واپس مڑی۔

”بول دے باجی..... کوئی پریشانی ہے کیا؟ ہاہائے..... تو تو پسینے میں شرابور ہو گئی۔“ وہ اٹھ کر ایک ہی جست میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”شبنم نام ہے میرا..... سب مجھے شبو کہتے ہیں۔“ روز ادھر ہی ہوتی ہوں میں، پہلی دفعہ دیکھا ہے تجھے باجی۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ثروت نے نظر اٹھا کر دیکھا، وہ کیوں کھڑی تھی اس کے سامنے؟

”مجھے کام ہے۔“ یہاں اس درگاہ میں لوگ اولاد کے لیے دعا کرنے آتے ہیں ناں۔“ وہ بے حد

کیا کھیل کھیلتی رہی، ہماری آنکھوں میں دھول کھڑک بھاگ گئی اور تم ابھی بھی کہہ رہی ہو کہ تم سے اتنا اہم کام کرواؤ گی۔ کسی پر بھی اعتبار کرنے کی ہمت نہیں رہی اب۔“ عظمت صاحب سے بولے۔

”آج رات ہم تہ خانے سے ضروری سامان لیں گے اور باقی کی مشغلت کل تک کر لیں۔“

”وہ ہمارے گھر کی بیٹی نہیں تھی عظمت..... ہم تو یتیم بچی سمجھ کر ہاتھ رکھا تھا سر پر۔“ عذرا کے ہاتھ پر بل پڑ گئے عظمت صاحب مارے شرمندگی کچھ نہ کہہ سکے۔

سو تیلی بہن کی بچی جو ماں باپ کے مرنے کے ان کے ہاں ہی رہتی تھی، اچانک ہی ایک خط چھوڑ دیں بھاگ گئی۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنی ماں سے جا رہی ہے۔

”آپ نے پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے منع کر دیا۔ بدنامی ہوگی، میری بھانجی کا نام آئے۔“ عذرا یتیم نے غصے سے کہا۔ وہ جھنجھلا گئے۔

”اچھا اب بس بھی کرو..... بھاگ گئی تو بھاگ گئی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ خود پر قابو پاتے وہاں سے گئے۔ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں میں سیلاب کا خطرہ۔ وہ اسی فکر میں فیکٹری کے لیے نکل گئے۔

☆☆☆

بہت بڑی درگاہ تھی۔ یہاں سے وہاں تک لوگ لوگ تھے کہیں فکر تقسیم ہو رہا تھا، کہیں کوئی منت کا ماکا باندھ رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ چادر خود کو چھپائے ایک آنکھ سے راستہ دیکھتی آگے ہی گئے بڑھ رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ آگے پیچھے چلتے ہوئے اسے مشکوک نظروں سے دیکھیں گے مگر وہاں کسی کو بردوان نہیں تھی سب اپنی اپنی فکر میں تھے..... دنیا پر معاش کے مارے ہوئے لوگ، غم اور دکھ کے مارے لوگ، سب اپنی اپنی پریشانیاں، اور گھٹیاں

پست آواز میں بولی یوں جیسے حلق میں آواز انگ سی گئی ہو۔

”ہاں..... تجھے بھی کروانی ہے؟ پر تجھے کس کے لیے کروانی ہے باجی..... مجھے تو تو دوسرے جی سے لگتی ہے۔“ اس نے تو نظر بھر کر ثروت کی سمت دیکھا بھی نہیں تھا پھر کیسے پہچان لیا۔

”بچہ لینا ہے۔ منت ماننے آئی ہے پر کس کے لیے باجی۔ یہاں تو بہت آتے ہیں..... وہ جو رکھ (درخت) ہے ناں درگاہ کے باہر..... اگر جھولی میں پتا آگرے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ مراد پوری ہو جائے گی اور نہ گرے تو اللہ کی رضا سمجھ کر چلے جاتے ہیں۔ پر باجی..... سارے رب کے فیصلے ہیں۔ شبونے وہ بھی دیکھے جن کی جھولی میں پتا نہیں گرا پر رب سونہڑے نے اولاد دے دی اور وہ بھی دیکھے جن کی جھولی میں پتا گرا پر خالی جھولی ہی رہی ان کی۔ تینا ناں باجی کس کے لیے بچہ لینا ہے۔“

”بچہ لینا نہیں..... دینا ہے۔“ اس نے دریا کی سمت دیکھا۔ گہرا نیلا پانی سکون سے بہتا جا رہا تھا۔ مغرب کی طرف غروب ہوتے سورج کی نارنجی شعاعیں نیلے پانیوں میں روشنیاں اجاگر کر رہی تھیں۔

”ہاہائے..... باجی..... کوئی اپنا بچہ دیتا ہے کسی کو۔“ وہ سینے پر دو ہتھ مار کر بولی۔

”مذاق نہیں ہے یہ..... تو بس نہیں۔ کچھ نہیں..... میں تجھے کیوں بتا رہی ہوں؟“ وہ واپس مڑ گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ درگاہ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

”باجی..... باجی ہائے اللہ..... برا مان گئی باجی! اچھا سن، آئی ہے ادھر ایک باجی سات سال سے آ رہی ہے بہت اونچے گھر کی ہے تو کہے تو بات کر دیں؟ تو نے.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ ثروت کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

”تو نے بچہ دینا ہے باجی یا پتہ پتا ہے؟“ شبو کے منہ سے نکلے لفظوں نے دل میں خچر سا گھونپا تھا۔

”جسنی جلدی ہو سکے تو بات کر مجبوری ہے۔ تو بات کر لینا پھر آگے گئے۔“ وہ اس کی بات کا جواب گول مول بڑھی تھی۔

”وہ تو کل آئے گی تو میں بات کر کب آئے گی باجی۔“

”جمہرات کو۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاؤ احاطے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا زیور کا ڈبا کھولا تو سارا زیور غائب تھا۔

”یا خدا۔“ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں

”کیا ہوا عذرا بیگم۔“ عظمت کاغذات سنبھال رہے تھے فوراً اس کی طرف

”سارا زیور غائب ہے۔ ڈبا بالکل“ وہ جیسے بے ہوش ہونے لگی تھیں۔

”کیا کہہ رہی ہو.....؟ کہاں جاسکتا رات ثروت بھاگی تھی اس رات تو تم زیور دیکھا تھا، اسی ڈبے میں۔“ انہوں نے

”ہاں ثروت کے بھاگنے کے بعد میں دیکھا تھا کہ کہیں وہ کچھ لے کر تو نہیں گئی مگر جگہ پر موجود تھی..... زیور..... یا خدا.....! لاکھ کے زیور تھے..... دس لاکھ۔“ عذرا۔

تھا۔

کوئی اور ملازم..... وہ، وہ دوسری دلشاد..... دلشاد کب گئی؟

”دلشاد تو ثروت کے جانے کے بعد مہینہ کام کرتی رہی۔ وہ تو میں نے خود فارغ نوکری سے جب..... جب پرانی ملازمہ وا تب۔“

”اس کا مطلب ہے کہ دلشاد نے ہی ہے۔ ہمیں دلشاد کے خلاف رپورٹ لکھواؤ عظمت صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”صرف دلشاد نہیں عظمت..... ثروت

امی کی بات پر پہلی مرتبہ وہ غصہ کرنے کے بجائے وہ خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔

”بابا کہاں ہیں امی.....؟“

”فیکٹری گئے ہیں بیٹا! سیلاب کے شور شرابے

میں بہت پریشان رہے ہیں اور پر سے یہ نقصان.....

ان کا تو خون ہے ثروت اور جب اپنے ہی دکھ دیں

..... پیٹھ میں بھر پوسٹ کریں تو دکھ تو ہوتا ہے..... خیر

..... میں تو ابھی بھی شکر ادا کرتی ہوں، وہ میرا سارا

زیور لے گئی مگر خدا کا شکر کہ میرا بیٹا میرے پاس ہے

مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ اپنے ہاتھوں سے زعیم

کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے بولیں، وہ ٹکرا ہوا تھا۔

”میں نے آپ پر غصہ کیا۔ ثروت کے جانے

کے بعد اس کا غصہ آپ پر نکال رہا، آپ سے بدتمیزی

کی۔“ وہ سر جھکائے شرمندہ سا تھا۔

”تم میری اولاد ہو..... میرے اکلوتے بیٹے

تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ تمہاری خاطر تو میں

ثروت کو بہو بنانے کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی مگر اس

نے کیا کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی رائے لیتی،

مستثنیٰ پانچ کے سلسلے میں کوئی بات کرنی، وہ بھاگ

گئی۔“ وہ اپنے ہاتھوں سے نوالے بتا رہا تھا اسے

کھلاتی رہیں۔

”کون ہو سکتا ہے وہ؟ جس کے ساتھ وہ بھاگ

گئی؟ اس کے ساتھ کیسے رابطے میں ہو گی وہ؟“ زعیم

کی سوئی وہیں انگی تھی۔

”پولیس خود ہی اگلو الے گی سب کچھ۔ اتنے

مہینوں سے اس کے بھاگ جانے کے بعد ہم لوگ

صرف اس خط کی وجہ سے خاموش تھے جو وہ اپنے

ہاتھوں سے لکھ کر رکھ گئی تھی مگر اب..... کوئی سودو سوکا

نقصان نہیں ہے، لاکھوں کا نقصان ہے۔“ وہ لہجے

کے غصے پر حیران ہوا۔

”پولیس!“ ان کے ہاتھ سے نوالہ پیچھے کیا۔

”ہاں کل جب ساری بات تمہارے ابو کے علم

میں آئی اور خود مجھے سارے زیور کے غائب ہونے کا

علم ہوا تو ہم نے رپورٹ لکھوادی۔“ وہ آنکھوں سے

نکال دیں دل سے بدنامی کا خوف۔ مجھے لگتا ہے

دونوں ملی ہوئی تھیں۔ ہونہ ہو یہ ان دونوں کا ہی

م ہے۔“ وہ رونے لگیں۔

”یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟

مست صاحب کا بھی ماتھا ٹھنکا۔

”وثوق سے نہیں..... شک ہے مجھے اور

رٹ شک کی بنیاد پر ہی لکھوائی جاتی ہے۔ ثروت

اگر چوری نہیں جی کی تب بھی اس تہ خانے کے

ے میں ثروت نے ہی دلشاد کو بتایا ہو گا کیونکہ اس

ہ بارے میں کسی کو علم نہیں تہ خانے کے دروازے

ہ اور یہ جہازی ساز کا بیڈ دھرا ہے اور اس کمرے

اصفائی سقرائی میں خود یا ثروت ہی کرتی تھی۔ مجھے

ب ہے۔“ اور ان کی بات پر عظمت نے اثبات میں

بلا یا تھا۔

☆☆☆

سیلاب کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اس ہنگامی

ثروت حال میں انہیں بہت بڑے نقصان کا علم ہوا

..... اور عظمت صاحب نے شک کی بنیاد پر دلشاد

ثروت کے خلاف رپورٹ بھی درج کروادی تھی۔

ہم نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ زعیم، عذرا اور

مست کا اکلوتا بیٹا تھا، وہ شروع سے ہی ثروت میں

پس رکھتا تھا، اپنی بیوہ پھوپھو اور ان کی بیٹی کو اس نے

وع سے ہی اپنے گھر میں دیکھا تھا پھر ثروت

ٹھوئیں جماعت میں تھی جب پھوپھو کا انتقال ہو

یا۔

”زعیم کھانا کھا لویٹا۔“ عذرا اس کے قریب ہی

رسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

”جی امی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھانا

مانے لگا۔ نی الحال تو امی کی ہر بات سچی لگ رہی

ی۔

”دیکھو بیٹا جو ہوا بہت برا ہوا۔ بہت بھاری

سمان ہوا۔ وہ سارا زور تمہاری دادی کا اور میرا تھا۔

م نے اپنی بہو کے لیے رکھا تھا۔ ثروت اگر یہ گل نہ

ملاتی تو شاید یہ زیور اسی کا نصیب تھا مگر اس طرح۔“

☆☆☆

یہ..... یہ خط آیا ہے مالی بابا کی بیوہ تیرے ماموں ممانی نے ہم دونوں کے خلا دیا ہے۔ پولیس ہمیں ڈھونڈ رہی ہے ثروت ہاتھ میں لفافہ لیے باہر آئی۔
”خط.....! اسے کیسے پتا چلا یہاں گھر کے پتے پر خط کیسے آیا۔“ وہ چار گنی۔

”وہ سہیلی تھی ہماری، میں نے مدد خط لکھا تھا تو.....!“ دلشاد نے سر جھکا لیا۔
”یہ تو ہونا ہی تھا، اسی کے ڈر سے آہستگی سے بولی۔

”اب..... اب کیا ہو گا ثروت غارت کرے اس گل ریز کو۔“ دلشاد کے پھولنے لگے۔

”میں رقم کا بندوبست تو کر رہی ان کا زیور تو نہیں لوٹا سکتی مگر میں قیمت چاہتا جرم قبول کر کے۔ جب ان کے زیور کو تو تیری ہو جاؤں گی ہر الزام سے بھر ہم مزدوری کر کے باقی کی زندگی گزار لیں میں یونہی لکھا ہے، زعیم کا دل دکھانے کو مجھے دلشاد۔“ وہ سسکنے لگی۔

”ہم دونوں؟“ دلشاد اس رکی۔ ”ہم تو تین ہوں گے ناں ثروت آئیں گے کہاں سے ثروت کہیں تو..... کسی سے اپنے بچے کا سودا تو نہیں کر لیا؟ درد سے پھٹنے لگا۔

”ہاں بات کی ہے ایک دو جگہ ایک ہے، اس کے پاس علاج کے لیے ایک ایہ عورت آتی ہے، وہیں بات کی ہے میں راستہ نہیں ہے دلشاد۔“ وہ وہیں بیٹھی رہو کیے۔ آنکھوں کے پیالے خشک تھے۔

”تو پاگل تو نہیں ہو گئی ثروت!“ د سامنے آ بیٹھی۔

کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

”تو اب تم جیل میں چکی پیسوگی ثروت..... میں تو تمہاری ہاتھوں پر اپنے نام کی مہندی لگوانا چاہتا تھا..... تمہیں باعزت طریقے سے اسی گھر کی چھت کے نیچے ایک خوش گوار زندگی دینا چاہتا تھا..... تم نے اچھا نہیں کیا ثروت۔“ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

”دس لاکھ..... دس لاکھ روپے..... تو پاگل تو نہیں ہو گئی باجی۔“ شبو کی کاجل بھری آنکھیں پھیل گئیں، ایک ہاتھ سینے پر دو ہتھ کی طرح مارتے ہوئے وہ ثروت کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا، بہت مجبوری ہے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”اور جب تک مجھے مجبوری پتا نہیں چلے گی، میں یہ سودا نہیں کروا سکتی۔“ شبو نے ٹہنی میں سر ہلایا۔
اس کا دل کٹ سا گیا۔

”سودا نہیں کر رہی میں؟ بیچ بھی نہیں رہی اپنا بچہ..... بکاؤ نہیں ہے میری اولاد..... بس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ تو نہیں کر سکتی میرا کام..... اچھا نہ کر۔“ وہ کسلسل سے بہتے آنسوؤں کو چادر کے کونے سے رگڑتی واپس پلٹ گئی۔ شبو پیچھے ہی بھاگی تھی۔

”مجھے پتا تو چلے باجی۔ پھر میں کسی اچھی جگہ بات کروں۔ یہ پاس ہی ایک لیڈی ڈاکٹر ہے وہی ہمیں بتاتی ہے خوش خبری والے گھر کا پتا، اسے تو پتا ہو گا کسی امیر گھرانے کی بے اولاد عورت کا۔ تو پتا تو سہی۔ اتنا بھروسہ کر رہی ہے تو ذرا سا اعتماد بھی کر۔“

شبو نے اس کا ہاتھ تھاما، اسے ایک جھر جھری سی آئی۔ وہ ہنسا اس کا ہاتھ تھامے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

”تو رہنے دے۔ نہیں دینا مجھے اپنا بچہ کسی کو۔“ وہ بھاگتی ہوئی درگاہ کے احاطے سے نکل گئی تھی۔

”آؤ بیٹھو.....“

”یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی، آپ نے ہمیشہ ثروت کو بہو بنانے کے لیے مجھے مزید سونے کا کہا۔ آپ نے ہمیشہ مجھے سمجھایا کہ وہ بہت گہری لڑکی ہے اور میں نے ہمیشہ آپ کی فنی کی۔ اس نے دھوکا دیا۔ آپ کا زیور لے کر بھاگ گئی، نمک حرامی کی ہے اس نے، میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اگر اسے زیور ہی چاہیے تھا تو وہ تو اسے ویسے بھی مل ہی جاتا تھا مجھ سے شادی کر کے بلکہ صرف زیور ہی کیا، یہ گھر..... یہ گاڑی، مگر نہیں آپ بالکل سچ کہتی تھیں وہ بہت گہری لڑکی تھی۔ اسے عزت راس ہی نہیں آئی اور پتا نہیں امی..... وہ کون ہوگا جس کے ساتھ وہ بھاگی ہوگی، میں سوچتا ہوں تو داغ پھٹنے لگتا ہے۔ آپ بس جلدی کریں، اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔“ وہ بات مکمل کر کے اٹھ گیا۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

☆☆☆

گھرے سیاہ گھنگھور بادل گرج گرج کر اپنا آب دکھا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر گہرا اندھیرا چھا گیا۔ یوں جیسے رات ہو گئی ہو۔ گہری سیاہ گھٹاؤں کے نیچے دریا کا پانی بھی سرمئی رنگ کا ہو رہا تھا۔ دریا کی طرف اتنی میڑھیوں پر بیٹھی وہ آنسو بہا رہی تھی۔ گھر جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر سے فی الحال کوئی بات نہیں کی تھی، خود کو اور دلشاد کو سلی دی تھی۔ امید تھی کہ خدا کوئی سبیل نکالے گا، رقم کے بندوبست کا بس یہی ایک راستہ تھا۔ بجلی بڑے زور سے چمکی تھی۔ آسمان سے پانی برسے کو تیار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے بل پر دریا کا پانی محو رقص تھا۔

”ہائے باجی..... تو ادھر بیٹھی ہے میں تجھے ساری درگاہ میں ڈھونڈ رہی تھی۔ ہو گیا بندوبست پورے دس لاکھ کا۔“ وہ اس کے برابر آ بیٹھی۔

”ہیں.....؟“ اس نے بے یقینی سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو کے لال سرخی لگے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

”ہاں..... عیش کرے گا تیرا بچہ..... وہ باجی

”بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے میں نے، اگر نہ کیا تو جانتی ہے کہ کیا ہوگا؟“ وہ لفظ بھر کور کی۔

”پولیس تجھے زیور چوری کے الزام میں گرفتار کرے گی، کیوں کہ زیور کی ادائیگی میں سر کر بھی نہیں رہ سکتی۔ پھر یہ بچہ جیل میں پیدا ہوگا جہاں اس کی ماں کی بیٹی اسے گود میں لیے دودھ پلائے گی، جب یہ ہوگا تو سوچے گا کہ آخر اس کی ماں نے ایسا کون سا کم کیا تھا، پھر اسے حقیقت کا علم ہوگا تو اسے مجھ سے رات ہو جائے گی اور جب سزا پوری ہوگی تو یہ ناشرہ مجھے قبول کرے گا نہ یہ بچہ۔ لیکن یہ جو میں رہنے جا رہی ہوں ناں، یہ اس کے لیے بہت محفوظ مستقبل لے کر آئے گا۔ اس کو ایک بہتر پڑھا لکھا شال حال گھر اندل جائے گا اور میں اس کے بدلے نئے والی رقم سے نہ صرف پولیس جیل کے چکر سے آزاد ہو جاؤں گی۔ ہاں..... ماں ہوں۔ ایسا کرتے نئے جان جا رہی ہے پر جو جان آرہی ہے اس کو رات والی زندگی دینے کے لیے یہ روز مرنے کی میت منظور ہے مجھے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ ٹھنڈی آہ بھر کر آسمان کی سمت دیکھنے لگی۔

”مگر رقم بہت بڑی ہے ثروت..... کون دے گا؟“

”اولاد کی کمی بھی بہت بڑی ہے دلشاد..... عورت اپنا ادھورا پن مکمل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی رقم ادا کر سکتی ہے۔ اپنا زیور بیچ کر بھی اولاد کا پور لینا گھانے کا سودا نہیں۔“ وہ بے حد مطمئن تھی۔

مغرب کی طرف سورج غروب ہو رہا تھا۔ دلشاد بچے سورج کو دیکھنے لگی۔ دل جیسے اسی سورج کی رچ ڈوب رہا تھا۔ دونوں ساکن نظروں اور گہری موٹی سے سورج کو دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں امی۔“
”ہم ان کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی اکر رہی تھیں۔ مسکرا کر اسے دیکھا اور ہاتھ کے مارے سے پاس بلالیا۔

بڑی بے عقلی عمر ہوتی ہے، منہ کے بل گراتی سارا زپور، تھپا کر بھاگ گیا..... اور اس سارا میں، میں اکیلی نہیں تھی۔ میری سہیلی دلشادہ تھی۔ اب ہم دونوں عورتوں کی زندگی اور عہد بچے کے سودے سے جڑی ہے۔“ اس کے شبو کا ہاتھ لٹکے بھر کر لڑا تھا۔

”شبو تجھے منہ کے بل گرنے نہیں باجی۔“ وہ سسکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ”ودھائی ہو ودھائی..... پورا ہزار کانو کی کا کے کا۔“ وہ زور زور سے تالی بجاتی درگا، کسی عورت کی طرف بڑھی تھی۔ عورت نے بچہ اٹھا رکھا تھا۔ ساتھ کھڑے اس کے شوہر بچے پر چھتری تان رکھی تھی۔ ثروت نے ا بڑی حسرت سے دیکھا۔

”ہاں ہاں ہزار ہی دوں گی تو گھر آتا سونے کی بالیاں بھی دوں گی۔“ وہ عورت بولتی آگے بڑھ گئی۔ شبو نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ”لوگوں کی گود بھرنے کی دعا کرنی ہو تیری گود سونی کرنے کی دعا کیسے کروں۔“ بار آنکھوں کو اس سے چھپائی درگاہ کے احاطہ باہر نکلی۔ چھاجوں چھانج بدستی بارش میں اپنے ٹھکانے کی طرف تھا..... اسے گرو سے

☆☆☆

(3 مارچ 2018ء)

بہار کا موسم تھا۔ ہر طرف رنگ برنگ کھلے تھے۔ لندن کی بے بس فضاؤں کو خیر اپنے وطن کی ہوا میں سانس لیتے ہی ایک طم دل میں اتر گئی تھی۔ اس نے موبائل پر ماں کی اطلاع دی تھی مگر جانتا تھا کہ ماں نہیں آ ماں کو اس سے بھی زیادہ اپنے اللہ سے بہت باپردہ اور عبادت گزار تھی۔ اور اسے یقین اس وقت بھی وہ جائے نماز پر بیٹھی اس کے خیر سے وطن پہنچنے کے لیے دعا گو ہوگی۔

پورے دس لاکھ دینے کو تیار ہے پر اس کی ایک شرط ہے۔“ شبو نے ہاتھ کا چھبنا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ برندوں کا ایک غول جارہا تھا۔ ”بھئی شرط؟“ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ ”تیرا کوئی حق نہیں رہے گا پھر۔“ شبو نے سر جھکا لیا۔

”ہاں جانتی ہوں۔“ اتنی بڑی رقم ہے، کوئی اتنی بڑے رقم دے کر حق تو اپنے نام کرے گا ناں..... کب دے گی پیسے؟“ وہ آنسو صاف کرنے لگی۔ ”جب بچہ اسے ملے گا۔ تب ہی دے گی ناں۔ اگر رقم پہلے دے دے اور بچہ نہ رہے تو! وہ ہنوز سر جھکائے بول رہی تھی۔

”اللہ نہ کرے..... اور..... تب تک تو پولیس آ پہنچے گی؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی تھی۔ ”پولیس؟“ شبو نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ”ہاں میرے پیچھے پولیس پڑی ہے۔ میں نے چوری کی ہے تقریباً نو دس لاکھ کا زپور اپنے ماما می کے گھر سے چوری کر کے بھاگی تھی۔“ اس نے اعتراف کیا۔ شبو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”تو..... تو اس مقدمے سے بچنے کے لیے اپنا بچہ بیچ رہی ہے۔ تو اپنی اولاد کو، کسی ان دیکھی انجان عورت کے حوالے کر رہی ہے، زیور کی رقم بھرنے کے لیے۔ باجی اتنی ظالم ہے تو؟“ شبو نے دہائی دی۔

بارش شروع ہو گئی۔ آسمان بھی اس کے دکھ پر کھل کر رونا چاہتا تھا۔ وہ مزار میں جا کھڑی ہوئی۔ شبو بھی اس کے پیچھے آ گئی۔

”میں اب تجھ سے کچھ نہیں پوچھوں گی باجی۔“ کوشش کروں گی کہ تجھے رقم پہلے ہی مل جائے۔ یہ بچہ جیل کے ہسپتال میں پیدا نہ ہو۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”چوری کی۔“ زعیم کا اپنے ماموں کے بیٹے کا دل توڑا، ایک انجان شخص کی باتوں میں آ کر۔ اس کے ساتھ بھاگنے اور شادی کر کے گھر سامنے کا خواب دیکھا۔ زعیم بد صورت اور وہ خوب صورت لگنے لگا۔

ہے ادھر وہ ایک دن رات ہسپتال میں ساس
آنے تک رہے گی، تب تک بچہ تیری کوکھ سے اتر
گود تک منتقل ہو چکا ہوگا..... تجھے تیرے پیسے
مطلب ہے..... لے پکڑ..... بڑی مشکل سے
ہے وہ۔“ شبیو نے رازداری کے انداز میں کہا۔

”مگر شبیو ایک بار میں اس عورت سے مل تو ا
کون ہے، کیسی ہے؟ میرا بچہ جس کی گود میں جائے
جسے ماں بلائے گا، جس کے آنگن میں چلنا سیکھے
میں اسے کچھ تو جان لوں۔“ اس کی بات پر شبیو
آنکھوں میں انکار بھرے تھے۔

”دس لاکھ ہے باجی..... دس روپے نہیں ہر
کھاتے پیٹے گھرانے کی ہے اور اچھا پیار محبت
گھرانہ ہے تب ہی تو اس کا شوہر اس سارے کچھ

میں اس کا ساتھ دے رہا ہے ورنہ چھوڑ دیتا اور کر
اولاد کے لیے دوسری اور باجی، وہ عورت جو بھی
چور نہیں ہے اور باعزت طریقے سے بیاہ کر آئی۔
شوہر کے ساتھ..... کسی ایرے غیرے کے سا
بھاگی نہیں ہے۔“ شبو کا یہ سخت لہجہ ثروت کو بہت
باد کر دوا گیا۔ یعنی وہ عورت جو اس کا بچہ لینے کو
ہوئی تھی، اتنے معزز اور عبادت گزار گھرانے کی تھی
اس جیسی گھٹیا عورت سے ملنا بھی اسے پسند نہیں تھا۔
”تو صاف کہہ دیتی شبو کہ وہ مجھ سے ملنا نہ
چاہتی۔“ ثروت نے تھیلی پکڑ لی۔

”مکن لینا پورے دس لاکھ ہیں۔“
”اور تیرا حصہ شبو.....!“ وہ جیسے ہوش میں آ
تھی۔

”میں تو اس سے لوں گی جس کی گود تو بھرنے
رہی ہے باجی۔“ شبو عجیب انداز میں مسکراتی تھی۔
”اور لکھت پڑھت کا کام..... مطلب ہ
بچہ پر کوئی حق نہیں ہوگا وہ!“ وہ لرز رہی تھی۔

”زبان بڑی چیز ہوتی ہے باجی..... نئی صد
آنے والی ہے ابھی آئی نہیں۔ ابھی خون بھی سف
نہیں ہوئے اور زبان کا پاس بھی ہے..... خیر.....
جب بچہ پیدا ہوگا تو مجھے بس ایک کاغذ پر دستخط کر۔

ارمان علی، اپنی پڑھائی مکمل کر کے واپس لوٹا
تھا، عجیب سی سرشاری تھی، دراز قد، گہری بھوری
آنکھیں، کھلتی ہوئی رنگت صحت مند کسرتی جسم۔ وہ
اندرا باہر سے ایک مکمل انسان تھا، مطمئن زندگی سے
بھرپور سادہ یہ سب اللہ کے بعد ماں کی وجہ سے
تھا۔ ماں، جو اس کی کل کائنات تھی۔ اسی سرشاری اور
خوشی میں اس نے ہاتھ کے اشارے سے کب روکی۔

☆☆☆

(12 نومبر 1992ء)

فضاء میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔ وہ بڑی سی چادر
اوڑھے درگاہ کے عقبی صحن میں آئی جہاں میٹرھیاں
دریا کی طرف اترتی تھیں۔ شبو وہیں بیٹھی تھی۔
”آگئی تو باجی.....“

”ہاں..... رات پولیس نے چھاپہ مارا محلے
میں..... کسی نے برکت حلوائی اور ہمارے بارے میں
بتا دیا۔ وہ تو بھلا ہو برکت کی بیوی کا جسے میری حالت
پر ترس آ گیا اور وہ مجھے اور لاشا کو لے کر نکل گئی مگر ہم
ہر بار نہیں بچ سکتے شبو..... رات تو برکت چا چا بھی بچ
گیا مگر پولیس پھر آنے کا کہہ کر گئی ہے اور اب تو
برکت چا چا نے بھی ہمیں یہاں سے چلے جانے کا کہا
ہے۔“ وہ اس خنک موسم میں بھی پسینے سے تر ہوتی تھی۔

”ہاں..... فکر کے دن گئے باجی..... یہ لے
تیرے پورے دس لاکھ۔“ شبو نے ایک تھیلی اس کے
ہاتھ میں تھمائی۔ اس کے کمر درنے ہاتھ لٹکے بھر کو
ثروت کے ہاتھوں سے مس ہوئے، وہی گھن محسوس
ہوئی تھی جو پہلے دن محسوس ہوئی تھی مگر وہ اس تھیلی کو
دیکھنے لگی جو ان ہاتھوں میں دبی تھی۔

”یہ..... مکروہ عورت۔“

”بات یہ ہے باجی کہ وہ عورت اپنی ساس سر
سے دور یہاں اس شہر میں رہ رہی ہے..... بانجھ ہے
مگر ساس سر کے سامنے دونوں میاں بیوی یہی ظاہر
کریں گے کہ بچہ ان کے ہاں پیدا ہوا ہے تو سمجھ رہی
ہے ناں باجی..... اس نے ڈاکٹری سے بات بھی کر لی

ہوں گے، باقی تیرا مسئلہ تو حل ہو گیا۔“ شبو مسکرانے لگی۔

”میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں شبو! تو تو فرشتہ ہے۔“ وہ سسکتے لگی۔

”نہ باجی..... رونہ..... شبو تو پوری انسان بھی نہیں ہے..... مجھے فرشتہ نہ بنا..... بس شاید تیرا راستہ مجھ تک تھا یا پھر میں تیرے راستے میں کھڑی تھی رب نے سبیل بنا دی..... ہاہائے باجی..... اب بس کر دے خدا نے تیرے سر سے بوجھ اتارا ہے..... بس چپ کر جا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے بولی۔ ثروت سر جھکائے سسکتی رہی۔

☆☆☆

(3 مارچ 1992ء)

سرکاری ہسپتال کے اطراف میں پھول بی پھول کھلے تھے۔ ایک پھول اس کی زندگی میں بھی کھلا تھا۔ گول منول سا پیارا سا بچہ..... اس نے بس ایک جھلک دیکھی تھی اس کی ڈاکٹر اور شبو لے گئے اسے، لرزتے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر ثروت نے اپنا نام کھینچا تھا۔

”فی امان اللہ۔“ ایک الوداعی نظر اس دروازے کی سمت دیکھا جس سے ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس کے جگر گوشے کو لے گئی تھی۔ دلشاد اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

☆☆☆

”زعیم بیٹا مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔“ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب امی کی آواز آئی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ رہی تھیں۔

”جی امی کیسے؟“ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولیں کپکپاتے ہاتھوں سے انہوں نے ایک لفافہ اور رسید زعیم کی سمت بڑھادی۔ اس نے تعجب سے پہلے ان کے خالی چہرے کو دیکھا اور پھر وہ لفافہ تمام لیا۔ ڈاک کی خاص سروں کے ذریعے لفافہ اور وہ رسید.....؟

”آپ ہی بتا دیں یہ کیا ہے۔“ وہ ابھی بھی

حیران تھا سمجھنے والے کے نام پر جیسے نظریں ٹھہر “اوہ۔“ بے تابی سے لفافہ کھولا جس میں رقم کے کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔

”زیور تو نہیں بھیج سکتی مگر نقصان بھر رہی! زیور کی رقم بھیج رہی ہوں۔“

”تو ثروت نے اپنے ماتھے سے چوری دھو دیا۔“ وہ ہنس لگے آنکھوں پر ہر ضبط سے بندھا تھا۔

”ہاں..... کل صبح میں اور تمہارے ابو ثروت کے خلاف رپورٹ واپس لے لیں گے تو شکر ہے کہ خاموشی سے معاملہ حل ہو گیا ورنہ آ کا نقصان نہ بھر پانی..... پولیس کے ہاتھ تو آ جاتی ایک نہ ایک دن..... تو زندگی کے کتنے عہ جیل میں گزاری تھی..... حق باہ..... کیا کر دیا؟“ نے..... مجھے تو لگتا ہے کہ جس کے ساتھ بھاگ بھی چھوڑ گیا ورنہ آج صبح وہ خود آتے.....

عذر اچائے بنانے کی نیت سے اٹھ گئیں۔ “اگر اس نے رقم واپس ہی کرنی تھی۔ سارا نقصان بھرنا ہی تھا تو وہ زیور لے کر بھا کیوں.....؟؟ کیا تھا اس کے دماغ میں..... اتنی بڑی رقم اگر وہی زیور بیچ کر بھری ہے تو زندگی کاٹنے کی وہ؟؟ کیا کرے گی؟ کون ہے؟ ساتھ؟“ زعیم کا دماغ پھر الجھنے لگا۔

”شکر خدا کہ میرے زیور کا نقصان بھر نے اصلی سونا تھا..... خالص سونا..... حق باہ..... نئے ڈیزائن کا بنواؤں گی سارا..... بس اب سے لڑکی ڈھونڈ کر تیرے فرض سے بھی قاجاؤں۔“ عذر راہیں جن سے بول رہی تھیں ز ماں کی کسی بات سے انکار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا

☆☆☆

(3 مارچ 2018ء)

خوب صورت سادہ اور پرسکون مکان۔ قدم رکھتے ہی پپی برتھ ڈے ٹویو کا گیت بجنے

ارمان نے بیک وہیں پھینکا اور ماں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”آپ اسی لیے نہیں آئی ناں مجھے لینے.....“
”میں کہاں جانی ہوں اور بھلا..... ہاں مجھے
سالگرہ بھی یاد تھی اور اپنے بیٹے کو سر پرانز بھی دینا
تھا۔“ ماں نے ماتھا چوما۔

”اور مجھے پتا تھا کہ آج یہاں میرے لیے
بہت بڑا سر پرانز ہوگا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ سامنے رکھا
کیک، گفٹ اور پھول ماں کی محبت کا منہ بولتا ثبوت
تھے۔

”چلو آ جاؤ..... اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔
ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ.....“

”میں شاور لے کر ابھی آیا۔“ وہ محبت بھری نظر
سے ماں کو دیکھتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

گھر گھر رکتی سلائی مشین سے نظر اٹھا کر
دیکھا۔ نظر کی عینک اتار کر سائڈ پر رکھی اور دلشاد کے
ہاتھ سے چائے کی پیالی تھام لی۔

”میں شام کو بازار جاؤں گی ثروت.....
باورچی خانے کا سارا سامان ختم ہے وہی لینے، تین
مہینے کا کرایہ بھی جمع کروا دیا ہے میں نے۔ گیس بجلی کا
بل بھی جمع ہو گیا تو ساتھ چلائل منج اپنی نظر چیک کروا
لیتا۔“ دلشاد نے کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکی لی۔

”ہاں کل منج جاؤں گی۔ نظر بہت کمزور ہو گئی۔
اب تو سوئی میں دھاگا بھی نہیں ڈالا جاتا۔ بوتیک والی
آپا جان کہہ رہی تھیں کہ تمہارے کام کی مانگ بڑھتی
جاری ہے اور میں ہنسے گی کہ کیا بتاؤں نظر اور ہمت
ٹھنکتی جا رہی ہے۔“ اس نے بھی چائے کی پیالی
اٹھالی۔

”ہاں بھئی، نظر کی کمزوری میں تمہارا اپنا ہاتھ
ہے، ساری رات رو کر گزارنی ہو تم..... پچھیں
سال ہونے کو آئے مگر تمہارے آنسو خشک نہ
ہوئے۔“ دلشاد نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ دکھ آج بھی اسی طرح تازہ ہے

دلشاد..... وہ ایک جھلک آج بھی نظروں میں
ہے، تو نہیں سمجھے گی۔“ وہ عجیب انداز میں
تھکی۔

”آج سالگرہ ہے اس کی۔ رات کو آ
ہوئے کیک لے آؤں گی، چل اب خوش
شاہاش۔“ دلشاد کے کہنے پر وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں یہ لے، کیک اچھا سا لے کر آنا۔“
نے چادر کے پلو سے پانچ سوکانوٹ اس کی ط
بڑھایا۔

”رکھ پاس، میرا بھی کچھ لگتا ہے۔ ماسی
میں اس کی۔ اس کے باپ کی باتوں میں آ کر
دونوں بھاگی تھیں۔ دھوکا، ہم دونوں کے ساتھ ہوا
ہاں تیرا نقصان مجھ سے کئی زیادہ ہے۔ تیرا دل او
دونوں خالی ہو گئے اور میرے صرف خواب۔“ د
چائے پینے لگی ثروت کرسی کی پشت سے سر ٹکائے
بہت پیچھے کا سفر کرنے لگی۔

☆☆☆

”ثروت..... ثروت کہاں مر گئی کم بخت
عذرا ممانی کی آواز پر وہ سوئی دھاگا اور فریم رکھ کر
بھاگی تھی۔

”جی ممانی؟“ کسی ہاتھ باندھے غلام کی ط
وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”شام ہونے کو آئی ہے۔ آٹا گوندھتا ہے،
ہوش ہے تمہیں اور میٹھے میں سویاں بنا لینا۔ زعی
بہت پسند ہیں، کالج سے تھکا ہارا آئے گا۔“ وہ
سے بول رہی تھیں۔

زعیم ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کالج سے واپسی
اکیڑی جاتا تھا اور اس کی واپسی تک چار بج جاتا
تھے، ایسے میں اسے آتے ہی کھانے کی ضرورت نہ
تھی۔ زعیم ایک اچھا سلکھا ہوا بڑا کولڑکا تھا لیکن ا
کارنگ سیاہ کالا تھا۔ اس پر نظر کی عینک بھی لگی تھی
ثروت کو بھی وہ کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ زعیم کے
خاص دوست بھی نہ تھے۔ ماموں کا خیال تھا
پڑھائی مکمل کر کے وہ ان کے ساتھ فیکٹری سنبھا۔

بن کر دینا اور سسر بھی۔ ”زیم اپنی طرف سے دانداز میں بولا تھا۔ اس نے چڑ کر منہ پھیر لیا۔ اگر سیاہ چہرے پر روشن سفید آنکھیں اور اس کے دانت بہت عجیب سے لگتے تھے۔

”ہوں..... ٹھیک ہے کر لوشوق پورا۔“ عذمان گئیں۔

☆☆☆

دلشاد سلائی اسکول میں آتی تھی۔ ماں بار چکے تھے۔ خالہ کے ساتھ رہتی تھی۔ خالہ اس کی اپنے منشیات کے عادی بیٹے سے کرنا چاہتی ثروت کو اس کی کہانی اپنے جیسی لگی۔ دونوں کی دوستی ہو گئی۔ اسی اسکول کے باہر گل ریز ویلن لڑکیوں کو چھوڑنے آتا تھا۔ اس کی نظریں گل، تعاقب کرنے لگیں۔ اپنے نین نقوش سے وہ لگتا تھا۔ وہ بھی ثروت کی نظروں کو اچھی طرح تھا۔ سلام دعا سے بات شروع ہوئی اور سو دھاگے تلکیاں منگوانے سے ہوتے ہوتے اس پہنچ گئی کہ ثروت کے لیے اب ساری کائنات ریز تھا۔ گل ریز اس کے سارے حالات سے واقف تھا۔ وہ اس کو سبز باغ دکھانے لگا۔ لینے والے میر بھی بتایا کہ اس کا حلق صوبہ سرحد کے کسی گاؤں ہے اور وہ کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہے۔ ثروت خیالوں ہی خیالوں میں زیم اور گل ریز کا مقابلہ..... اور پھر اسے اپنی اور گل ریز کی جوڑی دنیا کی سے خوب صورت اور مکمل جوڑی لگتی۔

”یعنی تیرے ماموں، مامی تیرے حق پر بن کر بیٹھے ہیں..... وہ زور جو تیری ممانی نے بڑے صندوق میں بند کر رکھا ہے صرف اس کا تو تیرا بھی ہے، تیری نانی کے زور پر تیرا بھی تو حق سیدھے طریقے سے نہیں دیتے تو اپنا حق لے۔“ گل ریز نے ویلن کی ڈرائیونگ سنبھالتے ہوئے مشورہ دیا۔ ثروت کے ساتھ دلشاد نے بھی دیکھا، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

”مطلب؟“

کا۔ زیم اسے خاص نظر سے دیکھتا تھا۔ خود ماموں کا خیال تھا کہ زیم بھی عام شکل و صورت کا مالک ہے۔ اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا مشکل ہوگا۔ ثروت گھر کی لڑکی ہے۔ یتیم بھانجی ہے..... اسے زیم سے بیاہ کر ہمیشہ کے لیے رکھ لیں گے۔

ممانی کو ثروت بھی زیم کے لیے پسند نہیں تھی ان کے نزدیک وہ بہت گہری اور گھنی تھی۔ اتنے سالوں سے اس گھر میں ہونے کے باوجود کبھی دل کی بات ان سے نہیں کی تھی۔ وہ کیا سوچتی تھی؟ کسی کو اندازہ نہ تھا۔ ہاں زیم کی پسند اور گھر کے کاموں میں ثروت کی معاونت دیکھ کر اب وہ بھی کبھی اس سچ پر سوچنے لگتی تھیں۔

”جی ممانی جا رہی ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی باورچی خانے کی طرف بڑھی تھی۔

”اور ہاں دال کو بگھار بھی لگا لینا، فریزر میں تین چار کباب پڑے ہیں وہ بھی بنالینا..... صبح سے بھوکا ہے میرا بچہ۔“ وہ اسے تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”ہوں بڑا آیا شہزادہ گلفام..... زہر لگتا ہے مجھے اور اسی کے کام جی حضوری کر کے کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے آٹا گوندھنے لگی۔

اسے سلائی کڑھائی کا بہت شوق تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ علاقے میں نیم سرکاری سلائی اسکول کھلتا تھا۔ اس نے ماموں سے داخلہ لینے کی بات کی تھی، ممانی نے تو صاف انکار کر دیا۔

”کیا کرے گی سیکھ کر..... ورنہ بنے گی بھئی جد ہے۔ گھر میں پہننے کے لیے سیدھی سادی شلوار قمیص کاٹنی سینا میں سکھا دوں گی..... کوئی ضرورت نہیں ہے داخلہ لینے کی۔“ مگر زیم نے بھی ماں سے اس کی سفارش کی تھی۔

”داخلہ لینے دیں امی، اچھا ہے کل کو آپ کے بڑے کام آئے گی، پردے، بیڈ شیٹ اور یہ جو چیزیں آپ لوگوں کو پیسے دے کر بخواتی ہیں، مفت میں بن جایا کریں گی۔ بھئی ثروت مجھے بھی سردیوں میں سویٹر

”مطلب یہ کہ اگر وہاں رہی تو وہ تیری شادی اس کالے بھنگ بیٹے سے کروا کر ساری زندگی نوکرانی بنا کر رکھے گی تجھے اور زیور پرناگن بن کر بیٹھی رہے گی یوں پھن پھیلا کر۔“ گل ریز نے باقاعدہ بازو سے پھن پھیلا یا۔

”تو.....“ ثروت کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔
 ”تو یہ کہ تجھے شادی تو صرف مجھ سے ہی کرنی ہے۔ سیدھے طریقے سے تو تیرے ماموں ممانی مانیں گے نہیں تو ہم کورٹ میرج کریں گے۔ شہر بھی چھوڑنا پڑے گا اور نئے شہر میں زندگی شروع کرنے، گھر بسانے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی تو تو سوچ لے، آگے خود سمجھ دار ہے۔“ وہ بات کے آخر میں ہنسا تھا۔ کندھے پر لال اور پیلا پرنا اور سر پر پشاور کی ٹوپی رکھے بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ثروت کو اس کے چہرے کے علاوہ کچھ دیکھنا ہی نہیں تھا۔

”ہاں..... یعنی میں اپنے حصے کا زیور لے کر تیرے ساتھ کورٹ میرج کر لوں؟“ وہ بھی مسکرائی تھی۔

”اپنے حصے کا مطلب! اور جو اتنے سالوں سے ان کی غلامی کر رہی ہے وہ..... روٹی تو لوگ کتے کو بھی ڈال دیتے ہیں۔ تو تو پھر جیتی جاگتی انسان ہے ثروت! سارا زیور..... مگر سن..... زیور تو نہیں چرائے گی..... ایک تیرے دو شکار کریں گے..... دلشاد کو بھی تو چھٹکارا دلانا ہے نا اس شئی سے..... کیوں دلشاد؟“ وہ اب دلشاد سے مخاطب تھا۔ دلشاد کے چہرے پر خوف تھا مگر آنکھوں میں گل ریز کی باتوں سے چمک ابھری۔

”مطلب..... میں..... میرا کیا کام؟“
 ”تو ثروت کے بھاگنے کے بعد جانے کی وہاں نوکری کے لیے ظاہر ہے ثروت کے حصے کے کام اس کی موٹی مائی کو کرنے پڑیں گے تو کام والی تو رکھے گی۔ ثروت تجھے زیور کے بارے میں سب بتا دے گی تو خوب خدمت کرنا مائی کی۔ اپنا اعتماد بٹھانا اور پھر موقع دیکھ کر سارا زیور نکال لینا۔ پھر ہم تینوں یہ شہر

چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ تجھے تیرا حصہ مل گا اور پھر تیری شادی بھی کسی اچھے سے لڑکے کو دادیں گے آخر بہن ہے ہماری..... ثروت؟؟ گل ریز نے ثروت کو مخاطب کیا۔

”ہوں..... ہاں..... مگر اتنا آسان نہیں مشکل ہو سکتی ہے، انہیں شک ہو سکتا ہے۔“
 ”شک تو تب ہوگا جب تیرے بھاگنے، غائب ہوگا تیرے گھر سے بھاگنے کے بعد وہ طور پر گھر کی نقدی اور زیور چیک کریں گے۔ کچھ اپنی جگہ پر ہوگا اور تجھے کون کچھ کہہ سکے گا ہے، اپنی مرضی سے نکاح کرے گی اور پھر جہ عرسے بعد دلشاد اپنی مجبوری بتا کر نوکری چھ جائے گی تو کسی کو کیا خبر کہ وہ ساتھ گھر کا زیور بھی لے گی۔“

گل ریز نے بات کے آخر میں آنکھ دبا ڈی ثروت نے دلشاد کی طرف دیکھا۔ دونوں کے پر خوف کے سائے تھے۔
 ”اور جب کبھی انہیں زیور کی کم شدگی کا گائب کیا ہوگا؟“

”بھئی ہمیں کیا پتا جب ہم بھاگے تھے زیور وہیں تھا اور تو دلشاد کی فکر نہ کر، اسے دے دیں گے۔ میرا بار ہے دینی میں اس کے لیے ہم ویسے ہی ڈھونڈ رہے تھے بس تم دونوں سوچ ایک طرف خوش حال زندگی اور دوسری طرف غا زندگی اور یاد رکھنا اپنا حق سیدھے طریقے سے تو انکی ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہے۔“ وہ گاڑی اسٹار کے نکل گیا۔ اور وہ دونوں عمر کے اس حصے میں جہاں اپنے دشمن اور کوئی پرایا بے حد اپنا لگنے لگتا دلشاد نے ثروت کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

ثروت اور گل ریز بھاگ کر کسی دور دراز گاؤں گئے تھے۔ وہاں گل ریز کا کوئی دوست تو نے نکاح کا سارا انتظام کیا تھا۔ تین مہینے بعد وہ پہنچ گئی تھی۔

”بڑی مشکل سے جان چھڑائی تیری ممانی سے
میں جب نوکری کے لیے گئی تو پہلے تو اس نے نہ کر
دی۔ پتا چلا کہ ہونے والی بہو بھاگ گئی۔ بڑی بدنامی
ہوئی پھر منت سماجت کی تو صفائی کے کام کے لیے رکھ
لیا۔ پراتنی تیز کہ اس کمرے میں جانے ہی نہیں دیتی
تھی جہاں سارا مال تھا۔ میں نے بھی خوب اعتماد بحال
کیا، صد شکر کہ سلائی اسکول برقعے میں جاتی تھی ورنہ
تو محلے کا کوئی پچپان لیتا۔ خیر آج کل میں میں خود
نوکری چھوڑنے والی تھی کہ اس نے خود ہی بلا کر فارغ
کردیا۔ میں سیدھی بس میں بیٹھی اور آگئی۔
”اور زیور..... وہ نہیں لائی؟“ گل ریز اتاؤلا
ہوا۔

”لائی ہوں ناں..... یہ دیکھ..... دو دن پہلے ہی
نکال لائی تھی جب ثروت کی مامی کو اچانک کسی فوٹنگی پر
جانا پڑ گیا تھا۔“ دلشاد کل کرہی۔
”لو جی پیچھے رہ گئے سارے دکھ درد سیاہے۔“
وہ بھی ہنسی اور گل ریز کے چہرے کی پھٹکی مسکراہٹ وہ
دونوں اپنی خوشی میں دیکھ ہی نہیں سکی تھیں۔
”دیکھ گل ریز..... دلشاد نے ہمارے لیے بہت
کچھ کیا ہے، اب ہمارا بھی فرض ہے کہ جلد از جلد اس
کی شادی کروا کر اسے بھیج دیں۔ ماما، مامی آرام سے
نہیں بیٹھیں گے۔ پولیس میں رپورٹ ضرور کروائیں
گے۔“

”ہاں ہاں..... میں کل ہی بات کرتا ہوں اس
سے..... اور تم دونوں فکر کیوں کرتی ہو..... کیا کر لیں
گے وہ..... اور دلشاد نے کون سا چوری کی ہے، بس تیرا
حق تجھ تک پہنچایا ہے..... کس بات کی رپورٹ
لکھوائیں گے وہ۔“ گل ریز نے انہیں تسلی دی تھی۔
”میں ہوٹل سے کھانا لے کر آتا ہوں..... تم
لوگ یہ سب سامان صندوق میں رکھ دو۔“ وہ انہیں
تاکید کرتا نکل گیا۔

دو دن بعد گل ریز نے خوش خبری سنائی کہ اس کا
دوست آ رہا۔ گل ریز نے اس کی فوٹو بھی دکھائی۔
دلشاد کو لگا زندگی کے سارے دکھ درد اب ختم ہونے کو

ہیں۔ اس نے ثروت کو گلے لگا لیا۔
”شاید یہ غلط قدم صحیح منزل کی طرف لے ج
کے لیے ہی اٹھا تھا۔“ کم عقلی کی عمر کی احقانہ
..... دلشاد نے اپنے تئیں بڑی عقل کی بات کی
ثروت نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

وہ بڑی دیر تک سوئی رہی۔ اٹھ کر دو
چار پانی کی طرف دیکھا..... وہاں کوئی نہیں تھا۔
گل ریز کہاں چلا گیا؟“ وہ چپل اس کر باہر
دلشاد ناشتا بنا رہی تھی۔

”گل ریز کہاں گیا؟ دلشاد، تو نے دیکھا
جاتے ہوئے؟“ وہ قل کھول کر ہاتھ منہ دھونے لگی
”میں تو سمجھ رہی تھی کہ ابھی تک سو رہا ہے
کہاں ہے؟“ دلشاد نے پراٹھا توڑے سے اتارا۔
”کام سے گیا ہوگا۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں آج اس کے دوست نے بھی آنا
اتنی صبح بغیر بتائے کھڑکا (آواز) بھی نہیں ہوا
دلشاد..... وہ۔“ تل کھلا چھوڑ کر وہ کسی خیال کے
دوبارہ کمرے میں آئی..... چار پانی کے نیچے صند
جوں کا توں رکھا تھا۔ ایک سانس سکون کا لے لے
مزے۔ دلشاد دروازے میں کھڑی تھی۔

”تو بھی وہی سوچ رہی ہے ثروت جو میں۔
رہی ہوں.....“ کسی انہونی کے ڈر سے دلشاد آ
بڑھی۔ ثروت نے سر جھٹکا۔

”کیا پاگل نہ ہو تو..... صندوق وہیں رکھا ہے
وہ ہنسی تھی۔

”اور صندوق کے اندر!“ دلشاد کی بات
جیسے سن سی ہو گئی دونوں نے لرزتے ہاتھوں
صندوق کھولا خالی صندوق ان کا منہ چڑا رہا تھا، ثروت
کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ وہیں دلشاد کے پیر
میں گر گئی۔

”ہائے اور با..... اتنا بڑا دھوکا۔“ دلشاد کی
سنائی دی اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

”کون تھا گل ریز؟ کہاں سے آیا تھا؟ وہ اسے جانتی ہی کب تھی..... وہ دو زندگیاں رول گیا تھا۔ ثروت نے دلشاد سے واپس جانے کی بات کی تھی۔ دلشاد نے ماچس اٹھالی۔

”میں آگ لگا کر جل مر جاؤں گی پر واپس نہیں جاؤں گی اور تجھے تو شاید تیرے ماما، ماما، معاف کر دیں۔ وہ زعیم ترس کھا کر اپنا بھی لے پر میں..... میں کیا کروں گی..... کہاں سے لاؤں گی وہ زیور جو تم لوگوں کی خاطر میں چوری کر کے بھاگی تھی میں نے تیری خاطر چوری کی تھی ثروت..... زیور کہاں ہے یہ تو جانتی تھی۔ ضرورت تجھے اور گل ریز کو تھی۔ مجھے تو بس مہرہ بنایا تم دونوں نے۔ میں بھی باتوں میں آ گئی..... اس جہنم سے نکلنے کے لیے یہ کیا کر لیا میں نے۔“ وہ رونے لگی۔

”تیرے تو صرف خواب مرے ہیں دلشاد..... میرا تو دل بھی مر گیا..... خالی ہاتھ اور خالی دل ہو گئی میں تو۔“ وہ سکنے لگی۔

”تجھے کیا لگتا ہے اب آگے ہمارے لیے کوئی راستہ ہے۔“ دلشاد سیدھی ہو بیٹھی رات ہونے کو تھی۔

”ہاں ہم کل صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ میرے پاس دو ہزار ہے..... خالہ کے بٹوے سے چوری کیے تھے۔ ہم دونوں کسی دارالامان..... نہیں وہاں تو پکڑی جائیں گی کہاں؟“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”کسی سے بھی مدد مانگ لیں گے مگر یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم یہاں رہ بھی نہیں سکتے، یہ مکان کیا پتا کس کا ہے؟ کہیں کسی اور خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ گل ریز نے نکاح کے دو بول پڑھ کر بھی اپنی عزت کی حفاظت نہیں کی..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ثروت نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ہوں۔“ دلشاد نے گھٹنوں میں سر دے دیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل رہی تھیں جب ساتھ والے مکان سے ایک عورت نکلی۔

”کہاں جا رہی ہو تم لوگ تو ابھی کچھ دن پہلے

ہی آئے ہوتاں یہاں؟“ اور اس کے سوا جواب میں دلشاد نے بنا سوچے سمجھے گل ریز۔ یہاں آنے اور گل ریز کے دھوکا دینے تک کی بات اگل دی۔ وہ عورت کتنی ہی دیر منہ پر ہاتھ ٹکڑی رہی۔

”تو اب کہاں جاؤ گی تم دونوں؟“ کتنی بعد اس نے قابل ترس نظروں سے ان کی سمت ہوئے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں، ابھی تو کچھ پتا نہیں۔“ منمنائی تھی۔

”یہاں سے دو گاؤں چھوڑ کر تیسرا گاؤں مشرق کی طرف۔ ابھی گھنٹے بعد بس آئے گی جانے والی، بھاگ پورا تر جانا۔ وہاں جا کر کمر بھی چاچا برکت حلوائی کا پوچھنا وہ ہر حال! کریں گے تم لوگوں کی۔ بہت نیک خدا ترس ہیں۔ ہاں بس یہ زیور چوری والی بات نہ بتانا۔

ہو پولیس کے ڈر سے وہ بھی مدد کرنے سے ا دیں۔“ اور اس عورت کو شاید ان پر ترس ہی آیا! ”بہت شکریہ بانی! اور اگر گل ریز آ

اسے ہمارے پیچھے بھیج دینا۔“ ایک امید کر ثروت کے کہنے پر اس عورت نے اثبات! بلایا۔ وہ دونوں بھاگ پور والی بس میں بیٹھ کر اب دیکھی ان جانی منزل کی طرف رواں تھیں۔

☆☆☆

چاچا برکت نے رہنے کے لیے جگہ دے مگر پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ وہ کوئی چوری کر کے نہیں بھاگی تھیں۔ پورے دس لاکھ زیور تھے پھر اسے کوئی راستہ بھائی نہ دیا تو خا ایک سبیل نکال دی۔ اسے شک تو کئی روز سے اس شام جب وہ دلشاد کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس اس نے جو نوید سنائی وہ اس مصیبت سے نکلنے نوید تھی۔ اس نے اپنی اولاد کا سودا کرنے کا فیہ لیا۔ فیصلہ مشکل تھا مگر اس کے بعد زندگی بے خخطر ہو جاتی اور پیدا ہونے والا بچہ بھی باعزت

جھلک..... وہ جو سرکاری ہسپتال کے لیبر روم میں
کی زندگی کا کل تھی۔

☆☆☆

(10 اپریل 2018ء)

”پاپا! کب سے کہہ رہی ہوں، آپ ابا
ارمان سے مل لیں اب تو وہ فارن سے انی تعلیم
کے بھی آ گیا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں اگر وہ آ
سند نہ آیا تو میں ناراض نہیں ہوں گی بلکہ جہاں
کہیں گے وہاں خاموشی کے ساتھ شادی کر لوں
اصباح باپ کے گلے سے لگی بڑے لاڈ سے کہ
تھی۔ زعیم نے عینک اتار کر ایک طرف رکھی اور
سے پکڑ کر اصباح کو سامنے بٹھالیا۔

”تو ملو اوناں مجھے ارمان سے..... میں
پہلے بھی کہا تھا کہ تمہاری دادی کو اس کنڈیشن میں
گر ہم نہیں جا سکتے..... بیٹا دادی بہت
ہیں..... ماما ہوتیں تو اور بات تھی مگر اب..... آ
کر وہ ارمان کو اور اس کی ماما کو انوائسٹ کر لو کہ
ڈنر پر، میری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ ذرا فیملی
گراؤنڈ بھی پتا چل جائے گا۔“ اور ان کی بات
تھوڑی دیر خاموش ہو گئی۔

”ہاں کہہ تو دوں گی مگر ارمان بتا رہا تھا کہ ا
ماما بہت عبادت گزار اور باپردہ خاتون ہیں۔ یہ
گھر سے نکلتی ہیں مگر پھر بھی، میں بات کر کے د
گی، ہماری خاطر تو نکلیں گی وہ گھر سے۔“ بات
آخر میں وہ مسکرائی تھی اور اسے خوش دیکھ کر ز
مسکرائے۔

☆☆☆

بیوی کی موت کے بعد ان کی زندگی ب
ماں اور اکلونی بیٹی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔
وفات کے بعد فیکٹری کا کام بہت بڑھ چلا تھا۔
شہر سے باہر بھی کپڑا جاتا تھا اور کچھ ریڈ
گارمنٹس کا کام بھی تھا۔ شہر سے باہر اطراف
قصبوں چھوٹے گاؤں سے بھی کاری کر خواتین

گزارتا ایک شام جب وہ قریبی درگاہ پر اپنے گناہوں
کی معافی مانگنے اور اللہ سے مدد مانگنے کی غرض سے دعا
کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑی تھی تب ہی کوئی نادیدہ
طاقت اسے درگاہ کے عقبی حصے میں لے گئی جہاں
اسے شبوبلی۔ شبو وہ بھجوا..... جس کا نام شبنم تھا.....
جس سے وہ دل کی ہر بات کہتی چلی گئی جس نے اس کا
مسئلہ حل کیا تھا۔ جس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”آہ.....“ وہ جیسے خیالوں سے نکلے۔ ایک طویل
مسافت کی جھکن جوڑ جوڑ میں محسوس ہو رہی تھی۔ بچے
کی پیدائش کے بعد وہ بھاگ پور سے بھی آگے کے
گاؤں میں چلی گئی تھیں شبو سے وہ پھر کبھی نہیں ملی۔
”کیا ہوا ثروت..... تم ابھی تک ادھر ہی بیٹھی

ہو۔ بس کروان کپڑوں پر تریانی بھی میں کر دوں گی اور
بٹن بھی لگا دوں گی۔ تم بس آرام کرو اب۔“ دلشاد
چادر اوڑھتی گھر سے نکل گئی۔

وہ دونوں جس گاؤں میں رہتی تھیں یہاں سے
قریب ہی مین سڑک پر ایک بوتیک تھی۔ جہاں سے
سڑک شہر کی طرف جاتی تھی۔ وہ دونوں وہاں کے لیے
ہی سلائی کا کام کر کے گزار کرتی تھیں۔ پچیس سال
پہلے وہ شہر گئی تھیں، ماموں ممانی کا نقصان بھرنے
وہیں سے پتا چلا کہ دلشاد کی ماما اب دنیا میں نہیں رہی
وہ دونوں سارے رنگین خواب ہمیشہ کے لیے دفن کر
کے بڑی بڑی چادروں میں خود کو لپیٹے وقت سے پہلے
بیوہ بن کر ایک گاؤں کے بوسیدہ سے مکان میں زندگی
گزارنے لگیں۔ نہ کبھی کسی نے ذاتی زندگی میں
مداخلت کی کوشش کی، نہ انہوں نے کسی کو موقع دیا۔ وہ
کم عمری سے چنگی اور بچی عمر تک پہنچنے کے لیے ایک
غلطی کے بل سے گزری تھیں..... لوگ باتیں بتاتے
ان کی تنہائی پر..... بے اولادی پر۔

”دونوں کے شوہر ایک حادثے میں مر گئے،
بے چاری بہنیں ہیں، دونوں ہی بیوہ۔“ لوگ ترس
کھاتے اور وہ سلائی مشین کے آگے جھکی رزق کا
سامان کرنے میں جتنی رہتیں۔ ثروت کو ماما، ماما، زعیم
اور گل ریز کی شکلیں بھی یاد نہ رہیں۔ یاد تھی تو بس ایک

کے بھجواتی تھیں۔ یوں کام پہلے سے زیادہ پھیل چکا تھا۔

☆☆☆

”ثروت وہ بوتیک والی باجی کہہ رہی تھیں کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ معاوضہ بڑھانے اور سامان کے لیے پیشگی رقم کے سلسلے میں قریبی گاؤں میں میٹنگ ہے۔ ساری ورکرز جائیں گی۔ سنا ہے اس مرتبہ اصلی مالک آ رہا ہے جو اس سارے کام کا مالک ہے جس کی فیکٹری سے سارا کپڑا آتا ہے، ہم بھی چلیں گے ثروت..... سنا ہے فیکٹری والے مفت میڈیکل کمپ بھی لگاتے ہیں تو اپنی آنکھیں بھی چیک کر دالینا۔“ دلشاد نے جو بوتیک میں سارا مال دے کر آئی تھی، چادر اتار کر کوئی سے لگائی اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ تو اچھی خبر ہے۔ معاوضہ بڑھ جائے گا تو مہنگائی کے اس دور میں گزارہ بہترین ہو جائے گا اور اگر علاج معالجہ بھی مفت ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ باورچی خانے سے نکلی۔ آج بہت دن بعد آلو کوکشت کا سالن پکایا تھا۔ وہ سلاد اور رائے بنا رہی تھی۔ روٹیاں دلشاد آتے ہوئے راستے سے ہی لے آئی تھی۔

”کب ہوگی میٹنگ؟“ وہ برآمدے میں چٹائی پر کھانے کے برتن رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ دلشاد وہیں صحن میں لگے لپٹ پر ہاتھ منہ دھو رہی تھی۔

”اگلے ہفتے سنا ہے فیکٹری کا مالک پہلے تقریر کرے گا، معاوضے بڑھانے کا اعلان کرے گا۔ وہیں سب ورکرز اپنے اپنے میڈیکل کارڈز کے لیے نام بھی لکھوائیں گی پھر میٹنگ کے بعد چند خوش نصیب ورکرز کے علاج کا ذمہ فیکٹری کا مالک لے لے گا..... اب دیکھو۔“ وہ چٹائی پر آ بیٹھی۔

”چلو معائنہ تو ہو جائے علاج بعد کی بات ہے۔“ وہ سر جھکائے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

”سنو ارمان۔“ وہ بہت دنوں بعد یونیورسٹی آیا

تھا اپنے پرانے دوستوں سے ملنے..... تب اس سے بات کرنے آ گئی۔ وہ اسے دیکھتے ابھی آیا کہہ کر اس کی طرف آ گیا۔

”ہاں اصباح کہو..... خیریت ہے نار اس کے سامنے آ رکا۔“

”ہاں ارمان سمجھو خیریت ہے بھی اور..... تمہیں تو پتا ہے کہ میری وادی کی کنڈیشن

ہے کہ ہم انہیں تھوڑی دیر کے لیے بھی چھوڑا سکیں۔ ان دنوں تو بابا بھی بالکل گھر پر ہی

میں یونیورسٹی سے جاتی ہوں تو بابا فیکٹری ہیں۔ وہ چاہ رہے تھے کہ اگر تم اپنی ماما کو۔

وادی کی ملاقات بھی ہو جائے گی اور ہم ا

نصیحتیں بات کر سکیں گے..... مگر تمہاری ماما تو آتی جاتی ہی نہیں۔“ اصباح کی پوری بات

لحظہ بھر کو خاموش ہوا۔

”تمہیں بتانا چاہیے تھا اپنے بابا کو..... تو نہیں آ سکیں گی۔“ وہ پاؤں سے مٹی کھر

جوتے کی ٹوہ پر گرد لگ گئی۔

”مگر ایسا کیوں ہے ارمان..... ہمار

زندگی کا سوال ہے اور اگر میرے بابا آ

لوگوں کے گھر تو کیا تب بھی وہ بابا سے نہیں ملیں

اصباح کو غصہ آ گیا۔

”اصباح مجھے تم سے بھی بہت سی باتیں

ہیں، میری ماما، میری نانی، ان سب کے بار۔

مگر اس سے پہلے اصل میں ماما اور نانی بہت ہیں۔ بہت عبادت گزار وہ دنیا کے معاملات

ہی رہتی ہیں بس ان کی دنیا مجھ تک ہی محدود۔

”تو اس طرح بات آگے کیسے بڑ

ارمان.....؟“ وہ چڑھ کر بولی۔

”اچھا..... میں بات کرتا ہوں ماما۔

بہت فکر مند دکھائی دینے لگا اور پھر واپس

اصباح کو اس کا یہ رویہ بہت عجیب سا لگا۔ وہ ۳

پڑ گئی۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر بریانی کی ڈش رکھی تھی۔ ساتھ تین پلیٹ اور تچے بھی رکھے تھے۔ وہ ان دونوں کی سمت دیکھتا خاموشی سے آکر کھانے کی نیت سے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ہی سمجھ گئی کہ کوئی پریشانی ہے۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا؟ ماں نے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس ہاتھ میں عجیب سی محبت تھی۔ ممتا اور باپ کی شفقت کا ملا جلا سا احساس تھا۔

”نہیں..... کچھ نہیں۔“ وہ کھانا کھانے لگا۔

”کچھ تو ہے..... جو تم چھپا رہے ہو اپنی ماں سے۔“ وہ فکر مند ہوئیں۔ ارمان نے نانی کی سمت دیکھا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی بمشکل اٹھیں اور وہاں سے چلی گئیں۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔ وہ جب بھی وہاں آتی تھیں کبھی بھی ان دونوں کے ذاتی نوعیت کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

”کیا بات ہے ارمان؟“ وہ اب پریشانی سے بولیں۔

”ماں..... اصباح کے بابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں..... وہ ہم دونوں کی شادی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اصولاً تو آپ کو رشتہ لے کر جانا چاہیے تھا مگر.....“ وہ خاموش ہو گیا۔

”میں..... میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ ان کی اس بات پر ارمان نے پہلی مرتبہ تھکی اور غصے سے ان کی سمت دیکھا تھا۔

”ماں جب کوئی بھی لڑکی شادی کے بعد اس گھر میں آئے گی میری بیوی بن کر تو..... تب، تب کیا ہو گا؟ اسے بھی تو ساری حقیقت بتا چل ہی جائے گی ناں..... تو..... کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ابھی ہی بتا دیں ان لوگوں کو..... پھر آریا پار..... جو بھی ہو..... وہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا..... اور اصباح کی محبت کی آزمائش بھی ہو جائے گی۔“ وہ پھٹ پڑا۔ وہ چند ٹاپے خاموش رہیں۔

”ٹھیک ہے..... ہم کل شام چلیں گے ان کے ہاں..... میں اور تمہاری نانی۔“ وہ مان گئیں۔

ارمان کے چہرے پر سلاہٹ بھری تھی۔

”آپ بہت اچھی ہو ماں..... اور میری پیماں ہو۔“ وہ ان کا ہاتھ تمام کر بولا تھا۔

”تو بھی بہت اچھا ہے میرا ارمان بیٹا۔“

ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”اور کل شام نہیں، کل تو اصباح کے بابا کو کے سلسلے میں کہیں جانا ہے، اسی لیے وہ کل یونیورسٹی نہیں آ رہی۔ ہم ایک دو دن کے بعد چلیں گے وہ مسکراتے ہوئے کھانے پر جھک گیا۔

☆☆☆

بہت بڑا گراؤٹ تھا۔ تاحد نگاہ لوگ لوگ..... آس پاس کے گاؤں سے درکرز، حور، مرد، بچے سب ہی آئے تھے۔ ایک پل کے۔ زعیم ساکت کھڑے رہ گئے۔ بابا کا لگایا کام اتنا آجکا تھا۔ انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ عظمت صاف کی یہ گارمنٹ فیکٹری..... اب صرف ایک فیکٹری نہیں تھی۔ ایک براڈ میجی جس کے نام سے بہت دکانیں..... بونیکس اور ڈیزائنز کام کر رہے تھے خوشی کا احساس تھا جو ناقابل بیان تھا۔ درکرز سامنے تقریر کرتے ہوئے ان کے چہروں پر غربت اور مجبوری کو وہ باآسانی پڑھ سکتے تھے۔

دھوپ میں بیٹھی درکرز پر نظر دوڑاتے چہرے پر نظریں بٹھری گئی تھیں۔ وہ چہرہ بچیس کے بعد نظر آیا تھا..... بلاشبہ وہ ثروت ہی تھی..... سے بھی انہیں محبت ہوئی تھی جو ان کی محبت کو ٹھکرا اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بڑھ رہی تھی۔

”شاید اس نے غور سے دیکھا نہیں۔“ دل سوچتے ہوئے انہوں نے تقریر مختصر کر کے معا بڑھانے کا وعدہ کیا۔ خوب تالیاں بجنیں۔ وہ اب سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور آج کا ہاتھ کا چھبانا کر میڈیکل کارڈ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ثروت..... ثروت گل ریز..... یہ وہ ہول

نظر کمزور ہو رہی ہے۔ ابھی بھی ہر چہرہ دھندلا دکھائی دے رہا ہے اور سر میں درد بھی ہے۔ وہ میڈیکل کے لیے ساری تفصیل لکھوا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ انہیں پہچان کیوں نہ سکی تھی۔ کچھ عمر اور وقت کے ساتھ حلیہ بدل بھی چکا تھا۔ بالوں میں سفیدی اتر آئی تھی۔ خود انہیں نظر کی عینک لگ چکی تھی۔ ہلکی ہلکی داڑھی رکھ لی تھی رنگ جو پہلے بہت پکا لگتا تھا اب آسانٹوں میں رہنے اور خود بخاری کی زندگی گزارتے گزارتے قدرے بہتر ہو چکا تھا۔

”ثروت کل ریز..... اندر آ جاؤ بی بی۔“ مینٹنگ کے بعد چند ورکرز کے مکمل علاج کی ذمہ داری فیکٹری کے مالک نے لی تھی ان میں سب سے آخر میں ثروت کا نام رکھا گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں تیز بلب کی روشنی اور خشکی کے احساس سے جیسے سکون کا سانس آیا تھا، سامنے بیٹھے شخص کو پہلی نظر باہر تقریر کے دوران تو یونہی سرسری سا دیکھا تھا مگر اب..... نظر ٹھہر گئی تھی، سانس جیسے ساکن ہونے لگی۔

”آؤ ثروت بیٹھو۔“ وہ ہمت مجتمع کر کے بولے۔ ہاتھ کے اشارے سے سیکرٹری کو باہر جانے کو کہا تھا۔

”آپ..... زعیم..... میں نے باہر پہچانا ہی نہیں..... سر میں اتنا درد تھا..... آپ۔“ وہ کرسی پر ڈھے جانے والے انداز میں بیٹھی تھی۔

”دنیا بہت بڑی ہے ثروت..... مگر ہم اسی دنیا کے ایک چھوٹے سے ملک میں رہتے ہیں اور تم بھاگ کر کہیں بھی چلی جاتیں گھوم کر اسی مقام پر آ جاتیں جہاں سے چلی تھیں، یہ قانون قدرت ہے اور اس گول زمین کا چکر..... میں نے تو تمہیں تقریر کے دوران ہی پہچان لیا تھا۔“ وہ کوئی عجیب بات کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اب نہ عمر بھی نہ وقت۔

”سب کیسے ہیں؟ ماہوں..... مای.....؟“ وہ جیسے کھائی میں سے بولی تھی۔

”بابا تو کئی سال پہلے ہی وفات پا گئے۔ امی

حیات ہیں مگر بالکل بستر پر ہیں۔“ وہ اور کیا بتاتا۔
”اور آپ نے شادی کی؟؟“ عجیب! سوال تھا تو کیا وہ اس کے بھاگ جانے کے بجا رہتے۔

”ہاں کی..... امی کی پسند سے۔ شائستہ اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ امی کی بہت خدمت کا نے۔ بیٹی پیدا ہوئی ہماری ماشاء اللہ بیس برس کا پھر بیٹا ہوا مگر اس کی پیدائش کے وقت کچھ مسائل ہو گئے کہ نہ وہ بچ سکا اور نہ شائستہ..... امی بہت کوشش کی میری دوبارہ شادی کی مگر میں نہ کر لی۔ میں نے زندگی میں دو عورتوں کو دل سے اور دونوں ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔“ بات کے میں نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ سر جھکا رہی۔

”اگر تم پرانے مانو تو ایک بات کہوں۔“
”جی کیسے؟“

”اپنے شوہر کے بارے میں تو تم نے بتایا وفات پا گئے تو بچے.....! اور اس سوال پر دل دھاک دی تھی۔ کیا بتاتی کہ تم لوگوں کا نقصان پھر اور جیل کے خوف سے اس نے اپنی اولاد بچ دی تھی بچے نہیں ہیں۔“ اسے اپنی ہی آواز عجیب لگی تھی۔

”اوہ..... سوری۔“ وہ کئی لمحے خاموشی کی نذر گئے۔

”ثروت..... تم اگر میرے ساتھ چلو اور اُبارامی سے مل لو۔ وہ بہت یاد کرتی ہیں پرانے کو۔ ذہن جیسے کئی سال پیچھے کو جا کر رک گیا ہے۔ بابا کو آوازیں دیتی ہیں، بچھی تمہیں۔ کل تمہیں آدے کر روٹی پکانے کو کہہ رہی تھیں۔ اصباح نے ہنسنے لگی۔ کہنے لگی کہ بابا دادی ثروت پھوپھو کو آدے کر کہہ رہی تھیں۔“ ثروت اٹھ جا جلدی سے ر ڈال دے..... زعیم آنے والا ہے کالج سے۔“ پھر وہ ہنسنے لگے۔ ”یونہی ڈاکٹر کہتا ہے۔ اس عمر اکثر ذہنی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔“

”میں چلوں گی۔“ ایک لمحے کی دیر کیے بنا اس نے ہامی بھری۔

زندگی میں بہت غلط فیصلے کیے تھے۔ اپنے پرانے کی پہچان نہیں تھی۔ وہ اب اتنے سالوں بعد ملنے پر بھی کوئی گلہ نہیں کر رہا تھا نہ کوئی شکوہ اور ماما..... وہ اسے یاد کرتی تھیں یعنی ان کے ذہن میں اس کی یادیں تھیں۔ وہ آبادی ان کی یادوں میں۔ اس گھر میں اس کے نام کی پکار آج بھی اٹھتی تھی اور جس کی خاطر ان سب کو چھوڑا تھا وہ نہ جانے کہاں تھا۔ اسے یاد بھی تھا کہ نہیں۔ اسے تو یہ بھی نہیں خبر تھی کہ جسے بیوی بنا کر دو کا دیا وہ اس کی اولاد پیدا کر چکی تھی۔ وہ خشک آنسوؤں سے اندھی ہوئی آنکھوں کا چپک اپ کروانے فیکٹری کی ٹیم کے ساتھ شہر روانہ ہوئی۔ دلشاد کو اس نے ساری بات بتادی تھی۔

”پرسوں صبح تک آ جاؤں گی۔“ وہ فیکٹری کی دوسری عورتوں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی۔

☆☆☆

آج روٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا اپنے اجڑے ہوئے گلشن کو بہت یاد کیا جب کبھی گردشِ تقدیر نے گھیرا ہے نہیں گیسوئے یار کی انجمن کو بہت یاد کیا آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی آج بیٹے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا

(سافرِ صدیقی)

چار پائی پر لیٹا مفلوج وجود چھت کی کڑیاں گن رہا تھا اور آسو بہار ہا تھا۔ رقیہ نے بے بسی سے دیکھا پھر اپنی بڑی بیٹی کو آواز دینے لگی۔

”عشرت..... بیٹا دودھ پتی لے آ..... تیرے ماموں جاگ گئے انہیں دودھ پتی پلا کر دوانی کھلا دوں۔“ وہ آواز دے کر وہیں گل ریز کی پالستی پر بیٹھ گئی۔

بیس سال ہو گئے تیرے ایکسی ڈنٹ کو بھائی گل ریز اور اٹھارہ سال ہو گئے مجھے طلاق کا داغ اور تین بیٹیاں لے کر تیرے در پر آئے، نہ تیری حالت

بدلی اور نہ تیرے یہ آنسو۔ کس کے لیے بہاتا ہے کی آہ لے کر لے پڑا ہے بستر پر، کس کی بددعا آج مجھے بھی۔ میں تو آج تک نہ سمجھ سکی کہ تیرے میری شادی کے لیے، اماں کے آرریشن کے اسکوٹر کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئی تھی..... جس کے مال پر بھی ہاتھ مارا تھا ناں..... سچ کہ اس کی آہ لگی ہے۔ اماں کا آرریشن تو کامیاب، سچ نہ سکی..... میرا گھر اجڑ گیا اور تیرا ایکسی ڈنٹ وہ تو بھلا ہوا مچھ کا جو تجھے ہم تک لے آیا..... وہاں سڑک پر انجان شہر میں خون میں لت پت رہتا تو کیا کر سکتے تھے ہم۔“ رقیہ رونے لگی۔ وہ چھت کی سمت دیکھتا رہا۔

”جب تک تجھے معافی نہیں ملے گی سہ موت بھی نہیں آئے گی۔“ وہ بڑبڑاہٹ کے میں بولی تھی۔

عشرت دودھ پتی لے آئی اور سہارا د ماموں کو اٹھانے لگی۔ وہ گھونٹ گھونٹ اس سے اتارنے لگیں۔ وہ بے بسی کی تصویر بنا تھا زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک معصوم چہرہ نگاہوں میں بسا تھا کہ اور کوئی منظر دکھائی ہی نہیں دیتا تھا جسے دے کر خود اپنے ہاتھوں سے جانے لگتی ٹھوکریں کا کے لیے چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ خواتین سر سے پاؤں تک بڑی بڑی چادر اور ملبوس تھیں یوں کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ بس ایک ایک دکھائی دے رہی تھی جس سے وہ سب کو دبکا تھیں۔ اصباح بہت خوش تھی آج ہی ثروت پھو کے ساتھ گھر آئی تھیں دادی سے مل کر ان کے لگ کر بہت روئی تھیں۔ دادی نے بھی لرزتا کانٹا ان کے سر پر رکھ دیا تھا اور اب ارمان کی ماما آئی تھیں۔ بابا نے ہی رشتے کی بات چھیڑی تھی وہ کوئی بھی بات محل کر کرنے کے بجائے بر

ہاں میں جواب دے رہی تھیں۔ زعیم ان کی جھجک کو محسوس کر کے باہر آئے تھے۔

”ثروت“ وہ جو ممانی کے پاس بیٹھی ان سے پرانی باتیں کر رہی تھی ان کی سمت دیکھا۔

”اچھا تو نہیں لگتا مگر تم ایک احسان کرو گی مجھ پر۔“

”جی کیسے؟“ وہ اٹھ گئی۔ عذرا بیگم کی نظریں بھی بیٹے پر جا گئیں۔

”وہ اصباح کے رشتے کے سلسلے میں لڑکے والے آئے ہیں مگر دونوں خواتین بہت باپردہ ہیں،

مجھ سے بات کرنے میں جھجک رہی ہیں تو اگر تم آ جاؤ اور بات کر لو تو..... آخر تم اصباح کی پھوپھو ہو۔“ بات

کے آخر میں بڑے مان سے کہا تھا۔ اس نے کیا کیا تھا ان سب کے ساتھ اور وہ کتنی عزت دے رہے تھے۔

وہ اثبات میں سر ہلاتی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

”السلام علیکم..... میں اصباح کی پھوپھو ہوں۔“ اس کے تعارف کروانے پر ارمان کی ماما

کھڑی ہو گئیں۔ اصباح اور ثروت نے حیرت سے ان کی سمت دیکھا تھا۔

”آپ بیٹھیں ناں آئی۔“ اصباح نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”آپ.....“ ثروت نے غور سے اس کی آنکھ کی طرف دیکھا۔ چادر سے نظر آئی آنکھ..... اس کا

قد کاٹھ اور وہ آنکھ کچھ عجیب سا لگتا تھا۔

”جی.....“ وہ گہرا کر بولی تھیں وہ آواز..... وہ لمحے کے ہزار ویں حصے میں اس آواز کو پہچان گئی تھی۔ جسم

پر کچی سی طاری ہو گئی۔ کیا سارے اتفاقات ایک ساتھ ہونے ہیں..... کیا دنیا اتنی سکر گئی ہے۔

”شبو۔“ ایک سسکی سی حلق سے نکلی تھی۔

”باجی۔“ ایک ہاتھ اس کے سر پر آ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کے لمس کو، اس کی شفقت کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ فرشتے کا ہاتھ تھا۔ اصباح حیرت سے منہ کھولے

سب دیکھ رہی تھی چادر سرگ کر ڈھلک گئی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر دوسری عورت نے بھی چہرے سے چادر

سر کا کر جیسے کھل کر سانس لیا تھا۔ اصباح کی آنکھ کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ دو میزوں سے اس

سامنے کھڑے تھے..... وہ اس کا رشتہ لے کر آتے تھے..... وہ چکر اکر صوفے پر گر گئی۔

”اصباح۔“ وہ سب اس کی طرف مڑی تھیں ثروت کے سوال اس کے دل میں عی رہ گئے تھے۔

☆☆☆

”وہ میری ماں ہیں..... صرف میری ماں۔“ جو راتوں کو اٹھ کر تنہا کے نکل پڑھتی ہیں..... یہ

حفاظت کی دعائیں کرتی ہیں وہ بچپن سے مجھے کہتی آئی ہیں کہ میں ان کے پاس امانت ہوں مگر

نے ہمیشہ ان سے عی محبت کی ہے۔ مجھے معلوم ہے ان کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ وہ میرے لیے ماں

ہیں اور باپ بھی۔ جب سے میں ان کی گود میں آ رہا وہ لوگوں کی شادیوں پر ناخن والے میز پر نہیں رہا

میری ماں بن گئیں..... وہ لوگوں کے بچے پیدا ہو۔ پر دو حائیاں لے کر گانے والی میرے لیے لوریا

گانے لگیں۔ آیت الکرسی پڑھ کر دم کرنے لگیں۔ وہ بس میری ماں ہیں اصباح..... تم لوگوں کی نظر

وہ ایک میز پر ہیں مگر میری جنت ہیں وہ۔“ وہ جھکائے اصباح کے سامنے بیٹھا تھا۔

زعیم جو ڈاکٹر سے اصباح کی ڈرپ کے سلسلے میں بات کرنے گئے تھے باہر دروازے پر ہی رکا

گئے دماغ الجھ سا گیا تھا۔

”کھن آ رہی ہے مجھے تم سے ارمان..... تم بچہ سے لے کر جوانی تک ایک میز پر کھڑے کھڑے رہے

اس نے تمہیں پروان چڑھایا۔“ اور اصباح کی نفرت محسوس کر کے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

”بیٹا.....“ زعیم نے کچھ کہنا چاہا۔ اس ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور ہاسپٹل کی بلڈنگ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں وہ آنے سے سامنے بیٹھی تھیں اصباح کو ہاسپٹل چھوڑ کر وہ ایک بار پھر شبو کے سامنے

تھی۔ اب شیو کے گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں ارمان رہتا تھا۔

”شیو تو کس کا رشتہ لے کر اصباح کے گھر گئی تھی؟“ لرنزی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ارمان کی نانی نے اس کے آگے کوئلڈ ڈرنک کا گلاس رکھا تھا۔ ثروت نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بوڑھا مجبور جس کے ماتھے پر کثرتِ سجدہ سے نشان تھا۔

”تیرے بیٹے کا باجی..... تیری امانت..... میرے ارمان کا۔“ شیو کی آنکھیں چمکنے لگیں، ثروت کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا، تو کیا ارمان اس کا بیٹا..... اب تک شیو کے پاس تھا..... تو وہ عورت جس نے دس لاکھ دیے تھے۔ وہ کون تھی؟“ شیو نے جیسے سارے سوال اس کی آنکھوں سے پڑھ لیے تھے۔

”تیرا راستہ بس مجھ تک تھا باجی یا میں تیری راہ میں کھڑی تھی۔ اس روز جب تو نے ساری سچائی بتائی تھی۔ میرا دل تیرے درد پر ترپا تھا۔ میں اندر سے تیرے لیے روئی تھی باجی..... تو اتنی مجبور تھی کہ اپنی اولاد بیچنے کے لیے تیار تھی۔ میں نے گرد سے بات کی۔

”دنیا سے جانا ہے شیو نے..... مان جا..... تو ماں ہے میری، تو گرد ہے شیو کی..... مان جا..... آگے جا کر کوئی عمل بھی تو دکھانا ہے۔ اور یہ ودھائیوں کا سونا، نقدی کس دن کام آئے گا..... تجھے قسم ہے، ماں ہے تو میری، کیا لازمی ہے کہ ہم جیسے تاج کا کرہی گزارہ کریں گے۔ کس کتاب میں لکھا ہے کہ مجھوے کسی عام انسان کی طرح کی زندگی نہیں گزار سکتے..... مان جا ہاں..... اس کی مجبوری ہے..... اسے رقم دے کر ہم بچوں کو لے کر شہر کے کسی چھوٹے سے مکان میں رہ لیں گے..... محنت مزدوری کر لیں گے عبادت کریں گے۔ رب سے معافی مانگیں گے..... اس بچے کو اتنا پڑھائیں لکھائیں گے، اتنا پیار دیں گے کہ ہماری آخرت سنور جائے گی۔“

اس رات میں گرد کے قدموں میں گری روتی رہی۔ فجر کی اذان ہوئی تو گرد نے ساری رقم لاکر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

”اور کوئی نہیں جائے گا یہاں سے، صرف تو اور وہ بچہ۔ ہم دونوں اسے پالیں گی۔ ایک سادے صاف ستھرے گھر میں پروان چڑھا اور یہ ساری لگی رہیں گی اپنے کام دھندے ہاں جب ذرا ہوش سنبھالے تو سب بتا دینا شیو ہم سے گھن کھاتے ہیں۔ خوف کھاتے ہیں!۔“

”اور میں نے گرد کی ہر بات مان لی۔ گرد وی پر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ پردے میں کام کر کے آجانی..... مختلف ٹاک شوز میں، ڈانس میں..... پروگراموں میں..... اور ہم نے ایک امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کی باجی! ایک عملیلے سے باندھ لیا جو ساتھ جائے گا آگے، اور وہ عورت! وہ جو میرے بچے کو لیے آئی تھی۔“ ثروت بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ ان میں کوئی فرشتہ ہی تھی۔

”وہ کوئی نہیں تھی باجی۔ میں نے ایک بات کی تھی مگر تم بہت بڑی تھی۔ تب مجھے خیال یہ جو میں پاپے کے مزار پر جا کر روز دریا کو دیکھتے سوچتی ہوں کہ۔“ کون ہے تو شیو؟ کب ہے تیری زندگی کا.....؟ تب وہاں اس دریا احاطے میں مجھے تیری صورت اپنے ان سوا جواب ملا تھا۔“

وہ سسکنے لگی۔ اصباح کی نفرت کا سامنا سیدھا اپنی ماں کے پاس ہی آیا تھا۔ اندر۔ آوازوں نے قدم منجمد کر دیے تھے۔

”تو جانتی ہے شیو کہ تو ارمان کا رشتہ جہاں گئی ہے وہ کون ہیں.....؟ ثروت نے گلوں میں اس کی طرف دیکھا شیو نے نفی میں سر ہلا دیا، وہی ماما، مامی کا گھر جہاں سے میں زیو بھاگی تھی۔ میں اور دلشاد تیری دی ہوئی رقم۔ جان پولیس سے چھڑا کر چلی گئیں ایک گاؤں رہائش مل گئی، کام مل گیا۔ بس تب سے اب تک سے زندگی گزار رہی تھی۔ ہر سال تین مارچ کو ارمان سا لگرہ بھی ہم دونوں کی زندگی کا ایک خوش آ

ہوتا ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔

”ابھی چار دن پہلے ہی مجھے پتا چلا کہ جس فیلٹری کے لیے میں اور دلشاد کام کرتی ہیں وہ زعمیم کی ہے۔ زعمیم کسی میننگ کے سلسلے میں آئے، مجھے پہچان لیا اور ممائی سے ملاقات کے لیے میں دو دن کے لیے آگئی۔ مگر شاید یہ بھی بہانہ تھا، تجھ سے ملاقات کا بہانہ۔ اپنے بچے سے ملنے کا بہانہ۔“ وہ رونے لگی۔

”مجھے یاد ہے باجی تو نے ہسپتال میں ایک کاغذ پر دستخط کیے تھے۔“ شبیو نے کچھ یاد کروایا۔ وہ جیسے سارے حق کھو چکی تھی..... یاد آنے پر آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

”ہاں ایک لمحے کو بھول گئی تھی کہ میں نے اسے بیچا تھا۔“ دروازے کے ہینڈل پر نکلے ارمان کے ہاتھ اپنی دونوں ماؤں کی بے بسی اور محبت پر لرزے تھے۔

”جب وہ کاغذ ارمان کو گود میں لیتے ہی میں نے پھاڑ دیا تھا اور خدا اور خود سے ایک وعدہ کیا تھا جب بھی مجھے تول جائے گی تو میں تیری امانت تیرے حوالے کر دوں گی۔“ اور اس بات پر ارمان ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر گھسا۔ ثروت اسے دیکھتے ہی جیسے پھر کی بن گئی..... وہ ہو بھوگل ریز جیسا تھا۔

”ارمان۔“ شبیو کے منہ سے اس کا نام کسی حسرت کی طرح ادا ہوا تھا۔ ثروت وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی نفرت دیکھنے سے پہلے موت آ جاتی۔

☆☆☆

”دیکھو بیٹا..... کوئی بھی لڑکی کسی ایسے سسرال میں بیاہ کر کہے آئے گی جہاں نہ مرد ہیں نہ عورتیں، ساس اور نانی ساس کے نام پر دو بیٹھوے ہیں۔ یہ ہماری پہچان ہے بیٹا! تم ٹھنڈے دل سے سوچو، اصباح کی نفرت بجا ہے اور پھر تمہارے ہوش سنبھالتے ہی میں نے اور تمہاری ماں نے تمہیں یہی بتایا کہ تمہاری ماں کی کوئی مجبوری تھی۔ تم ہمارے پاس اس کی امانت ہو۔ تم نے ہمیشہ ایک سمجھ دار بچے کی طرح ہماری ہر بات سنی۔ لوگوں نے ہمارے حوالے سے تم سے مذاق کیے باتیں بتائیں مگر تم نے سب کو

خاموش کروا دیا۔ مگر بیٹا اب معاملہ تمہاری ہے اور خود سوچو کہ جب تم کام پر چلے جایا کرو ہمارے ساتھ رہنے میں جھجک محسوس کرے گی۔“ تو کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ چھ آپ کو؟“ وہ نانی کی طرف گھوما۔

”تیری ماں بھی تو ہے وہ دیکھ اللہ کتنے صحیح اسے لے کر آیا ہے جب تجھے ضرورت ہے اس کے فیصلے ہیں بیٹا مان جا اور مجبوری تھی اس کی۔“ حسب عادت اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”مجبوری۔ ایسی کیسی مجبوری کہ بیچ دیا؟“

تو نے خرید لیا ماں اور پھر بھی کہتی رہی کہ امانت وہ سسک پڑا۔

”بیٹائی ہوں..... سب بتاتی ہوں میں مجبوری تھی اس کی..... پھر بتانا کہ قصور کس کا؟ ماں کا..... اس کے حالات کا..... یا پھر تیرے کا؟ شبیو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے آنکھوں ہی آنکھوں میں گرو سے اسے سب بتا اجازت لی۔ ارمان نے دیکھا نانی نے ماں کو ہا اشارہ کیا تھا۔

☆☆☆

فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سر شام ۴ چادریں پہننے کو دل کرتا۔ وہ آنکھوں میں ڈاکا دیے قطرے ڈال کر سر کرسی کی پشت پر اوپر کی ٹکائے آنکھیں موندھے پیٹھی تھی۔ دلشاد نے ناگوں پر گرم چادر ڈالی اور چائے کا پیالہ ساتھ رکھ کر دھرا۔

”چائے پی لے ثروت۔“ وہ وہیں چوکی گئی۔

”وہ بالکل گل ریز جیسا ہے دلشاد..... وقت کہیں پیچھے کو پرگا کر اڑ گیا ہے اور وہاں جا کر ہے جہاں میری نظروں میں گل ریز کا چہرہ ٹھہرا تھا یونہی آنکھیں موندے بولی تھی۔ دلشاد نے غور سے چہرہ دیکھا۔ اس چہرے پر ایک اطمینان تھا، ایک سا جو لم شدہ چیز کے ملنے کے بعد ہوتا ہے۔

سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ہی خاموشی سے لگیں۔

☆☆☆

ماں اسے وہاں لے کر گئی تھی جہاں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسی درگاہ کے عقب دریا کی طرف اترتی میڑھیوں پر بیٹھا اور اس سے جڑے کرداروں کے بارے تھا یہ اس کی زندگی کی کہانی تھی۔ وہ اپنے کے جرم کو جرم نہ کہہ سکا۔ وہ خود اسی وہ تھا۔ اسے اپنے باپ کی بے وفائی کا دکھ کس سے کرتا۔ انہیں تو شاید خبر بھی نہیں کوئی اولاد بھی ہے۔ اسے خود سے بھی جب ہوش سنبھالا تو ماں اور نانی کے چہرے تھے، ان کی آوازیں۔ پھر اس کے دوستہ کہ وہ یتیموں کے ساتھ کیوں رہتا ہے گھر آ کر ماں سے یہ ہی سوال کیا تھا۔ نے بڑے طریقے سے اسے یہی بتایا کہ کرنے والی ماں کسی مجبوری میں اسے امانت کے طور پر چھوڑ کر گئی ہے۔ پھر اس سوال نہ کیا تھا۔ ماں کی محبت نے ہمیشہ لگائے رکھا۔ وہ پڑھنے کے لیے باہر احساس ہوا کہ وہ دونوں یتیموں اپنی رہے ہیں اور وہ بہت اچھے انسان ہیں خود سے عہد کیا کہ اس کی اصلی ماں جو اس کی جو بھی مجبوری رہی ہوگی، اس کی ماں سر پر اپنا مردانہ ہاتھ رکھ کر محبت سے ہے۔ وہی رہے گی۔

مگر اب اپنی ماں کی کہانی سن کر والی سے بھی محبت محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی سزا سے مل چاہے کے والد سے ماں کی ملاقات کے بعد افشا ہوئے تھے۔ جیسے یک دم بنو دھاگے کی ساری گرہیں ٹھنکنے لگی تھیں۔ اتنا مگن تھا کہ اسے اصباح کے آنے کا

”شبو نے اس کی خاطر اپنی زندگی ہی بدل لی، کہاں ہوتا ہے ایسا؟ ہم مکمل لوگوں سے زیادہ تو وہ انسان لگی دلشاد جس کی کوئی پہچان ہی نہیں۔ اور وہ اس کا گرو..... اس کو کیا مل گیا میرے بچے کی خاطر اپنا ٹھکانا بدل کر..... اپنی زندگی بدل کر..... میری مجبوری میں ساتھ دیا میرا۔ اپنی ساری زندگی کی کمائی میرے قدموں میں لایا..... اور میری ساری زندگی کی کمائی کو کیسے سنبھال کر رکھا۔“ وہ اب سیدھی ہو بیٹھی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔

”وہ اب پھر سودا کرے گی تیرے ساتھ..... تجھ سے اپنا پیسہ واپس لے کر ارمان تیرے حوالے کرے گی۔“ دلشاد نے خدشہ ظاہر کیا۔

”امانت..... ہاں شاید۔“ وہ آنکھیں کھولے دلشاد کی بات پر غور کرنے لگی امانت یا گروی..... نہیں شبو ایسی نہیں ہے۔ وہ ایسی ہوتی تو تب مجھے بتا دیتی کہ کوئی میرا بچہ لینے کو تیار نہیں اور وہ خود میری مدد کر رہی ہے۔“ وہ خود کو اب پرسکون رکھنا چاہتی تھی۔

”ہاں..... اور کیا چاہتا تھا اسے کہ تو بھی زندگی میں ملے گی بھی کہ نہیں اور اگر اس کا مقصد سودا ہی ہوتا تو وہ ارمان کی خاطر اپنا طرز زندگی کیوں بدلتی، ناچنے گانے اور ودھائیاں مانگنے کے بجائے ایک عبادت گزار انسان کیوں بن جاتی۔ وہ بس ماں بن گئی ثروت اس نے تیرے بچے کو ماں بن کر پالا.....“ دلشاد نے چائے کا پیالہ لبوں سے لگا لیا۔

”ایک مرد کو میں نے دھتکارا، ایک نے مجھے۔ ایک عورت نے ساری زندگی میرا ساتھ دیا۔ میرے ساتھ اس نے بھی خواب دیکھے، میرے ساتھ وہ بھی برباد ہوئی۔ اس ساری کہانی میں جو نقصان ہوا وہ سب کے حصے میں آیا..... کام آیا تو کون نہ وہ مزد..... نہ میں نہ تو..... ایک یتیم..... رب نے دل بھی کیا چیز پتائی ہے دلشاد..... ہر جسم میں چھڑکتا ہے مگر رب سے تعلق ہر کسی کا الگ ہے۔ میرا تعلق الگ تھا تیرا الگ اور اس شبو کا سب سے ہی الگ..... سب سے ہی انوکھا۔“ ثروت نے آہ بھری۔ دلشاد نے اثبات میں

”ثروت..... تمہارے مہمان آئے ہیں۔“ اور تب ہی اس کی نظریں پھسل کر زعیم کے پیچھے کھڑے لڑکے پر جا چکی تھیں..... وہ ہو بہو مگر یز جیسا تھا۔

”آئی۔“ ثروت کو انتظار تو تھا، وہ پاؤں میں چپل اڑس کر باہر آئی تھی۔ وہ سب آئے تھے۔ زعیم..... ارمان اور شبو۔

”ہم تجھے لینے آئیں ہیں باجی..... ارمان اور اصباح کی منگنی ہے، تیرے بغیر کیسے ہوتی منگنی باجی! وہ مکان میں نے ارمان کے نام لکھ دیا ہے۔ شادی کے بعد اصباح اور ارمان وہیں رہیں گے اور تو بھی وہیں رہے گی اپنے بیٹے بہو کے ساتھ۔“ شبو نے بات شروع کی تھی۔ دلشاد نے ثروت کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں خوف تھا کچھ جتنا ہوا سا احساس تھا۔

دیکھ ثروت..... اکیلی تو میں رہ گئی..... دوستی اور وفائے دھوکا تو مجھے دیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ ثروت نے اس کی نظروں میں بہت تنہا دیکھی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، میرے ساتھ دلشاد بھی ہے اور پھر تو کہاں جائے گی شبو؟“

”ہاں تو دلشاد کو اکیلا تو نہیں چھوڑیں گے ناں..... پہلے ارمان کی ماں اور نانی ساتھ رہتی تھیں اب ماں اور ماسی رہیں گی۔“ شبو کی آنکھیں بھرا گئیں۔ ثروت کے ساتھ ساتھ باہر کھڑی دلشاد کو بھی شبو بہت اونچی مسند پر بیٹھی نظر آئی جہاں شاید کوئی عورت یا مرد نہ پہنچ سکے۔

”میں اور کہاں جاؤں گی، وہیں جہاں سے آئی تھی۔ ہم لوگ بے ٹھکانا ہو کر نہ جی سکتے ہیں باجی نہ مر سکتے ہیں۔ ہماری اپنی ہی دنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے اپنے اصول ہیں۔ اپنا جینا ہے اپنا مرنا ہے۔ سمجھ لے کہ زندگی کے یہ کچھ سال مجھے حکم مجاوری ہوا اور میں مجاوری بن گئی۔ ایک درخواست ہے تیرے آگے، میں ارمان کی ماں ہوں۔ اسے انگلی پکڑ کر چلنا میں نے سکھایا۔ کلمہ پڑھنا سکھایا۔ دودھ کی بوتل پنا کر گود میں لوری سناتے دودھ پلایا۔ بس اس سے ملنے پر پابندی نہ لگانا باجی۔“ وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ ثروت ٹپ

..... وہ بڑی خاموشی سے اس کے پاس آ بیٹھی۔
”آئی ایم سوری ارمان۔“ اس کی آواز پر اس کے چہرے پر ٹکادیں جہاں شرمندگی اور کی محبت کے ملے جلے آثار تھے۔

”تم یہاں کیسے آئی؟ کس کے ساتھ؟“
”آئی شبو کے ساتھ..... آئی میں تمہاری ماں کے ساتھ۔“ وہ میرے سے مسکرائی تھی۔

”مجھے بہت دیر سے سمجھیں آیا ارمان..... کہ ان کی پہچان اس کے جسم سے نہیں، اس کے دل سے ہوتی ہے، اس کی نیت سے ہوتی ہے اور تمہاری بہت عظیم ہیں ارمان..... آئی شبو بہت گریٹ۔“ وہ سر جھکائے بولی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ماں ابھی بڑی سی ر میں ملوف وہیں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ زعیم س بھی ساتھ تھے۔ وہ ثروت کے متعلق سب کچھ س بتا چکی تھیں۔

”ہم لوگ ثروت پھوپھو کو لینے جا رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے منگنی کی رسم ان کے بغیر تو نہیں سکتی۔

ماری اصل ماں تو وہی ہیں ناں ارمان..... اس کے ارمان کے چہرے پر کچھ کھوجنا چاہا۔ وہ پانی کی ہٹوں کو دیکھتا خاموشی سے اثبات میں سر ہلا گیا۔

”میں شاید نہ جاسکوں، دادی کی وجہ سے.....“
”تم چلے جانا..... انہیں خوشی ہوگی کہ ان کا بیٹا انہیں نے آیا ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

سردی بڑھنے لگی تھی۔ ثروت رضائی میں دبی تھی تھی۔ باہر بارش برس رہی تھی۔ دلشاد باورچی نے میں رات کی روٹیاں پکا رہی تھی جب دروازہ سے زور سے بجا۔

”الٹی خیر..... اس وقت کون آ گیا؟“ وہ چولہا کرتی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولنے پر چہرے اسے نظر آئے وہ اس کے لیے انجان ہی تھے ہاں زعیم صاحب کو اس نے پہچان لیا تھا۔

بڑی روشن اور چمکیلی صبح تھی۔ رات اور اصباح کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ اور دلشاد ارمان مکان میں شفٹ ہو چکی تھیں۔ ارمان نے اچھی بند کروادیا تھا۔ اسے خود ایک اچھی جگہ چکی تھی۔ اسی ہزار سیلری اور گاڑی کے ساتھ اچھی اور خوش گوار زندگی گزار سکتے تھے۔ واپس چلی گئی تھیں۔ ثروت اور زعیم نے ہوائے دس لاکھ کی واپسی کی بات کی تھی تب ہنس کر کہا تھا۔

”جو خوشی، ان پچیس سالوں میں مجھے کر ہوئی جو ارمان کی صورت میری گود میں اس کے سامنے دس لاکھ کیا ہیں۔ مجھے گنا باجی..... اور ہاں..... اگلے سال آؤں گی سے دودھائی لینے تیری شبوبن کر اور مٹھائی۔ گی دادی بن کر.....“ ایک طمانیت سی دل میں تھی۔

دلشاد جو ہر دکھ میں اس کے ساتھ تھی، آئی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کے آرام اور سکون ثروت کو خوشی مل رہی تھی۔ اب شاید سب تھا..... زندگی میں ”ایک محبت“ کے لیے وہ اور کئی محبتوں نے مل کر سب سنوار بھی دیا تھا۔ ”جاؤ گل ریز..... تم جہاں بھی ہو..... تمہیں معاف کیا..... میرے ارمان نے تمہیں کیا۔“ کھڑکی میں کھڑی دور آسمان کو دیکھ کر سکون بھری سانس لیتے ہوئے اس نے دل معاف کیا تھا، اور وہاں چارپائی پر لیٹے گل بڑی خاموشی سے نکل گیا تھا۔

رقیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ شاید ہر دعا کے حصار میں تھا، بس ایک معافی کا منتظر

کر پوی تھی۔

”یہ ہاتھ سر پر رکھنے کے لیے شبو..... تسلی دینے کے لیے..... دلاسا دینے کے لیے..... رہ رہ بننے کے لیے..... مجھ سے زیادہ تیرا حق ہے ارمان پر..... اتنی اچھی تربیت تو شاید میں بھی نہ کر سکتی۔“ وہ رونے لگی۔ زعیم اور ارمان خاموشی سے دیکھتے رہے۔

”میں اور گردشادی میں بھی شامل ہوں گے مگر اس کے بعد تمہارا اور دلشاد بہن کا وہاں رہنا ضروری ہے۔ اور ہمارے ساتھ تو نہیں رہ سکتی ناں۔ ایک بار تو نے اپنا بیٹا میرے حوالے کیا تھا، آج میں اپنا بیٹا تیرے حوالے کر کے جا رہی ہوں باجی۔“ وہ سسکی مچی، ثروت نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ایک شرط ہے میری..... اگر دلشاد مانی تو؟“ ”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا ثروت..... بچپن سے لے کر اب تک میرے پاس رشتوں کے نام پر صرف تیری صورت میں ایک نہیں ہی ہے اور تجھ سے جڑے سارے رشتے میرے ہیں..... اب تو میرا جینا مرنا وہاں ہی ہے جہاں تو ہے ثروت۔“ دلشاد نے اندر آ کر اس کی مشکل آسان کی تھی۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

”تو پھر چلیں۔ کل شام کو میں ملازم کو بھیج کر سامان منگوا لوں گا، تم بھی ساتھ آ جانا۔“ زعیم نے ثروت سے صلاح لی۔ ارمان آگے بڑھ کر ثروت سے لپٹ گیا تھا، اسے دیوانہ وار چومتے ہوئے اس نے زعیم کی طرف دیکھتے اثبات میں سر ہلادیا۔

”جو ہوا..... یہ زندگی میں ہونا تھا..... یہ مقدر تھا اور مقدر کا لکھا کوئی ٹال نہیں سکتا..... لیکن ایک بار..... ایک بار تم واپس آ کر مجھ سے بات تو کر تیں ثروت..... تو یہ ٹھوکریں کبھی تمہاری مقدر نہ بنیں۔“ زعیم صرف سوچ سکے۔ بنا کچھ کہے مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”تو سچ کہتی تھی شبو..... تو میرے راستے میں کھڑی تھی یا پھر میرا راستہ ہی تجھ تک تھا۔“ وہ اور دلشاد سامان سیٹنے لگی تھیں۔

شبینہ گل



وقت بدلے گا۔ تیرے رب نے بتایا تو تھا، مجھ سے پوچھنے کی نوبت کیوں آئی تجھ پر کم عقل انسان۔“
حق بابا کے لہجے میں جلال اترتا روح کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر اٹھا اور اسی جھکے سر کے ساتھ اٹھ بیروں پیچھے ہٹا چلا گیا۔ ان کی طرف پیٹھ کر کے جانا معیوب لگتا تھا اسے۔
کتنی عجیب نفسیات ہے نا اس انسان کی۔ متحیر کر دینے والی اتنی بڑی کائنات بنا دینے والے رب کے بنائے ایک عام سے انسان کی چار دانش مندانہ باتیں سن کر انسان عقیدت سے اس قدر جھک جاتا ہے کہ اتنا رب کی کرامات کے آگے جھکے تو شاید ولی بن جائے، مگر نا شکر انسان ہے نا، ولی بننا اسے اپنی جانب نہیں کھینچتا، ولی کا سائل بن کر جھکنا بہت بھاتا ہے۔ ہائے یہ کم عقل انسان۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا، گرمی اب رخصت ہونے کو تھی، دھوپ کی تپش کا بی ہلکی پڑ چکی تھی اور شامیں خوش گوار ہو چلی تھیں۔ شکستہ بیگم برآمدے میں تخت پر پالک پھیلائے بیٹھی تھیں کیونکہ ان کے میاں نے رات کو ہی اتوار کے لیے پالک پتیر بنانے کی فرمائش کر دی تھی۔ اسی وقت ماہ رخ کمرے سے نکلی۔

”امی! میں ذرا بیچہ کی طرف جا رہی ہوں۔“
انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے بولیں۔

”ہاتھ بڑھاؤ، اسے پکڑو، مٹھی بند کرو۔ کھلنے پائے، کچھ پھسلے نہ پائے لیکن دیکھو..... یہ نکل گیا پھسل گیا۔ یہ نہیں رکنا، یہ وقت ہے۔ بیت ہی جاتا ہے، پھر رونا دھونا کیسا؟ اتنی ڈگریاں لے لیں، بیٹنیں بتالیں، چاند پر چلا گیا، آسمان کو چھو لیا، وقت لے دھارے تھے تو ایسا ہونا، وقت لگایا تو یہ سب بھانا، کل بچہ تھا آج جوان ہے، یہ سمجھ میں آتا ہے، میں سمجھ میں آتا تو بس یہ کہ ریت کا ہاتھوں سے سلتا مقدر ہے اور وقت کا گزرتا مقدر ہے، حالات بدلنا مقدر ہے۔ سب کا وقت بدلتا ہے، تیرا بھی



مکان

شع

”ایک منٹ، یہاں آؤ۔“

وہ بالوں کی پن سے دوپٹا سر پر لٹائی ان کے
جب آ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ انہیں سمجھ
نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا کہہ کر وہاں جانے سے
میں، لیکن روکنا بھی ضروری تھا اس لیے انہوں
نے اسے اعتماد میں لینا بہتر سمجھا۔

”دیکھو ماہِ رخ، تم جانتی ہو نا کہ رضیہ تمہارے
بہ رافع کا رشتہ لائی تھی۔“

ماہِ رخ کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا، اس
نے سر جھکا کر ماں سے چہرے کے تاثرات چھپانے
کا ناکام کوشش کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔
وہ نے اس کے بدلنے والے تاثرات کو بہت توجہ سے
نچا۔ وہ ماں تھیں، اس کے جذبات سمجھنے کے لیے
اس کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔

”میں اس رشتے سے انکار کرنا چاہتی ہوں اس
لیے اب تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ اب ربیعہ
سے دوستی بھی ختم کر دوں، کیونکہ ہمارے انکار کے
دو لیے بھی تعلقات پہلے جیسے نہیں رہیں گے۔“

ماہِ رخ کا رنگ سفید پڑ گیا، وہ دکھ سے انہیں
بھتی رہ گئی۔

”انکار..... مگر کیوں امی؟“

اس سے زیادہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی۔ انہوں
نے تیز نگاہوں سے اسے گھورا مگر اس نے نظریں نہیں
ہٹائیں۔ صدمہ اب غصے میں تبدیل ہو رہا تھا۔
اسے ماں پر غصہ آ رہا تھا کیونکہ وہ رافع کے لیے اس
کی پسندیدگی سے واقف تھیں، پھر بھی ایسی بات کر
ہی تھیں۔ وہ اس کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی جبکہ رضیہ اور
ملفہ سکی بہنیں تھیں اور ان میں بہت محبت بھی تھی۔ اس
لیے اسے ماں کی طرف سے انکار کی ایک فیصد بھی امید
میں تھی۔ اسے بری طرح دھچکا لگا، اس کے سوال پر
ملفہ نے بیگم کو جلال آ گیا۔ انہوں نے سختی سے کہا۔

”میں تمہیں وجہ بتانے کی پابند نہیں۔ بس مجھے
رافع تمہارے لیے مناسب نہیں لگتا۔ ایک سے ایک
رشتہ مل سکتا ہے تمہیں۔“ سرو لہجے میں کہہ کر وہ پالک

کے پتے اکٹھے کرنے لگیں۔ ماہِ رخ کو لگا اگر ابھی ان
سے بات نہ کی تو شاید پھر موقع نہ ملے۔ وہ ان کے
پاس ہی بیٹھ گئی۔

”آپ کو وجہ بتانی ہوگی امی۔ رضیہ خالہ آپ کی
سگی بہن ہیں اتنا چاہتی ہیں وہ ہم سب کو، میری
ربیعہ سنیعہ سے گہری دوستی ہے، ابو بھی نذیر انکل کو
پسند کرتے ہیں، رافع بھی اچھا خوش مزاج، خوش
اظہار اور ادب شریف لڑکا ہے، پڑھا لکھا ہے اچھا کمانا ہے
پھر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، کی کیا ہے اس
رشتے میں، مجھے سمجھائیں امی۔“

انہوں نے اسے بری طرح گھورا مگر اس پر کوئی
اثر نہیں ہوا تو وہ بولیں۔

”یہ جو ابھی تمہیں سہیلیاں نظر آ رہی ہیں نا، کل
کو یہی دونوں جب ننڈیں بن جائیں گی تو تمہارے
ہی سینے پر مونگ دگیں گی۔ نذیر بھائی تو ریٹائرمنٹ
کے بعد وہ چھوٹی سی کھوکھے نمادکان چلا کر سمجھتے ہیں
بڑا لاکھوں کا کاروبار کر رہے ہیں، اخراجات کا اصل
بوجھ تو رافع پر ہے۔ نہ ان کے پاس اپنا گھر ہے نہ
پیسہ۔ اوپر سے دو، دو کنواری بہنیں۔ پہلے وہ ان کی
پڑھائیوں پر خرچ کرتا رہے گا پھر ان کی شادیوں پر
خرچ کرے گا۔ بہنوں پر لگا لگا کر بوڑھا ہو جائے گا
تب کہیں جا کر اپنی بیوی جوگا ہو پائے گا۔ آج شادی
کرے گا تو ظاہر ہے کل کو بچہ بھی ہوگا، ان حالات
میں بیوی بچے کے اخراجات کیسے پورے کرے گا۔
جوڑی بھی اس سے شادی کرے گی اس کی ساری
زندگی ترس ترس کر گزرے گی۔ میں سب کچھ جانتے
بو جھتے تمہیں اس جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔ تم ابھی
جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو، اس عمر میں صرف جذبات
ہی اچھی شکلیں بنا بنا کر رکھتے ہیں۔ جب سر پر
پڑتی ہے تو پتا لگتا ہے آٹے دال کا بھاء۔ میں جانتی
ہوں تم چار دن نہیں رہ پاؤ گی ان حالات میں۔“

وہ پالک کے پتے جھک جھک کر گچھا بنانے
لگیں۔ جب کچھ دیر ماہِ رخ کی طرف سے خاموش
رہی تو انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ انہیں عجیب

نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو، جاؤ اندر کمرے میں، کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔“

ماہ رخ ایک جھٹکے سے اٹھی اور چبا چبا کر بولی۔

”ٹھیک ہے، میں وہاں نہیں جانی لیکن ایک

بات آپ جچی سن لیں، ایسی سوچ صرف آپ کی

ہوگی، میں ہرگز ایسا نہیں سوچتی۔ جب لڑکی اپنے ماں

باپ کے گھر میں مالی مسائل سے سمجھوتا کر کے ہنسی

خوشی گزارہ کرتی ہے تو پھر سسرال میں کیوں نہیں؟

ماں بیٹیوں کو سسرال کے لیے قناعت پسندی اور

مہر شکر کیوں نہیں سکھاتیں؟ کیوں چاہتی ہیں کہ ایسا

داماد ملے جو بس ان کی بیٹی پر ہی خرچ کرے جبکہ اپنا بیٹا

ماں بہنوں پر خرچ کرتا بہت اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔ آپ

رائع کے رشتے سے انکار نہیں کریں گی۔“

اس کے آئینہ دکھانے پر انہیں طیش آ گیا، وہ

چھری بچ کر ایک ایک لفظ چبا کر بولیں۔

”میں انکار کروں گی۔“

کمرے کی طرف جاتی ماہ رخ مڑی اور سنجیدگی سے بولی۔

”میں ابو سے بات کروں گی۔“

وہ سر جھٹک کر سارا غصہ پالک پر نکالنے لگیں۔

☆☆☆

عجب شش و پنج میں پڑ گئی تھیں وہ۔ رائف کے

رشتے سے انکار کرتیں تو اس کا کوئی ٹھوس جواز دینا

لازمی تھا۔ محض مالی حالات کی بنا پر انکار کو ان کے

شوہر نیاز صاحب بھی خاطر میں نہ لاتے اور فی الفور

کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی نہیں تھا جس کی خوبیاں گنوا کر

وہ اپنے انکار کی اہمیت جتا سکتیں۔ جلد بازی میں وہ

کوئی مخالفت مول نہیں لیتا چاہتی تھیں لیکن کوئی

ترکیب بچائی نہیں دے رہی تھی۔

روز و شب اسی الجھن میں گزر رہے تھے ایک

روز ان کی دلی مراد برآئی۔ ماہ رخ اور ماہ گل معمول

کے مطابق کالج گئی ہوئی تھیں، شگفتہ بیگم کام کاج نمٹا

کر ذرا دیر کو ستانے بیٹھیں تو ان کی جھٹائی نسیم بیگم آ

گئیں۔ ان کی آمد بھی اچھی سے کا باعث

خاصی مغرور خاتون تھیں اور کم ہی کسی

تھیں۔ ان کے شوہر یعنی نیاز صاحب

بھائی فیاض صاحب کروڑ پتی سیٹھ تھے

گھر والوں کے مزاج میں تلخ کوٹ کوٹ

شگفتہ بیگم ان کی حیثیت کی وجہ سے ان۔

تھیں اور دل ہی دل میں رشک و حسد

رکھتی تھیں۔ لوگوں کے سامنے وہ یہی ظا

کر انہیں کسی کے مال و دولت سے کوڑ

لیکن درحقیقت وہ بھی اندر سے بے جا

عورت تھیں۔ اب یوں اچانک کافی

جھٹائی کو اپنے گھر دیکھ کر وہ اس سوچ میں

آخری بار وہ کب ان کے گھر آئی تھیں

ان کی آمد کا مقصد کھلا تو وہ دنگ رہ گئیں۔

”کلی لپٹی مجھے نہیں آتی شگفتہ،۔“

کہوں گی کہ مجھے ماہ رخ اپنے ایاز۔

ہے۔ تم ہاں کہو تو بات آگے بڑھاؤں اور

دیکھوں کیونکہ رشتے والی نے تو ایک لمبی

ساتھ لفافہ بھر کر لڑکیوں کی تصویریں پکڑا

میں نے سوچا رشتہ داروں کا حق پہلا۔

پہلے تم سے پوچھ لوں کیونکہ نیاز اور فیا

بھائی ہیں۔ دہرے رشتے میں جڑ جا

بات ہے۔“

شگفتہ بیگم کی تو جیسے لائبرائی نکل آئی

سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ نسیم بیگم ان۔

انتخاب کریں گی، لیکن رکھ رکھاؤ بھی کو

یوں ایک دم سے ہاں کہہ کر وہ خود کو

چاہتی تھیں اس لیے خود پر قابو کر کے بولی

”زبے نصیب بھائی آپ کا شکریہ

ماہ رخ کا سوچا، آپ کے خیالات جان

ورنہ آج کل کون رشتوں کا پاس رکھتا ہے

بات یہ ہے کہ ماہ رخ کے لیے رضیہ۔

بیٹے کا کہہ رکھا ہے، دو ایک رشتے اور مج

صاحب سے مشورہ کر کے جواب دوں

تو نکلہ آخری فیصلہ تو بہر حال ان کا ہی ہو گا نا۔“
 رافع کا سن کر نسیم بیگم کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔
 غوت سے بولیں۔

”دیکھو بھی شگفتہ! تم جانتی ہو اللہ کا دیا سب
 مجھ ہے ہمارے پاس۔ اس رافع کے پاس تو اتنا بھی
 بس کہ سال میں ایک بار ہی سہی ہماری ماہ رخ کو کسی
 مجھے ہوٹل میں کھانا کھلا سکے۔ پھر ہم سنگے رشتے دار
 س اور اولاد پر ویسے بھی دھیال کا پہلا حق ہوتا ہے،
 گے تمہاری مرضی لیکن ذرا جلدی جواب دے دینا
 نہ باقی لڑکیاں ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ وہ تو بس
 مجھے تمہارا اور نیاز کا خیال تھا کہ تمہاری دو، دو بیٹیاں
 س تھوڑا بوجھ ہلکا کر دوں۔ آخر اپنے ہی اپنوں کا
 خیال کرتے ہیں۔“

ان کا انداز بھی عجب تھا، گویا لڑکی مانگتے نہیں
 دینے آئی ہوں، میری مرضی کے ریٹ لگا دو تو
 ٹیک ورنہ دکانیں بہت۔ لیکن وہ پیسے والے لوگ
 تھے اور ایسے لوگوں کی باتیں کسے بری لگتی ہیں، سو
 شگفتہ بیگم بھی سب کچھ ٹی کیس اور ان کی خاطر
 رارات کرنے لگیں جس کے لیے وہ بمشکل بیٹھنے پر
 رضی ہوئیں۔ جاتے وقت انہوں نے لاجت سے
 کہا۔

”بھابی ایاز مجھے بھی بہت پیارا ہے، بس رسی
 ی بات چیت کرنی ہے، دیسے تو تجھیں ماہ رخ بس
 آپ ہی کی ہے۔“
 ان کی بات پر نسیم بیگم غوت سے مسکرائیں پھر
 ہر نکل گئیں۔

پھر لڑکیوں اور نیاز صاحب کی گھر واپسی تک
 وہ تو جیسے ہوا کی رتھ پر سوار رہیں۔ دن کے کھانے
 میں انہوں نے ڈال پکائی تھی، خوشی اس قدر سوار ہوئی
 کہ انہوں نے فریزر سے کباب بھی نکال کر تل لیے،
 پھر بڑے اہتمام سے سلا اور راستہ بنایا۔

کھانے کے لوازمات دیکھ کر گھر کے تمام افراد
 حیرت زدہ رہ گئے۔ ایسے اہتمام کے لیے تو انہیں
 مہمان کے آنے کی دعا کرنی پڑی تھی۔ ایسا کیا ہوا

تھا جو ان کا مزاج اس قدر خوش گوار تھا، یہ جاننے کے
 لیے تینوں بے تاب تھے مگر بیٹیاں نہیں جان پائیں
 البتہ ان کے کمرے میں جانے کے بعد شگفتہ بیگم نے
 اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے نیاز صاحب کو سب
 بتا دیا۔ خوش ہونے کے بجائے وہ سوچ میں پڑ گئے۔
 ایاز ان کا سگا بھتیجا تھا اس لیے وہ اسے اچھی طرح
 جانتے تھے، اس کے مزاج میں تکبر اور سہل پسندی
 کے ساتھ ساتھ عیاشی بھی شامل تھی مگر شگفتہ بیگم کو یہ
 سب خامیاں قابل توجہ نہیں لگ رہی تھیں۔

”ارے جانے بھی دیں، شادی سے پہلے
 سب لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں، بعد میں جب ذمہ
 داریاں پڑتی ہیں تو خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔
 ویسے بھی یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں، مرد کی صرف
 کمائی دیکھی جاتی ہے۔“

”لیکن شگفتہ دوسری طرف اگر لڑکے میں کمائی
 کے ساتھ ساتھ شرافت اور سنجیدگی بھی ہو تو پلڑا اسی کا
 بھاری ہوتا ہے، رافع تمہارا سگا بھانجا ہے، تم اس کے
 بارے میں کیوں نہیں سوچ رہیں؟“
 انہوں نے شوہر کی بات پر برا سامنہ بنایا اور
 بولیں۔

”خالی شرافت اور سنجیدگی کا کیا اچار ڈالنا ہے؟
 رافع بس اتنا کماتا ہے کہ بمشکل گھر کا دال ولیہ چلتا
 ہے۔ دو، دو بیٹیں سر پر بیٹھی ہیں انہیں بھی بیاہنا ہے۔
 فیاض بھائی کے گھر تو راج کرے گی ماہ رخ۔ ایاز حیر
 سے اچھا کماتا ہے، اس گھر میں سب اپنا کماتے
 کھاتے ہیں، کوئی کسی پر بوجھ نہیں، فیاض بھائی خود
 اب تک لاکھوں میں کھیلتے ہیں، بیٹیاں بیاہی ہوئی
 ہیں، ان کا لین دین باپ خود پورا کرتا ہے، ہماری ما
 رخ پر کوئی بار نہیں ہوگا۔ رافع سے رشتہ کیا تو اس کے
 حصے کا بوجھ ڈھونے کو ماہ رخ کو بھی نوکری کرنی
 جائے گی اور یہ مجھے گوارا نہیں کہ میری بیٹیاں چا
 پیسے کمانے کو در در کی ٹھوکریں کھانی پھریں۔ بس می
 نے طے کر لیا ہے کل ہی نسیم بھابی کو فون کر کے ہا
 کہہ دوں گی، انہیں جلدی ہے، ظاہر ہے ایاز کو بہ

بیوٹی بکس کا تیار کر

سوہنی ہیرا آئل

OHNI HAIR OIL

گرتے ہوئے بالوں

سے بال کا

بالوں کو مضبوط اور چمک

مردوں، عورتوں، بچوں

کیاں

ہر موسم میں استعمال کر



قیمت - 150/-

سوہنی ہیرا آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے
کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ چھوٹی مقدار میں تیار ہوتا۔
پاکسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاتا۔
بول کی قیمت صرف - 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں۔
کرر جڑی بوٹیوں سے منگوائیں ہر جڑی بوٹی سے منگوائے والے
حساب سے بھجائیں۔

2 بکٹوں کے لئے 350/-

3 بکٹوں کے لئے 500/-

6 بکٹوں کے لئے 1000/-

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل

منی آفٹر بھجئے کے لئے ہمارا ہا

یوٹی بکس، 53- اورنگز ہب مارکیٹ، سیکٹر طور، ایم اے ج

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرا آئل

سے حاصل کریں

یوٹی بکس، 53- اورنگز ہب مارکیٹ، سیکٹر طور، ایم اے ج

کتبہ عمران ڈاٹ انجسٹ، 37- اردو بازار کراچی

فون نمبر: 32735021

ریوں کی پیا سی، خوب صورت ہے، اچھا ملتا ہے،
پڑھا لکھا باشعور لڑکا ہے، اس کے لیے تو ایک سے
ایک لڑکیاں قطار میں لگی ہیں، یہ تو بھابی کی مہربانی کہ
انہوں نے دیور کا بوجھ بانٹنے کا خیال کیا ورنہ آج کل
کے دور میں کون کسی کا خیال کرتا ہے، سب کو بس اپنی
پڑی ہے۔“

نیاز صاحب نے گہری نظروں سے بیوی کو
دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

”ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا، آج کل کے دور
میں کون کسی کا خیال کرتا ہے، سب کو اپنی پڑی ہے،
جیسے تمہیں۔“

انہوں نے غفگی سے شوہر کو دیکھا لیکن اپنی بات
منوانی تھی اس لیے ان سے جھگڑا مول نہیں لے سکتی
تھیں، سو محبت سے بولیں۔

”اچھا چھوڑیں بھی، اپنی اولاد کے لیے ہی
اچھا سوچ رہی ہوں، مجھے بھلا کیا ملتا ہے اس رشتے
سے، بس میری بچی خوش رہے۔“

”آمین۔“

اتنا کہہ کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ شکفتہ
بیگم دل ہی دل میں اگلی منصوبہ بندی کرنے لگیں۔

☆☆☆

رضیہ بیگم کا کوئی بھائی نہیں تھا بس وہ تین بہنیں
تھیں جن میں سب سے بڑی نویدہ، پھر شکفتہ اور پھر
رضیہ بیگم تھیں۔ نویدہ بیگم کی شادی ماجد صاحب سے
ہوئی جو سرکاری محکمے میں اونچی پوسٹ پر فائز تھے۔
یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ان کے لیے اتنا اچھا ملا اسی
کے لیے ان کا مزاج بھی ساتویں آسمان پر رہا کرتا۔ ان
کی تین بیٹیاں تھیں، ہما، حنا اور ردا اور ان تینوں کے
بعد ایک ہی بیٹا صافی۔ نویدہ بیگم تینوں بہنوں میں سب
سے زیادہ خوب صورت تھیں اور ان کے چاروں بچے
ان ہی پر پڑے تھے۔ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت
آئی جاتی ہے کے مصداق وہ سب بھی ایسے ہی تھے،
اس پر مستزاد روپیہ پیسہ بھی کھلا تھا۔ شکفتہ اور رضیہ بیگم
کی قسمت مالی اعتبار سے ذرا ہلکی رہی جس پر رضیہ

رشتوں میں دوریاں اور دراڑیں تب پڑنے سی ہیں جب بہن بھائی رشتوں کو دولت کے ترازو میں تولنے لگتے ہیں۔ ہر شخص ایک سی مالی حیثیت نہیں رکھتا، مال دولت اللہ کی دین ہے لیکن وہ اسی مال دولت سے بندے کو آزما تا بھی ہے۔ رشتوں کی اہمیت کا تعین افراد کی معاشی حیثیت سے ہونے لگے تو دراڑیں بڑھتے بڑھتے شکافوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جنہیں بھرنا، ناممکن ہو جاتا ہے۔

ان کے آپس کے تعلقات بھی اسی امتحان کی نذر ہوئے جب بچے جوان ہوئے اور رشتوں کی بات چلی۔ رضیہ بیگم کو شگفتہ بیگم سے بہت لگاؤ تھا، اس لیے جب رافع نوکری پر لگا تو اس کے رشتے کے لیے ان کے ذہن میں پہلا نام ہی ماہ رخ کا آیا اور انہوں نے پورے حق سے رشتہ ڈال دیا۔ رافع کو ماہ رخ سے محبت نہیں تھی لیکن شادی کے بارے میں وہ جب بھی سوچتا اس کے ذہن میں پہلا نام ماہ رخ کا ہی آتا۔ گو کہ خاندان میں اور بھی کئی لڑکیاں تھیں مگر وہ ماہ رخ کے ہاں گن گنی نہیں تھیں۔

دوسری طرف ماہ رخ بھی اسے پسند کرتی تھی، اسے ان سب گھر والوں سے بے پناہ محبت تھی اور اپنی ماں کا خالہ سے محبت بھر اعلق دیکھ کر وہ مطمئن تھی کہ اس کی شادی رافع سے ہی ہوگی۔ کبھی بھی رضیہ بیگم اور کبھی رابعہ باتوں باتوں میں کوئی ایسی بات کہہ جاتی تھیں جو ماہ رخ کے یقین کو اور پختہ کر دیتی۔ اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا کہ اس کی ماں کی نظریں یوں بدل جائیں گی۔

ماہ رخ کے لیے شگفتہ بیگم کی نظر شروع سے نویدہ بیگم کے صفی پر تھی۔ جب اس کے رشتے آنے شروع ہوئے تو وہ سب سے پہلے ان کے گھر گئیں اور بہت مان سے ماہ رخ اور صفی کے رشتے کی بات کر ڈالی جس پر نویدہ بیگم کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ وہ انتہائی سخت سے بولیں۔

”تم نے ایسا سوچا بھی کیسے شگفتہ، ایک تو ابھی صفی بہت چھوٹا ہے اور پھر ابھی ہا حنا اور داتین بڑی

ہمیشہ شاعر رہیں مگر شگفتہ بیگم کی عادت سی کہ وہ اپنے سے اونچے لوگوں پر نظر رکھتیں اور پھر نی رشتیں۔ شگفتہ بیگم کو اللہ نے بس دو بیٹیوں ماہ رخ اور گل سے نوازا، اسی وجہ سے وہ قسمت سے شادی کی رہنے لگیں جس نے انہیں لاکھ وظیفوں کا وجود بھی اولاد زینہ سے محروم رکھا۔

رضیہ بیگم کے تین بچے تھے، سب سے بڑا رافع کے بعد رابعہ، سدیجہ۔ یہی وجہ تھی کہ شگفتہ بیگم نے بہنوں سے بہت محبت جتا تیں مگر دل ہی دل سے حسد کرتی تھیں کیونکہ دونوں بہنوں کا ایک بیٹا تو تھا۔ نویدہ بیگم کا رتبہ تو بہت اونچا تھا لیکن وہ چھوٹی بہنوں سے کم ہی ملتی تھیں البتہ وہ دو ماہ دو ماہ میں ایک چکر ضرور ان کے گھر کا لگایا کرتی تھیں۔

شگفتہ بیگم کے شوہر نیاز صاحب اور فیاض صاحب دو ہی بھائی تھے، ان کی کوئی بہن نہ تھی۔ اب رضیہ بیگم کی قسمت کہ نیاز صاحب مالی لحاظ سے رافع سے جگہ فیاض صاحب کے پاس اللہ کا دیامال کا خوب تھا۔ میکا ہو یا سسرال، دونوں جگہ شگفتہ بیگم کی قسمت میں کڑھتا ہی لکھا تھا۔ ان کی بہ نسبت رضیہ بیگم سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود سب سے سمجھ دار اور بردبار تھیں۔ انہیں دنیاوی مال سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ بڑی دیرویش صفت تھیں جو ہر حال میں خوش رہتی تھیں اور نذیر صاحب بھی اسی مزاج کے تھے اس لیے ان کی خوب ہی تھی اور زندگی میں سکون ہی سکون تھا۔

نذیر صاحب چار بہن بھائی تھے، سب سے بڑا نگار آقا، ان کے بعد دو بھائی وزیر اور نذیر، اور سے چھوٹی یاسمین۔ نگار آقا قدرتی طور پر نذیر صاحب سے بہت قریب تھیں۔ مالی لحاظ سے وہ بھی سے بلند تھیں مگر انہوں نے کبھی یہ فرق جتایا نہ ہی غرور کیا۔ وہ ان کی سچی خیر خواہ تھیں۔ وزیر صاحب اور یاسمین سے بھی ان کے اچھے تعلقات

تس۔ بی ہیں، اس کی رشتہ سے مردوں بچوں کا دل دکھے گا۔ ویسے بھی ابھی وہ بڑھ رہا ہے پھر نوکری کرے گا اور جب تک لاکھوں نہیں کمانے لگتا اس وقت تک اس کی شادی کے بارے میں مجھے سوچنا بھی نہیں ہے۔ رافع اچھا لڑکا ہے رضیہ نے اس کی بہترین تربیت کی ہے، تم لوگوں کے ہم پلہ بھی ہے، ماہ رخ کے لیے وہی اچھا ہے، رشتے اپنے برابر کے لوگوں میں ہی جتے ہیں۔“

حکفۃ بیگم کو ان سے اس قدر صاف انکار کی بالکل امید نہیں تھی، اس پر مستزاد انہوں نے ان کی مالی حیثیت بھی کس بے رخی سے جتادی۔ ان کا دل بری طرح سے ٹوٹ گیا لیکن عزائم نہیں ٹوٹے۔ اب ماہ رخ کو کسی مال دار گھرانے میں بیابھانا ان کی ضد تھی۔ اسی لیے جب ایاز کا رشتہ آیا تو اس کی تمام خامیاں بھلا کر انہوں نے ہاں کر دی۔ ماہ رخ نے بہتیرا احتجاج کیا مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور یوں نسیم بیگم ایک شام ماہ رخ کو اپنی خاندانی انگوٹھی پہنا کر ایاز کے نام کر گئیں۔ ان کے دو بیٹے تھے ارباز اور ایاز اور دو بیٹیایں تھیں آمنہ اور رمناجو بھائیوں سے بڑی تھیں۔ دونوں کی شادیاں اپنے ماموں اور خالہ کے بیٹوں سے ہوئی تھیں۔ ارباز کا رشتہ بھی انہوں نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کی بیٹی مہرین سے طے کر دیا تھا اور دونوں بیٹوں کی شادی ایک ساتھ کرنے کا ارادہ تھا۔

ماہ رخ کو انگوٹھی پہناتے ہی نسیم بیگم نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی اور ایک ماہ بعد شادی کی تاریخ رکھ دی۔ حکفۃ بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سارا جمع جتھا نکال کر تیار پاں شروع کر دیں لیکن اس سے پہلے ایک مرحلہ باقی تھا۔ رضیہ بیگم کو رافع کے رشتے سے انکار کرنے کا مرحلہ۔ کیونکہ وہ اب تک اس سارے قصے سے انجان تھیں۔

☆☆☆

وہ دن بے حد بوجھل سا طلوع ہوا تھا یا رضیہ بیگم کو ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ صبح آکھ کھلی تو ان پر اس

قدر کی مندی طاری سی کہ اٹھائی ربیعہ اور سنیعہ نے مل کر بتالیا۔ رضیہ بچپن ہی سے عمر کے مطابق کام کاج تھا اور اب وہ ان کے ساتھ ہر کام تھیں۔ ربیعہ ان کا ناشتا کمرے میں د گئی۔ ہمت کر کے وہ انھیں، منہ ہاتھ اور جب برتن رکھنے باورچی خانے ٹھنک کر رہ گئیں۔ مکن صاف ستر اور تھیں۔ انہیں بے اختیار بچیوں پر پیار نے مسکراتے لیوں کے ساتھ کھانا پکا انہوں نے سب کے آنے سے پہلے پکا لیں کیونکہ وہ دونوں پہلے ہی صبح زیادہ کام کر کے گئی تھیں سواب انہیں آ تھا۔

کھانا کھا کر ایک بار پھر ان کی ہونے لگی تو وہ لیٹ گئیں۔ دل میں خیال آ رہا تھا، انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ طرف چکر لگا کر خود ہی جواب مانگ فیصلے کے بعد انہیں مطمئن ہو جانا چاہیے بے چینی دور نہیں ہوئی۔ عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں جب سنیعہ نے آ کر حکفۃ اطلاع دی۔ وہ خوشی خوشی باہر نکلیں برآمدے میں ہی کرسی پر بیٹھی تھیں اور مٹھائی کا ڈبہ رکھا تھا۔ دل خوش گمانی میں ”ارے آپا دیکھیں میں تیار ہوا“ طرف آ رہی تھی، سوچا کتنے دن ملاقات نہیں ہوئی تو چل کر حال احوال اور ساتھ مل کر دونوں بہنیں چائے بھی پی حکفۃ بیگم کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ رضیہ بیگم ان کے تاثرات پر توجہ ہی نہیں تھیں۔ اسی وقت رافع نے گھر میں مزید خوش ہو کر ربیعہ کو آوازیں دینے لگیا ”ارے ربیعہ، جلدی سے چائے آ گیا ہے، کچھ کھانے پینے کا بندوبست

شادی کریں گی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے فیاض بھائی اور نسیم بھائی کے پاس۔ بنگلا، گاڑیاں، روپیہ پیسہ، آرائشی، عیش و عشرت، میری ماہِ رخ تو راج کرے گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ایاز خیر سے انجینئر ہے، لاکھوں کماتا ہے اور اکیلا کھاتا ہے، کسی بہن بھائی کا بوجھ نہیں ہے اس کے سر پر۔ رضیہ جانتی ہو نسیم بھائی نے کہا ہے کہ دونوں بہوؤں کو دس دس تولہ سونا چڑھائیں گی وہ اور حق مہر میں زیور کے ساتھ ساتھ دس لاکھ روپیہ نقد اور دس ہزار ماہوار جیب خرچ بھی مقرر کریں گی۔ سو جو حق مہر ایسا ہے تو بری کا کیا عالم ہوگا۔ لاکھوں کے ملبوسات بنوا رہی ہیں وہ دونوں دہنوں کے لیے۔ تین لاکھ کے تو صرف ماہِ رخ کے عروسی ملبوسات ہیں۔ بھلا کوئی اور اتنا کچھ دے سکتا تھا میری بیٹی کو۔ بڑی بھانگوں والی ہے میری بیٹی۔“ رضیہ بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ ان کی بہنیں مادہ پرست ہیں مگر اس قدر ہیں یہ انہوں نے بھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ رافع ان کی حالت کو غور سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کڑھ بھی رہا تھا۔ ربیعہ نے چائے لاکر میز پر رکھی، کھانے پینے کی چیزیں سجائیں اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔ رافع نے دانت پر دانت جما کر خالہ کو دیکھا اور بولا۔

”ویسے خالہ یہ وہی ایاز ہے نا جس کے ایک وقت میں کئی لڑکیوں سے چکر تھے اور آپ خود اس کی آوارگی کے قصے ہمیں سنائی تھیں۔“

چائے کا پہلا گھونٹ بھرتی ٹکفٹہ بیگم کو اچھو ہوا گیا۔ رضیہ بیگم نے دہلی کر بیٹے کو دیکھا، باورچی خانے میں ان کی باتیں سنتی ربیعہ اور نسیم نے بمشکل ہنسی کنٹرول کی۔ ٹکفٹہ بیگم ضبط کر کے مٹی اڑانے والے انداز میں بولیں۔

”ارے چھوڑو میاں، سب لڑکوں کا شادی سے پہلے ایک آدھ چکر ضرور ہوتا ہے، شادی کے بعد خود ہی سدھ جاتے ہیں۔“

رافع نے بھنویں اچکا کر سر ہلایا اور سر گونڈے والے انداز میں ان کے کان کے پاس جھک کر اوپر

دے میں مل کر چائے پیئیں گے سب۔“

رافع کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تو ٹکفٹہ بیگم مسمی بیٹھی صرف ہوں ہاں میں رضیہ بیگم کی باتوں جواب دے رہی تھیں۔ رافع نے مٹھائی کی اشارہ کر کے پوچھا۔

”ارے واہ خالہ، یہ مٹھائی کس خوشی میں لائی؟“ رضیہ بیگم نے اس کی بات پر اسے گھور کر دیکھا۔ ننگہ وہ اسے ٹھکن کی مٹھائی سمجھ رہی تھیں جبکہ ٹکفٹہ کی تو جیسے اس نے مشکل ہی آسان کر دی، وہ ٹٹ سے بولیں۔

”ہاں یہ مٹھائی بھی کھول کر پلیٹ میں ڈالو، اس کا موقع ہے خیر سے ماہِ رخ کی بات کہی ہو گئی اس کے تباہ کے بیٹے سے، اگلے ماہ شادی ہے۔“ رضیہ بیگم کی خوشی ختم ہو گئی، ماحول میں بوجھل اور آیا، انہیں اپنی چھٹی حس کے اشارے سمجھ میں آئے جو صبح سے انہیں بوجھل کیے ہوئے تھے۔ مٹھائی ڈبے کی طرف بڑھتا رافع کا ہاتھ وہیں ساکت کیا۔ سب سے پہلے اسے ہی ہوش آیا، رضیہ بیگم کا وہ دھلے ٹٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ دکھ کا اظہار کرتیں رافع کو بات سنھائی تھی۔

”ننگہ اسے اپنا اور اپنے گھر والوں کا بھرم کسی بھی نے سے زیادہ عزیز تھا، وہ یہ بھرم کسی قیمت پر گنواں نہ چاہتا تھا۔ اس نے گلا کھٹکا اور گرم جوش سے

”ارے واہ یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے خالہ بہت مبارک ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی طرف رت سے دیکھتی ماں کا ہاتھ دبا کر مضبوط رہنے کا اشارہ دیا اور مزید بولا۔

”تایا کا کون سا بیٹا خالہ، ارباز یا ایاز؟“ ٹکفٹہ بیگم بھی اب سنھیل چکی تھیں اس لیے آرام سے بولیں۔

”ایاز سے بات کہی ہوئی ہے ماہِ رخ کی، ارباز کے لیے تو نسیم بھائی نے اپنی بھانجی مہرین کو نکاہا ہے، اب خیر سے دونوں بھائیوں کی ایک ساتھ

آواز میں بولا۔

”اور اگر وہ نہ سدھر تو؟“

گفٹہ بیگم نے دانت پر دانت جما کر اسے گھورا اور بولیں۔

”اللہ ماں کی دعا کبھی رد نہیں کرتا۔ اللہ سب کو ہدایت دینے والا ہے، ایاز کو بھی ہدایت دے گا۔ دعا میں بڑا اثر ہے، بڑے بڑوں کے دل بدل دیتی ہے۔“

رائف نے ایک بار پھر زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔

چائے پی کر گفٹہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اچھا رضیہ اب چلتی ہوں، دس پندرہ دن بعد شادی کا دعوت نامہ دینے آؤں گی۔ چائے کا شکریہ۔“

رضیہ بیگم انہیں روکتی رہ گئیں مگر وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں رائف، بڑے چھوٹے کی تمیز بھلا بیٹھے ہو، یہ کیا طریقہ تھا خالہ سے بات کرنے کا۔۔۔ ناراض ہو کر گئی ہیں وہ۔ ارے ماہ رخ ان کی بیٹی ہے وہ جس سے چاہیں اس کا رشتہ کریں جسے چاہیں انکار کریں۔ تم کون ہوتے ہو ان کے انکار پر ان سے زبان درازی کرنے والے۔“

ربیعہ، سنیعہ بھی باورچی خانے سے باہر آ گئیں، رائف نے انتہائی سنجیدگی سے انہیں دیکھا اور پاس بٹھا کر بولا۔

”میں نے کوئی بد تمیزی نہیں کی ہے امی۔ ٹھیک ہے ماہ رخ ان کی بیٹی ہے وہ جسے چاہیں اس کا رشتہ دیں مجھے ان کے انکار پر غصہ نہیں۔ مجھے دکھ ہے ان کے اس انداز پر جو انہوں نے انکار کرنے کے لیے اٹھایا۔ وہ فون پر اچھے طریقے سے معذرت کر سکتی تھیں مگر انہوں نے تو بات پکی کر کے مٹھائی منہ پر مارتے ہوئے ہمارے عیب گنوائے ہیں۔ روپیہ پیسہ حق مہر جانکدہ۔ جتایا ہے کہ ہمارے پاس نہیں ہے یہ سب ماہ رخ کو دینے کے لیے۔ انہیں مال دولت

چاہیے لڑکے کے کردار سے انہیں کوئی جتنے لوگوں کی اس منافقانہ سوچ پر افسوس اگر لڑکا بد کردار ہے تو اسے اللہ سدھا رہا وہی اللہ غریب لڑکے کو مال و دولت نہیں جو اللہ ماں کی دعا پر اس کے بد کردار۔ دے سکتا ہے وہی اللہ ماں کی دعا پر اس کے بٹے کو پیسہ نہیں دے سکتا کیا؟“

رائف کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی درست تھی، وہ خاموش ہو گئیں۔ ربیعہ حمایت کی۔

”بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اس بات کا احساس دلانا بہت ضروری تھا رضیہ بیگم نے سراٹھا کر بے بسی۔ دیکھا اور کمزور لہجے میں بولیں۔

”تو ہو گیا کیا انہیں احساس؟“

”اگر آج نہیں بھی ہوا تو کل ضرور میرا یقین ہے۔“ رائف مضبوط لہجے میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

وہ شام سے کمرے میں اندھیرا تھی۔ نہ اس نے دن کا کھانا کھایا تھا نہ کھانے کا کوئی ارادہ تھا۔ بھوک کا احسا کھاتی بھی۔ اس کے اندر تو صرف ایک باقی بچا تھا، بے بسی کا۔ شدید ترین بے بسی حد سے سوا ہوئی تو غصے میں بدل جا غصے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تو ایک بار پھر بے جانی۔ وہ کب سے بے بسی اور غصے کے جھول رہی تھی۔ جب تھک گئی تو رو پڑی۔ آنسو عورت کا سب سے بڑا ہتھیار۔ عورت سے پوچھو کہ شدید ترین بے بسی کر بہایا جانے والا آنسو درحقیقت اس کے لیے یا پسائی کا اعلان ہوتا ہے۔ وہ محبت اسے رلا رہی تھی، وہ عشق بھی نہیں تھا جو تھا، وہ تو بس معصوم سے خوابوں کی چکی کا

ل کر گلاب ہونے سے پہلے ہی جل کر راکھ ہوئی۔

اسے نہ کوئی منانے آیا نہ کھانا کھلانے۔ وہ اب ایک آخری بار کھل کر اسے ماتم منانے کا حق رہے تھے کیونکہ بعد میں اس کے پاس یہ حق بھی مل رہا تھا۔ اسے اپنی بے بسی خون کے آنسو رلا بھی کیونکہ وہ باغی نہیں تھی حالانکہ جو اس کے ساتھ نے جا رہا تھا اس پر تو بغاوت بنتی تھی لیکن وہ اوت کرتی بھی تو کس برتے پر۔ کون تھا جو اس کی اس کے آگے اس کی خاطر ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس میں خود بھی اتنی ہمت نہیں تھی، وہ بس رو سکتی تھی اس پر رو رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے آنسوؤں سے اوت کرنی تھی، ساری زندگی ان سے دشمنی نبھانی، یہ اس کا خود سے عہد تھا۔ اس کا یعنی ماہ رخ نیاز۔

☆☆☆

اس روز اتفاق سے نذیر صاحب ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھے اس لیے رات دیر سے پسپا ہوئی تھی۔ جس وقت وہ گھر آئے بچے کھانا کھا کر سونے جا چکے تھے۔ نذیر صاحب ہمیشہ کھانا گھر پر کھاتے تھے اس لیے رضیہ بیگم ان کا کھانا گرم کر کے کمرے میں لے آئیں۔

”آج شکستہ مٹھائی لے کر آئی تھیں، انہوں نے ماہ رخ کا رشتہ اپنے جیٹھ کے بیٹے سے طے کر دیا ہے۔“

نذیر صاحب کو زوردار جھٹکا لگا۔ کئی لمحوں تک وہ انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے سر جھٹکا اور رومال میں کپٹی روئی نکالتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

”چلو جانے دو، رافع کا نصیب وہاں نہیں ہوگا۔“ رضیہ بیگم نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا پھر سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”نہ جانے رافع کا نصیب کہیں ہے بھی یا نہیں؟“ نوالہ چپاتے ہوئے نذیر صاحب نے انہیں

مٹھی نظروں سے دیکھا اور بولے۔

”مایوسی کفر ہے، بھی رشتہ تلاش کرنا کوئی آسان بات تو نہیں ہے نا، وقت تو لگتا ہے، کوئی بھی اٹھانی پڑتی ہے، ہر کسی کو تو رشتہ پلیٹ میں رکھا نہیں مل جاتا۔ کئی رکھو، شاید ابھی رافع کی شادی کا وقت نہیں آیا، جو وقت اللہ نے مقرر کر رکھا ہے اس وقت پر لڑکی بھی مل جائے گی اور بات بھی بن جائے گی۔ تم بس کوشش جاری رکھو، اور اب کھانا کھاؤ۔“ رضیہ بیگم نے جریز ہوتے ہوئے رومال سے روئی نکالی اور کھانا شروع کر دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد رضیہ بیگم نے سارا احوال کہہ سنایا۔ نذیر صاحب کو یہ سب جان کر بہت دکھ ہوا لیکن وہ صبر سے بولے۔

”اللہ مسبب الاسباب ہے، اس نے ہمارے بیٹے کی جوڑ کی لڑکی بنائی ہوگی بس ملنے میں کچھ دیر ہے۔ اس پر دل برداشتہ نہ ہو۔ تلاش جاری رکھو۔“ رضیہ بیگم سر ہلا کر برتن مسینے لگیں۔

☆☆☆

نذیر صاحب ایک سرکاری ادارے میں وائس پوسٹ پر کام کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گریجویٹ کی رقم سے ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان ڈال لی یوں ان کا دن بھی مصروف گزر جاتا اور کچھ کمائی بھی ہو جاتی۔

رافع نے نذیر صاحب کی گریجویشن کے بعد پرائیویٹ ایجنسی میں داخلہ لیا اور ایک نئی ادارے میں نوکری کر لی تھی۔ پانچ سال کے تجربے اور ایم بی اے کی ڈگری کی بنیاد پر رافع کو اچھی نوکری بھی مل گئی اور اس کے ساتھ بانٹ بھی۔ زندگی اچھی گزرنے لگی۔ ربیعہ بیگم کی ایس کر رہی تھی جب کہ سنیعہ ایئر میں تھی۔ ربیعہ محلے کے چند بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی، اس سے اس کا جیب خرچ نکل آتا تھا۔

سفید پوشی کا بھرم اچھے سے قائم تھا وہ لوگ اس میں خوش تھے لیکن اب رافع کی شادی کی عمر تھی اس

سادی سے یہی دورہ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس گھر میں بھی رشتہ لے کر جائیں وہاں سے صاف انکار ہو جاتا اور اعتراض یہی ہوتا کہ لڑکے پر پورے کنبے کا بار ہے ایسے میں ہماری لڑکی تو گھٹ گھٹ کر بیچے گی اس کا خرچہ ہی پورا نہیں ہو پائے گا، کوئی کرائے کے مکان پر اعتراض کرتا تو کوئی لمبے چوڑے حق مہر کی بات سامنے رکھ دیتا۔ یوں انہیں رشتہ تلاش کرتے کرتے دو سال ہو گئے تھے مگر خاندان یا جاننے والوں میں کہیں بھی بات بن ہی نہیں پار ہی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ماہِ رخ کے بارے میں سوچا کہ سگی بہن شاید ان کی مجبوری کا لحاظ کر لے کر سگی بہن نے زیادہ کڑا اور کر دیا۔

شکستہ بیگم کی اس حرکت کے بعد بھی رضیہ بیگم نے ان کے گھر آنا جانا نہیں چھوڑا مگر انہوں نے پھر بھی بڑا پن نہیں دکھایا اور تعلق ہی توڑ دیا۔ اس کنارہ کشی کی وجہ شرمندگی تھی یا جو بھی، لیکن ان کے اس رویے سے رضیہ بیگم کو بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں تو انہیں سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ ان سے کتنا ہی ہیں اور بیٹیوں کو بھی ان کے گھر نہیں بھیج رہیں لیکن آہستہ آہستہ ان کے بدلتے رویے اور لیے دیے انداز نے انہیں باور کرا دیا کہ وہ مزید تعلق نہیں رکھنا چاہتیں۔ پھر رضیہ بیگم نے بھی بیٹیوں کو سمجھا دیا اور یوں ان کا آپس کا تعلق اتنا کی نذر ہو گیا۔

☆☆☆

کافی شاپ کے پرسکون ماحول میں رافع اپنے دوست جمال کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اس کا بچپن کا دوست اور راز دار تھا۔ شکستہ خالہ کے رویتے سے رافع اس قدر بد دل ہوا تھا کہ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ دفتر میں بھی ہر کام غلط ہو رہا تھا۔

ہاف لیو لے کر وہ دفتر سے نکل کر سیدھا جمال کے پاس گیا جو ان دنوں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یہ کافی شاپ ان دونوں کی پسندیدہ ترین جگہ تھی جہاں وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اپنے اپنے دل کی باتیں ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ اس روز

۵۵۵ پر اردووں بے سعد نیسے۔
نے ماہِ رخ کے رشتے کے حوالے سے
ساری بھڑاس نکال دی، جمال نے سب
شنا پھر بولا۔

”جتنے ماہِ رخ پسند ہے کیا؟“ اس
عجیب انداز سے ہنس بڑا۔

”میرا اس سے کوئی افسیر نہیں۔
اچھی لڑکی ہے، میری کزن ہے، بچپن۔

گھر آنا جانا ہے تو ہم ایک دوسرے
عادات سے واقف ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ

اور میرے گھر والوں کے ساتھ چل سکتی۔
ساتھ میری زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔ میر

پر یکٹیکل بندہ ہوں یار، میرے نزدیک
کوئی حیثیت نہیں، میں شرعی تعلق پر

ہوں۔ میں نے ایک غیر ارادی نگاہ کے
پر دوسری نظر نہیں ڈالی، نہ ہی اس۔

راست مجھ سے کوئی بات کی۔ امی اور خا
محبت تھی، بس اسی لیے خالہ کے انکار پر

انکار کی توجہات پر مزید افسوس ہوا کہ
ہمارے مسائل کا احساس نہیں کر سکیں تو

کیا امید رکھیں۔“

جمال نے سر ہلایا پھر اسے تسلی د
انداز میں بولا،

”چل یار، غم نہ کر، دنیا لڑکیوں سے
ہے، کوئی نہ کوئی تیرے نام کی بھی ہوگی۔“

”ارے یار! جہاں رشتہ لے کر،
جیسے سوالات، تنخواہ کتنی ہے، گھر کا خرچہ

ہے، گھر اپنا ہے یا کرائے کا، حق مہر کتنا
لاچی ہو گئے ہیں آج کل لڑکیوں کے

لڑکی بیاہتے نہیں بیچتے ہیں جیسے۔“
جمال نے اس کی بات پر سر ہلایا

بیٹھ گیا۔

”یہ تو تم صحیح کہہ رہے ہو، اپنا گھر او
تو سب سے پہلی ڈیمانڈ ہے آج کل لڑکی

دیے ہیں، تاسے رہے ہیں، یا ایسوس ہیٹ
میلنگ کر کے بیوی سے معاف کروا لیتے ہیں یا پھر
دے کر کچھ عرصے بعد واپس لے لیتے ہیں۔ کیا وہ یہ
سب نہیں جانتے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے؟“

”بہت سے لوگوں کے ایک غلط کام کرتے
رہنے سے وہ کام جائز نہیں ہو جاتا۔ شاید وہ جانتے نہ
ہوں یا شاید جانتا چاہتے نہ ہوں۔“

شادی سے پہلے شادی سے متعلق تمام ضروری
احکامات سیکھنے چاہئیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم
لوگ باقی تو ہر دنیاوی کام کرنے سے پہلے اس سے
متعلق مکمل معلومات اکٹھی کرتے ہیں، تحقیقات
کرتے ہیں، مگر شادی جیسے اہم فریضے کو اتنا ہلکا لے
لیتے ہیں کہ لاعلمی میں گناہ پر گناہ کیے چلے جاتے ہیں
اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔“

جمال کی باتوں نے اس کے اندر سوچ اور
آگہی کے کئی دروا کر دیے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ
سب گھر والوں کو بٹھا کر یہ تفصیلات بتائے گا، یہ سب
جاننا اس کی بہنوں کے لیے بھی بہت ضروری تھا
کیونکہ اب ان کی بھی شادی کی عمر تھی۔

☆☆☆

”رحمن کے ہوتے ہوئے انسان کے لیے روتا
ہے، بڑا بد نصیب ہے تو۔ تجھے اب بھی سمجھ میں نہیں
آیا، ہر بار تجھے انسان ہی رلاتا ہے اور تو آنسو پونچھ
کر پھر سے اسی کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔ ملتا کیا
ہے؟ پہلے سے زیادہ کک۔ ایک انسان کا ساتھ تیری
ضرورت ہے، اسے مقصد حیات نہ سمجھ، زندگی کا
مقصد اس سے بہت بلند ہے جو تو سوچتا ہے۔ پستی
سے نکل، رب کو تلاش کر۔ رب ملے گا تو سب مل
جائے گا۔ اسے ڈھونڈ اور جب مل جائے تو قدموں
میں بیٹھ جا ایڑیاں رگڑ کر مانگ لے جو مانگتا ہے۔ پر
انسان سے انسان کو نہ مانگ جھلیا۔ جا۔“

حق بابا کی باتیں اس کے دل پر اثر کرتی تھیں
مگر وہ یہ سب کیسے کرے، اس کا طریقہ سمجھ میں نہیں
آتا تھا۔ بس اتنا ہوتا تھا کہ اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا

میرا حال ہی بی بی سو اس۔ سرے کی وجہ سے
نکاح واپس لوٹ گئی تھی۔ میرے خالو نے نکاح
وقت ضد لگالی کہ پانچ لاکھ سے ایک روپیہ کم نہیں
اور پانچ ہزار ماہانہ جیب خرچ بھی۔ اب سوچو
چارے بھی ہماری تمہاری طرح کے مڈل کلاس
تھے جنہوں نے قرضے لے لے کر بیٹوں کو
یا تھا اور ابھی ان کی بڑھائی کے قرضے نہیں
لے تھے کہ شادی کے لیے مزید قرض لینا پڑا۔
میں وہ اتنا روپیہ حق مہر میں کیسے لکھ دیتے، یا اس
لیے مزید قرض اٹھاتے۔“

رائف نے اس کی بات پر افسوس سے سر ہلایا پھر

”میرا خیال ہے ایسے لالچی لوگوں کو یہ سزا دینی
چاہیے کہ جتنا وہ کہیں اتنا لکھ دو اور بعد میں انکار کر دو
میں نہیں دے سکتے۔ پھر بھلا کیا کر لیں گے وہ۔“
رائف جیسا پڑھا لکھا سلجھا ہوا لڑکا ایسی بات کر
تا تو صاف ظاہر تھا کہ وہ معاشرتی رویوں سے
طرح عاجز آ چکا ہے، لیکن اس بات پر اسے
نا بحیثیت دوست جمال کا فرض تھا کہ کہیں وہ
آ کر خود کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لے۔ یہی سوچ کر

نے کہا۔
”ایسا کبھی سوچنا بھی مت رائف، یہ بہت سخت
ہے۔“ میز پر انگلیاں بجاتے رائف نے ہاتھ
کرکھنویں اچکا میں۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ حق مہر دینے کی نیت نہ ہو یا
نکاح کے بعد لڑکا حق مہر دینے سے انکار کر دے تو
اپنی بیوی سے تعلق ہی جائز نہیں ہوتا۔ یہ بہت
بڑا معاملہ ہے۔ شرعی معاملات کو ایزی نہیں لینا
چاہیے۔ اس لیے ایسا سوچنے سے بہتر ہے بندہ نکاح
کرے۔“

رائف الجھ کر بولا۔
”وہ تو ٹھیک ہے مگر یار بہت سے لوگ ایسا
کرتے ہیں، استطاعت رکھنے کے باوجود حق مہر یا تو

پاس نہ کیا تھا، کئی گھنٹے اس کے پاس گزار کر بھی اس کے دل کو قرار نہ ملا تو وہ حق بابا کے پاس چلا گیا مگر ان کی باتوں نے اسے مزید الجھا دیا۔

”اگر انسان کے لیے رونا کسک پیدا کرتا ہے تو اللہ نے انسان کے دل میں دوسرے انسان کی چاہ ہی کیوں ڈالی؟ اگر انسان سے انسان کو مانگنا غلط ہے تو دنیا میں یہ روایت کیوں پڑی؟ اگر انسان کا ساتھ مقصد حیات نہیں تو پھر کیا ہے انسان کا مقصد حیات؟ میں کیوں اتنا بھگ رہا ہوں؟ راستہ کہاں سے ملتا ہے اور درست منزل کا راستہ اتنا پر پیچ کیوں ہوتا ہے؟“

انہی سوچوں میں مدغم وہ آگہی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا لیکن اسے جواب ملا نہ سکون۔ ایک بار اس نے حق بابا سے پوچھا تھا کہ سکون کہاں ملتا ہے۔ حق بابا نے انگلی اس کے سینے پر بجا کر کہا تھا۔

”اگر سکون یہاں نہیں ہے تو پھر کہیں نہیں ملے گا۔“

”اور یہاں سکون کیسے آتا ہے؟“ اس نے پوچھا تو حق بابا نے سرگوٹی کے انداز میں کہا۔

”اسے یہاں جگہ دے دے تو سکون ساتھ ہی چلا آئے گا۔ یہ تیرا دل جس کا گھر ہے اسی کو تو نے باہر نکال رکھا ہے اور مٹی کی مورتیاں سجا کر پوچھتا ہے سکون کہاں سے آئے گا؟ پتا ہے نابت پرستی شرک ہے؟ یہ بھی توبت پرستی ہے جو تو کر رہا ہے۔“

حق بابا کا جملہ اس کے دماغ میں گونجا تو وہ ایک جھٹکے سے سیدھا بیٹھ گیا۔

”مجھے بت پرست نہیں بننا، خدا پرست بننا ہے۔“ خود کلامی کرتا ہوا وہ اٹھا اور بانک اسٹارٹ کر کے گھر کی طرف رخ موڑ دیا۔

☆☆☆

ماہِ رخ کی شادی قریب تھی، رضیہ بیگم بہن کے انتظار میں تھیں کہ ایک روز نیاز صاحب اکیلے آئے اور دروازے پر ہی دعوت نامہ پکڑا گئے۔ رضیہ بیگم کو بے حد افسوس ہوا کہ سگی بہن اپنی بیٹی کی شادی کا

بالکل ویسی ہی دھوم دھام سے ہوئی جیسی بچہ چاہتی تھیں۔ رضیہ بیگم دلہن بنی ماہِ رخ کے سوا ایاز کو حسرت سے دیکھ رہی تھیں کہ کاش اس پر بیٹا ہوتا۔ شگفتہ بیگم البتہ سب سے زیادہ خوشی کے مارے ان کے تو گویا پیر ہی زمین تک رہے تھے۔ وہ سب مہمانوں کو فراموش اپنی سمدھن اور جھٹائی نسیم بیگم کے ارد گرد و وار چکر کاٹ رہی تھیں جو ماہِ رخ اور مہرین ہو رہی تھیں۔

کھانے کے بعد ماہِ رخ کی رخصتی کا اٹھا۔ اس کے چہرے کی اداسی کسی کی نگاہوں نہیں تھی۔ شگفتہ بیگم اسے میکے سے جدائی کا نا کر خود کو تسلی دے رہی تھیں جبکہ صرف رضیہ اس کی کاجل بھری آنکھوں کا شکوہ بڑھ سکتی ماں سے رسمی انداز میں مل کر وہ الگ ہو گئی لیکن رضیہ بیگم کے گلے لگی تو اپنے آنسوؤں پر قابو نہ سکی اور اس قدر روئی کہ ان سے بھی اپنے آ کرنا محال ہو گیا۔ انہی اشک بھری آنکھوں شکوے اور حسرت سموئے وہ ایاز کے ساتھ ہو گئی۔

☆☆☆

”یار جمال، ہمیشہ یہی سنتے تھے کہ لڑکے گھر گھر جا کر لڑکیوں کو قربانی کے جانوروں کے پر رکھتے ہیں پھر ان میں معمولی معمولی خامیاں رو کر دیتے ہیں، لڑکیاں ماڈل کی طرح سچ ٹرائی سجا کر مہمانوں کے آگے کیٹ واک کر اپنی عزت نفس بچاتی ہیں اور ہر روز نئے سرے اس پریڈ کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ لڑکا مظلومیت کی یہ داستان میں کئی اخباروں اور میں مضامین اور افسانوں کی صورت پڑھ چکا آج جب خود اس افسانے کا کردار بنا ہوا دیکھتا ہوں کہ معاملہ تو بالکل برعکس ہے۔ لڑکی والے نیاں گھر سجاے بیٹھے ہیں، اپنی بیٹا

اسوں سے سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

رضیہ بیگم کو ایک روز عیشہ کا خیال آیا، وہ نگار کی چھوٹی نند صائمہ کی بیٹی تھی اور اس کی بڑی بہن رشتہ پکا ہو چکا تھا، ظاہری سی بات تھی کہ صائمہ اس کا رشتہ تلاش کرتی۔ رضیہ بیگم کو وہ بچی بہت اگلی تھی اس لیے انہوں نے نند سے مشورہ کیا اور اس کے ساتھ ہی رافع کا رشتہ لے کر چلی گئیں۔ صائمہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور رافع کے رشتہ خاصی خوشی کا بھی اظہار کیا۔ رضیہ بیگم وہاں سے امید لیے واپس آ گئیں۔

پھر ایک روز ایک عجیب سی بات ہوئی، نگار شرمندہ سی ان کے گھر چلی آئیں۔ صائمہ نے صائمہ انکار کہلا دیا تھا۔ نذیر صاحب اپنی بہن سے بہ محبت کرتے تھے اور ان دونوں کی آپس میں خوب تھی اسی لیے انہوں نے اپنی جھگی کا صاف اظہار ڈالا۔

”بھئی آپا، آپ نے کچھ تو قائل کیا انہیں۔“ نگار آہمزید شرمندہ ہو گئیں۔

”نذیر، کیا کہوں اب، جب ہم رشتہ لے گئے تھے تب تو بہت خوش ہو گئی تھی۔ لگ رہا تھا۔ دن ہی ہامی بھر لے گی، لیکن اس کے انکار نے تو حیران ہی کر دیا۔ بڑے غرور سے کہنے لگی کہ وہ عید کے لیے کسی مال دار گھرانے کا رشتہ چاہتی ہے کیونکہ شامل کے سسرال والے بھی کافی امیر ہیں، ایسے ایک بہن کی مڈل کلاس گھرانے میں جائے تو دونوں کے تعلقات پر بھی فرق پڑتا ہے اور خاندان میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ خود اس کے اپنے کے حالات تو بہت ہی گئے گزرے ہیں، بس اس گھر اپنا ہے تو اس بات پر بہت غرور ہے اسے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ، میں یہی سوچ کر چپ ہو گئی اس کی بیٹی ہے، اس کی مرضی۔ وہ تو میری بڑی صالحہ نے مجھے اصل بات بتائی کہ صائمہ کے کسی د کے سسرال عزیز نے عیشہ کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ

میں لے لیا۔ میں جو زیادہ اس کے دے دے وہی لے جائے۔ یہاں میں نے لڑکا ہوتے ہوئے بھی بار بار ہار ہونے کا درد سہا ہے۔ سب کہتے ہیں لڑکیاں نازک جذبات رکھتی ہیں، لیکن جمال، رد ہونے کا دکھ تو مرد کو بھی اسی طرح اندر سے توڑ دیتا ہے۔ یہ معاشرہ جسے مردوں کا معاشرہ کہا جاتا ہے، میں تو جب سے اس رشتہ مہم میں شامل ہوا ہوں مجھے یہ عورت کا معاشرہ لگنے لگا ہے۔ مجھے کسی بھی گھر میں کسی مرد نے نہیں ہمیشہ عورت نے رد کیا۔ وہی عورت جو اپنے رد کیے جانے پر داویلا مچا دیتی ہے۔“

اس روز پھر ایک جگہ رشتے کی بات چلانے پر ان ہی پرانی توجیہات کو بنیاد بنا کر اسے رد کیا گیا تھا، وہ دل میں اسی کا دکھ لیے وہ جمال کے سامنے بیٹھا جلے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہا تھا۔ جمال نے اس کی بات پر تائید میں سر ہلایا اور بولا،

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج کل واقعی لڑکی والوں کے غرے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مڈل کلاس گھروں میں لڑکوں پر گھریلو اخراجات کی ذمہ داری جلد پڑ جاتی ہے اور اس چکر میں وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر پاتے، جبکہ لڑکیاں آگے سے آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زیادہ بڑھ لکھ کر لڑکیوں کے معیار اونچے ہو جاتے ہیں اور وہ گریجویٹ لڑکے کو تو گھاس بھی نہیں ڈالتیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ شادی کوئی ملٹی پیشنل کمپنی کی جاب نہیں کہ زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی کو سب سے اونچی پوسٹ مل جائے۔ اسی نام نہاد معیار کی جنگ میں میرے اپنے خاندان کی کئی لڑکیوں کی عمریں تیس سال سے تجاوز کر چکی ہیں لیکن وہ سمجھوتا کرنے پر راضی نہیں۔ اچھے رشتے کے انتظار میں پڑھتے پڑھتے بی ایچ ڈی تک کر چکی ہیں، اب انہیں گریجویٹ لڑکا کہاں بھائے گا اور اگر کسی طرح وہ راضی ہو بھی جائیں تب بھی اس لڑکے سے ان کی دہنی ہم آہنگی نہیں ہو پائے گی۔“

جمال کی باتیں سو فیصد درست تھیں، رافع

تھے اس کے رنگ ڈھنگ بدل گئے ہیں۔“

رضیہ بیگم اور نذیر صاحب نے سر جھکالیا۔ ان سب باتوں کے بعد اور وہ بھی کیا جاتا ہے سر اٹھانے کو۔ رات کو رافع خلاف معمول کافی دیر سے گھر آیا۔ کافی تھکا ہوا اور مضطرب سا لگ رہا تھا۔ رضیہ بیگم اس وقت نذیر صاحب کے کپڑے استری کر رہی تھیں۔ عادت سے مجبور ہو کر انہوں نے نگار بیگم والی ساری بات بھی اسے کہہ سنائی۔ ماں کی زبانی یہ تفصیلات سن کر رافع کا دل مزید بر ہوا۔

”امی بس آپ میری شادی کا خیال دل سے نکال دیں، ربیعہ، سنیعہ کی بات چلائیں، ان دونوں کی شادیاں ہو جائیں تب میں اپنا سوچوں گا۔“
کپڑوں پر استری سے کریز جمائی رضیہ بیگم کا ہاتھ رکھا،

”ارے ارے، یہ کیسی بات کی تم نے؟ ربیعہ سنیعہ تم سے کافی چھوٹی ہیں، پہلے تمہارا حق بنتا ہے، نویدہ کی طرح بیٹیوں کی شادیوں کے چکر میں ہم تمہیں بوڑھا نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی ابھی وہ دونوں پڑھ رہی ہیں، اس دوران اگر کوئی رشتہ آیا بھی تو ہم بس بات کہی کریں گے۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے ویسے میں ربیعہ کو رخصت کر دیں لیکن تمہیں چھوڑ کر پہلے ان دونوں کی بھی نہیں کریں گے۔“

انہوں نے پلگ نکال کر کپڑے بینگر میں لٹکائے تو رافع نے بینگر ان کے ہاتھ سے لے کر الماری میں لٹکا دیا اور ان کا ہاتھ تمام کر اپنے پاس بٹھایا۔

”دیکھیں امی، ہر جگہ سے ایک ہی بات سننے کو ملتی ہے، اپنا گھر، بہنوں کی ذمہ داری، حق مہر، وغیرہ وغیرہ۔ دیکھا جائے تو لڑکی والوں کے مطالبات کچھ غلط بھی نہیں۔ ہر کوئی اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتا ہے، اس کے مستقبل کی ضمانت مانگتا ہے۔ ویسے بھی ہم کب تک کرائے کے گھروں میں دھکے کھاتے رہیں

۔۔۔ یہ سب سنا کر وہ۔۔۔ اس لیے میرے میں دینی چلا جاؤں، پیسہ کما کر آپ بھیجوں، پہلے ہم اپنا گھر خریدیں، اس کے رشتے بھی مل جائیں گے اور جہیز بری سب سے ہو جائے گا۔“ وہ اس کی بات سن کر، گھٹکیں۔

”ارے۔۔۔ مگر۔۔۔“

”اگر مگر کچھ نہیں امی۔ جمشید کو جا آپ، وہی جو کالج میں میرے ساتھ گریجویشن کر کے دینی چلا گیا تھا، پھر وہیں اتنی اچھا کما رہا ہے کہ اپنے ماں باپ کو بھی پروہیں بلالیا۔ کافی عرصے سے میں دینی کے لیے آن لائن درخواستیں بھیج رہا ہوں سے کوئی جواب نہیں آتا۔ آج اسی سلسلے جمشید سے بات ہوئی تو اس نے مجھے مشورہ پاکستان میں بیٹھ کر درخواستیں دینے سے ہوتا، وہاں کمپنی والے بالمشافہ آ۔ امیدواروں کو آن لائن امیدواروں پر تر ہیں۔ اسی لیے اس نے مجھے کہا کہ میں چند وزٹ ویزے پر دینی آ جاؤں تو میری جا۔ لگ سکتی ہے۔ ویزا وہ مجھے بھیج دے گا، ٹکٹ بھی بطور قرض دے گا، مجھے بس پاسپورٹ ہے۔“

رضیہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اسے کھینچ کر اندر اپنے کمرے میں لے گئی صاحب کو اس کے ارادوں سے آگاہ کہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے، مارے؟ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا، تم اتنی دور گے۔“

”یہ ضروری ہے ابو، حالات آپ۔۔۔ ہیں۔“ نذیر صاحب نے گہری نظروں دیکھا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

”راغ بیٹا! کیا ہوا ہے ہمارے حالات کو؟ بیٹا! اللہ کا شکر ادا کرو، عزت سے رہ رہے ہیں، پیٹ بھر کر کھانپ رہے ہیں، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا پڑتا، اور کیا چاہیے۔ اپنی خواہشات کو محدود رکھو، انہیں ضروریات کا درجہ مت دو، زندگی مشکل ہو جائے گی۔“ راغ جربز ہوا۔

”آپ کی بات بالکل بجا ہے ابولیکن بہت سی چیزیں اب بھی ایسی ہیں جو خواہشات کے زمرے میں نہیں آتیں۔ ہر ماہ ہزاروں روپیہ کرائے کی مد میں نکل جاتا ہے، گھر اپنا ہو تو یہی روپیہ دوسری اہم ضروریات پوری کرنے میں خرچ کیا جاسکتا ہے اور بچت بھی کی جاسکتی ہے۔ دیکھیں ابو، ابھی ربیعہ، سدیہ کی شادیاں کرنی ہیں انہیں جہیز دینا ہے شادی کے سو اخراجات ہوتے ہیں، میرے رشتے پر سب جگہ یہی سننے کو ملتا ہے کہ اپنا گھر نہیں ہے۔ اس بات کی اہمیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے ابو۔ یہاں رہ کر اس محدود تنخواہ میں اپنا گھر بنانا تو بالکل ناممکن ہے۔ پلیز مجھے اجازت دے دیں۔ میں آپ لوگوں کو ہر سال بڑھنے والے کرائے اور در در بھٹکنے کی پریشانی سے آزاد کر کے اپنی چھت دینا چاہتا ہوں۔ یہ آپ لوگوں کی آرام کرنے کی عمر ہے ابو۔“

بیٹے جوان ہو جائیں اور کمانے لگیں تو والدین کو بہت سے فیصلوں کا اختیار انہیں سونپنا پڑتا ہے۔ نذیر صاحب نے بھی یہی سوچ کر اس کی تائید کی۔ ”تم بھی ٹھیک کہتے ہو، چلو، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“ راغ اور رضیہ بیگم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

☆☆☆

وقت کا تو کام ہے گزرتا، سو وہ گزرا اور خوب تیزی سے گزرا۔ راغ کے دوست نے اسے ویزے کے ساتھ ساتھ بطور قرض ٹکٹ کے ملنے بھی بھجوا دیے۔ وہ دفتر سے چند دن کی چھٹی لے کر مدنی چلا گیا اور چند دن بعد ملازمت حاصل کر کے ہی لوٹا۔ کچھ جمشید کے تعلقات اور کچھ راغ کی اپنی ذہانت

اور صلاحیتیں کام آئیں اور اسے تین جگہوں بیک وقت آفر ملی، جن میں سے ایک سب بہترین آفر اس نے جمشید کے مشورے سے قبول لی۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے چند دنوں میں اس نے کچھ ضروری شاپنگ کی، دفتر میں آ جمع کروایا اور کمپنی کی طرف سے ویزا موصول ہوا ہی اپنے پیاروں کو الوداع کہہ کر مدنی روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے سے اداسی سی چھا گئی حالانکہ بہت کم کوسال کا تھا لیکن ہر فرد کے وجود کی اپنی ہوتی ہے۔ سارا سارا دن ماں بیٹیاں بیٹھ کر راز باتیں کرتیں، گزرا وقت یاد کر کے بھی ہنستیں تو اسے یاد کر کے رو پڑتیں۔

☆☆☆

راغ کی پہلی کمائی انہیں موصول ہوئی تو، بیگم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ نذیر صاحب نے کو کال ملا کر موبائل انہیں پکڑا دیا۔ انہوں نے ج جلدی آنسو پونچھے اور بات کرنے لگیں، ”راغ، کیسا ہے میرا بچہ، ہاں ہاں مل گئے، رب کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے مجھے اس قابل بنانا ٹھیک تو ہونا۔ کھانا ٹھیک سے کھاتے ہو یا نہیں؟ کون بناتا ہے کھانا؟ کپڑے کون دھوتا ہے؟ کون کون کرتا ہے؟ نیند پوری لیتے ہو یا نہیں؟“

انہوں نے ایک ہی سانس میں اتنے سوال ڈالے۔ دوسری طرف راغ ہنس ہنس کر دہرا ہو گیا۔ ”ارے میری پیاری امی، آپ بالکل فکا کریں، یہاں بھی آپ کے جیسی امی ہیں، میرا ذرکتی ہیں؟ کھانا بھی کھاتا ہوں سوتا بھی ہوں۔“ رضیہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا،

”ارے، کس کی امی بھی؟“

”امی میں جمشید کے اپارٹمنٹ میں ہی ا کمرے میں کرائے پر رہ رہا ہوں۔ اس کا اپارٹمنٹ کافی بڑا ہے اور یہاں اس کے والدین بھی رہتے ہیں۔ میں اسی کمرے میں اپنا کھانا خود بناتا ہوں کپڑے دھونے کے لیے لائڈری میں آٹومیک

لو یہی اسی رہا۔

☆☆☆

رائع کو دعی گئے چھ ماہ ہو چکے تھے اپنے دوست کے ذریعے لپ ٹاپ بھجوایا۔ والوں سے اسکا ٹپ پر روبرو بات کر سکے۔ ان کے اندر تو گویا زندگی کی نئی رقع دوڑ گئی۔ یوں چھ ماہ بعد انہوں نے رائع کو اور رائع نے دیکھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ رضیہ بیگم اسے بے اختیار رو پڑیں۔

”رائع، میرا بچہ، اتنا کمزور ہو گیا، سارے خود کرنے پڑتے ہیں، اپنے ہاتھ سے نجانہ کھانا پکا تا ہے، ٹھیک سے کچھ بھی نہیں سکتا ہوگا بولتی رہیں روتی رہیں، ماحول آبدیدہ ہو گیا، سنیعہ سے بھی آنسو روکنا محال ہو گیا۔

”ارے امی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ مٹر نہیں ہوا اسماٹ ہو گیا ہوں۔ آپ نے تو کھلا میری توند نکالی ہوئی تھی، یہ دیکھیں۔“ ارے کھڑے ہو کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور ہنسا۔ ”دیکھیں گیس اسماٹ ہو گیا ہوں او میرے کھانے پکانے کی تو آپ بالکل فکر نہ کیا تیار مسالوں کے سب پکٹ لا کر رکھے ہو۔ میں نے اور ان پر لکھی ترکیبیں دیکھ دیکھ کر اب سے زیادہ اچھا کھانا پکا لیتا ہوں میں، یہ دیکھ اس نے دراز کھول کر سامنے کی جو تمام پانچ کھانوں کے تیار مسالوں کے پیکیٹس سے بھر دی تھی۔

”اچھا۔ یعنی اب ہماری یاد تو آپ کو آ۔ ہی نہیں، آپ کے سب کام جو آسان ہو۔ سنیعہ نے نرہ شے انداز میں کہا تو وہ لب کھلنے لگا آنسو روکنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر زور سے ہنسا۔ ”بھئی، ماں بہنیں صرف کام کاج کے نہیں ہوتیں کہ کام پڑنے پر ہی ان کی یاد آ۔ دونوں کو تو میں ویسے بھی ہر وقت یاد کرتا ہوں، اہ آپ کیوں خاموش ہیں، کچھ بولیں نا۔“

ہے، وہ سو پرے دوسرا ہے جسے چھخت ہنس کرنی پڑنی اور استری بھی خود ہی کرتا ہوں۔ امی یہاں اپنے سب کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں لیکن کوئی مسئلہ نہیں میں بہت خوش ہوں۔ باہر تو رہائش بہت مہنگی ہے میں انور ڈنہیں کر سکتا، جیشید نے کافی رعایت کی ہے۔“

”اللہ اس کا بھلا کرے۔ اوہ بیٹا اب اپنے ابو اور بہنوں سے بھی بات کر لو ورنہ بیلنس ختم ہو جائے گا۔ پھر نجانے کب بات ہو۔“ پھر وہ ابو سے ہی بات کر رہا تھا کہ کارڈ ختم ہو گیا اور ربیعہ سنیعہ منہ بسورنے لگیں۔

”چلو کوئی بات نہیں بیٹا، ایک ہفتے بعد دوبارہ کارڈ ڈالو اگر تم دونوں کی بات کروادوں گا۔“ نذیر صاحب نے پیار سے کہا تو دونوں مسکرا دیں۔

”اچھا بھئی وہ رائع کہہ رہا تھا کہ میری پہلی تنخواہ میں سے ربیعہ سنیعہ کو ایک ایک ہزار روپیہ دے دینا، دونوں اپنی پسند کی کوئی چیز خرید لیں۔“ رضیہ بیگم نے ان کی بات پر ہنسنے لگیں۔ ”ایک ایک ہزار روپیہ؟ کیوں خیریت تو ہے؟ عید آئی ہے کیا؟“ نذیر صاحب نے غلطی سے انہیں گھورا۔

”ارے کیا ہو گیا ہے اتنی بھی کنجوس نہ ہو، ان کے بھائی کی پہلی پہلی کمائی ہے، دے دو، بچیاں ہیں۔ رائع نے خود کہا ہے۔“ وہ سوچ میں پڑ گئیں تو ربیعہ نے خود انہیں ٹوک دیا۔

”ارے نہیں ابو، بھائی وہاں اتنی محنت کر رہے ہیں، ہمیں ایک ایک روپیہ جمع کرنا ہے۔ آپ ایسا کریں پانچ پانچ سو دے دیں۔“

بیٹی کی بات پر وہ دونوں مسکرا دیے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی اپنی اولاد کو قناعت کا درس دیا تھا اس لیے وہ پیسہ دیکھ کر بھی آپے سے باہر نہیں ہوئی تھیں حالانکہ رائع نے اچھی خاصی بڑی رقم بھجوائی تھی لیکن رضیہ بیگم جس طرح پہلے گھر چلائی تھیں اب بھی بجٹ

صاحب جو بس محویت سے اسے دیکھ رہے تھے اس کے پکارنے پر چوٹے۔

”ہاں بیٹا میں بس تم لوگوں کو سن رہا ہوں اور سائنس کے کرشمے دیکھ رہا ہوں کہ کیسی کیسی چیزیں ایجاد کر ڈالیں، فاصلوں کا احساس ہی مٹ جاتا ہے، یوں لگ رہا ہے جیسے تم واقعی سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہو۔“ وہ مسکرا دیا۔ رضیہ بیگم بولیں۔

”کیا خاک سائنس کے کرشمے، بے شک سامنے بیٹھا لگ رہا ہے پر ہم اسے چھو تو نہیں سکتے نا، اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا تو نہیں کھلا سکتے نا۔“

وہ کہتے کہتے پھر سے روہاںسی ہو گئیں تو نذیر صاحب نے ٹوکا۔

”بیٹا ہزاروں میل دور پردیس میں بیٹھا ہے، تمہاری خاطر وقت نکال کر آیا بیٹھا ہے اور تم رو رو کر اسے پریشان کیے جا رہی ہو۔ قابو کرو اپنے جذبات۔“

ان کی بات درست تھی، رضیہ بیگم نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنا اور اس کا دھیان بٹانے کو خاندان کی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ پھر تو رافع روز رات کو سونے سے پہلے آن لائن آتا اور ان سب سے ڈھیروں باتیں کرتا۔ لکھی کا احساس جوان سب کو بے کل رکھتا تھا اس میں کافی کمی آنے لگی۔ رضیہ بیگم بھی نیند کی گولیاں کھائے بغیر ہی اکلوتے بیٹے کی صورت نگاہوں میں بسا کر خوش خوش سو جاتیں۔

☆☆☆

رافع پاکستان میں تھا تو جب بھی اداس ہوتا، حق بابا کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ ان سے اس کی شناسائی یونی اچانک ہوئی تھی جب ایک روز وہ اداس سارنگوں پر بانک دوڑاتا پھر رہا تھا تو بے دھیانی میں سڑک پار کرتے حق بابا سے بانک کھراتے بکھراتے پہنچی۔ اس نے ان سے معذرت کی مگر ان کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ وہ بولے۔

”معذرت مجھ سے نہیں اپنے آپ سے کر لڑکے۔ تیری عائب دماغی سے جو نقصان تیری جوانی

کو پہنچ سکتا ہے، اس کا جواب دے سکے گا رب نو جوانوں کو بس رب سے شکوے کرنے آتے کبھی سوچا ہے کہ اگر اس نے تمہاری کوتاہ کو شوارہ کھول لیا تو اپنے یہ شکوے لے کر کہا چھپاؤ گے؟“

وہ حیرت زدہ سا ان کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا کیسے جانتے تھے کہ وہ کیا سوچ رہا تھا، انہیں تھا کہ وہ اس وقت کس دینی کرب سے گزر رہا دل ہی دل میں رب سے کتنا شکوہ کناں مسکرائے اور بولے۔

”زیادہ نہ سوچا کر، وہاں اس مفید درخت کے نیچے میرا گھر ہے۔ کبھی میرے مہرا کر آنا۔“

اس نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں گا کوئی گھر نظر نہیں آیا۔ وہ سرکاری زمین بھی جہا کبھی کوئی پارک ہوا کرتا تھا اسی لیے جا بجا لگے ہوئے تھے جن میں سے زیادہ تر ٹنڈ ویران ہو چکے تھے۔ حق بابا اس کی متلاشی نگاہیں پلٹتا دیکھ کر کہنے۔

”اینٹ گارے کے گھر میں نہیں رہتا! حساب دینا پڑتا ہے، میں نہیں دے سکتا۔ دے سکتا تو چھی نہیں دے سکتا۔ کوئی حصار جواب نہیں دے سکتا۔ سارے حساب ہیں! پاس۔ سارے جواب مانگے گا وہ۔“

خود کلامی کرتے حق بابا اس طرف چلا جہاں انہوں نے اپنے گھر کی نشان دہی کی تھی اگلے قدموں واپس آگیا۔ وہ اس کی حق بابا ملاقات تھی اور ان کا نام حق بابا بھی اس نے تھا کیونکہ جب اس نے ان سے نام پوچھا تو جواب نے ایک بار پھر اسے تحیر کر دیا۔ وہ خود انداز میں بولے۔

”میرا کوئی نام نہیں، نام نہیں رکھتا میر بھی نہیں رکھنا چاہتا میں اپنے پاس۔ نام بھی پڑ سے غرور آتا ہے انسان میں۔ میں بس انا

اس کے بعد یوں ہوا کہ وہ جب بھی پریشان یا اداس ہوتا، قدم خود بخود ان کی طرف کھینچے چلے جاتے۔ ان کی باتیں بھی اس کی سمجھ میں آتیں بھی سر پر سے گزر جاتیں لیکن اسے سکون ضرور مل جاتا تھا۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کے پاس بیٹھ کر شاید اسی طرح سکون کا احساس ہوتا ہے، یا شاید اللہ ان کی قربت کے انعام میں بندے کو سکون عطا کر دیتے ہیں۔ ایک بار رافع نے انہیں کچھ پیے دینے چاہے تو وہ بکڑ گئے۔

”میں پیسوں کا بھکاری نہیں ہوں، پیسہ دکھا کر مجھے مت خرید۔ میں اس کی نظر کرم کا بھکاری ہوں۔ مجھے دنیا نہیں چاہیے، مال نہیں چاہیے۔“
پھر رافع نے بھی انہیں کچھ دینے کی غلطی نہیں کی۔ لیکن جب سے وہ دینی گیا تھا انہیں بہت یاد کرتا تھا۔ گوکہ وہاں اس کی زندگی بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی لیکن پھر بھی جب وہ رات کو سوئے لیٹتا تو ایک بار ضرور انہیں یاد کرتا۔ دینی جانے سے چند دن پہلے وہ ان سے خاص طور پر ملنے گیا تھا۔ تب انہوں نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

”پیسہ کمانے کی دھن میں عاقبت کمانا مت بھول جانا۔ انسان کی جیب میں بھرا پیسہ اس جیب کے نیچے چھپے دل کو اپنے سائے سے میلا کر دیتا ہے۔ تیری کمائی پر پہلا حق اللہ کا ہے، وہ جگہ جگہ بندوں کے اندر چھپ کر تجھے ملے گا، آزمائے گا۔“

دینی میں اسے کوئی بھی پریشان شخص ملتا وہ اس کی مدد ضرور کرتا۔ دیار غیر میں لاکھوں پر دوپٹی لاکھوں پریشانوں میں گھرے ملتے ہیں لیکن نفسا نفسی کسی کو کسی کی مدد نہیں کرنے دیتی۔ رافع ڈھونڈ کر ایسے لوگوں کی مدد کرتا اور ہر بار ایسا کرنے پر اسے اس قدر سکون ملتا کہ وہ خود حیران رہ جاتا۔ وہ گھر اور خاندان سے دور بیٹھا تھا، انہیں یاد بھی کرتا تھا مگر کبھی بھی دوسرے لڑکوں کی طرح فرسٹریشن کا شکار نہیں ہوا۔ اپنے اندر کے اس سکون پر وہ خود بھی بہت حیران ہوتا

، جس کی اسے سنا نہ اسے بابا کی دعا ملتی۔
ان سے رخصت لے کر جب وہ بانک پر بیٹھا
اوپر کی آواز سے بولے تھے،
”رب تجھے پر سکون رکھے۔“

☆☆☆

ایک روز ہمت کر کے رضیہ بیگم نے رفیعہ کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور فون کر کے رافع کے ر. کی بات کر ڈالی۔ رفیعہ ان کی خالہ زاد بہن تھیں کافی عرصے بعد یاہ رخ کی شادی میں رفیعہ سے کی ملاقات ہوئی تھی۔ رفیعہ کی بیٹی ثمن انہیں پسند آ گئی۔ خلاف توقع رفیعہ نے کافی خوشی کا اظہار رافع کے حوالے سے ضروری تفصیلات پوچھیں مشورہ کر کے جواب دے کر کہہ کر فون بند کر دیا۔ کئی ہفتے بیت گئے ان کا کوئی جوابی فون نہ آیا۔ نا صاحب کا گمان تھا کہ وہ شاید ان کے فون کا انتظار رہی ہوں اس لیے ان کے کہنے پر رضیہ بیگم نے بار بار پھر رفیعہ کو فون کر لیا لیکن اس بار ان کا انداز بدلا ہوا پایا۔

”جیسی رضیہ، صاف بات کروں گی، میرے بٹے نے کہا ہے کہ رافع اگر ثمن کو اپنے ساتھ دینی رکھے گا تو ٹھیک ہے ورنہ ہماری طرف سے انکار سمجھو۔ بھی دیکھو تم خود سوچو، لڑکا سالہا سال گزارے اور لڑکی یہاں تنہا، کہاں کا انصاف۔ بھی۔“ رضیہ پٹا کھینچ پھر محل سے بولیں۔
”تمہاری بات ٹھیک ہے رفیعہ مگر رافع کی اتنی تنخواہ نہیں کہ وہ بیوی کو ساتھ رکھ سکے۔ ویسے اس نے ساری عمر وہاں نہیں گزارنی، گھر بن جا۔ اور کچھ رقم کاروبار کے لیے جوڑ لے تو مستقل طور واپس آ جائے گا۔ بس چند سال کی قربانی ہوگی۔“

دوسری طرف چند لمحے کو خاموشی چھا گئی پھر اسی بے مروتی سے بولیں۔

”دیکھو رضیہ، بات یہ ہے کہ ہماری ثمن بھائیوں کی اکلونی لاڈلی بہن ہے اور اپنے ابا کی

نگار بہن، ہی سہیے نرے ایک کام
تمہیں، بھول گئیں شاید۔۔۔“

انہوں نے اچھے سے اس کی طرف دیکھا
اپنی یادداشت پر زور ڈالنے کی کوشش کرنے لگا
پھر یکایک ماتھا پیٹ کر نہیں دیں۔

”لو بھلا، میں واقعی بھول گئی، معاذ
زینت اصل میں بھائی بھابی کے کچھ مسائل
الجمہ۔“ وہ کہتے کہتے رکیں، پھر دوبارہ ماتھا
ڈالا۔

”ارے کیا ہوا بہن، اب کیا یاد آ گیا، کہ
ہے بھائی بھابی کا؟“

نگار بیگم کو بھائی بھابی کا مسئلہ کیا یاد آیا
جیسے دل کی کلی کل اٹھی، وہ بے اختیار ہنس پڑی
”زینب کے رشتے کی بات کر رہی ہو،
انہوں نے ہنس کر کہا تو زینت نے حیرت سے
دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں بہن، کیا ہے کوئی رشتہ نظر میں؟“
”ارے بچہ بھل میں ڈھنڈورا شہر میں
بہن، میرے بھائی بھابی اپنے بیٹے کے رشتے
لیے پریشان ہیں اور تم اپنی بیٹی کے۔۔۔ تو کیا
لوگوں کو آپس میں ملوادوں۔ وہ بھی مادہ پرست
کی منافقت سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور تم
جوڑا جھیز مانگنے والوں سے عاجز ہو۔ تم دونوں
بہتر ایک دوسرے کا دکھ کون سمجھے گا بھلا۔“
بھانج سے بات کر کے تمہیں بتائی ہوں۔“

زینت تو جیسے، کل ہی اٹھی۔ ان کا مہ
کہ وہ بھی سفید پوش لوگ تھے جن کے پار
دینے کے لیے شان دار جھیز نہیں تھا۔ ان
زینب ایم اے کر رہی تھی، خوش شکل، خوش
سکھڑا کی تھی۔ اگلے ہی دن وہ رضیہ بیگم کی طر
گئیں اور زینت اور زینب کے حوالے سے
تفصیل بتا کر پرانی پڑوسن کی حیثیت سے
ضمانت بھی دی۔ رضیہ بیگم نے نذیر صاحب
مشورہ کیا اور یوں بات بات کچھ آگے بڑھی،

بے حد لاڈلی ہے۔ وہ تو اسے دیکھے بغیر ایک بل ہی
نہیں گزار سکتے، پھر اتنی دور اسلام آباد کیسے بیاہ
دیں۔ من میں جان ہے اس کے باپ اور بھائیوں
کی۔ اس لیے میری طرف سے انکار مجھو۔“

رضیہ بیگم کو ان کے منافقانہ رویے پر شدید غصہ
آیا مگر وہ ضبط کر کے ٹھہر ٹھہر کر بولیں۔

”ابا اور بھائی من کو دوسرے شہر بھیج کر ایک بل
نہیں گزار سکتے تو اگر وہ دعویٰ چلی جاتی تب کیسے
سائنس آتی انہیں؟ پوچھ کر بتانا ضرور۔ اللہ حافظ۔“

کال بند کر گئے انہوں نے موبائل نذیر
صاحب کے ہاتھ پر شیخ دیا اور حل کر بولیں۔

”رائف بالکل صحیح کرتا ہے جو ایسے منافقوں کو
آئینہ دکھا دیتا ہے، یہ لوگ اسی قابل ہوتے ہیں، میں
بلا وجہ اسے غلط کہتی رہی۔ غضب خدا کا، لڑکی کا رشتہ
دوسرے شہر سے آئے تو ماں باپ کی سائنس رکھنے لگتی
ہے، دوسرے ملک سے آئے تو سو بسم اللہ۔ ہونہ۔“

نذیر صاحب تاسف سے دام میں بائیں سر
ہلانے لگے۔ اس حد تک تو ریفہ کی بات بھی درست
تھی کہ لڑکی بیٹا شوہر کے تہا سالوں گزارتی کچھ سمجھتی
نہیں مگر یہی بات کسی اور طریقے سے بھی کی جاسکتی
تھی۔ رضیہ بیگم نے اپنا سمجھ کر انہیں بتا دیا تھا کہ پانچ
چھ سال بعد رائف نے مستقل پاکستان ہی شفٹ ہو
جانا ہے۔ ایسے میں اپنے ہی انہوں کا ساتھ دیتے
ہیں۔ شروع کے چند سال رائف کی بیوی قربانی دیتی تو
آگے کی زندگی سکون سے دونوں نے اکٹھے ہی
گزارنی تھی۔ مگر ان کا موقف کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا
اور یہی بات انہیں دکھ دیتی۔

☆☆☆

نگار بیگم اپنی بہو کے ساتھ مل کر گھر کی تفصیلی
صفائیوں میں مصروف تھیں جب ان کی پڑوسن
زینت ان سے ملنے چلی آئی۔

”سناؤ زینت، کیسے آنا ہوا؟ گھر میں سب
کیسے ہیں؟“ زینت اپنا بیٹھ میز پر رکھتے ہوئے
بولی۔

خاندانوں کی آپس میں ملاقاتیں ہوتیں، رافع کی تصویر انہیں دکھائی گئی۔ انہیں رافع بھی پسند آیا اور لڑکی کے پاکستان میں رہنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ رافع سے اسکا پ پر بھی ان سب کی بات کر دائی گئی اور پھر سادگی سے مٹھائی کھلا کر رشتہ پکا کر دیا گیا۔

رافع کو دینی گئے سال ہونے والا تھا، شادی اس سے اگلے سال اس کی وطن واپسی پر ہی ہونی تھی اس لیے زینب کے گھر والوں کے پاس تیاری کے لیے کافی وقت تھا۔

☆☆☆

گھفۃ بیگم کے گھر سے مٹھائی آئی تھی، ماہِ رخ کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رضیہ بیگم سب گلے شکوے بھلا کر ڈھیروں تحائف لیے مبارک باد دینے لگیں۔ اس قدر تحائف اور ان کی مالیت دیکھ کر گھفۃ بیگم کو احساس ہوا کہ ان کی بہن کے حالات بدل گئے ہیں۔ ماہِ رخ ماں کے پاس رہنے آئی ہوئی تھی، وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ وہ تو اس پرانی ماہِ رخ کی پرچھائیں لگ رہی تھی۔ سیاسی مائل زرد رنگت، مرجھایا چہرہ اور مسکراہٹ سے عاری لب۔ بیٹے کی ماں بن کر اس کے چہرے کو جیسا ہونا چاہیے تھا وہ دیکھی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔

”ماہِ رخ بیٹی، تم خوش تو ہونا۔“ گھفۃ بیگم چائے پانی کا انتظام کرنے کمرے سے نکلیں تو انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔ ماہِ رخ چند لمحے انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر ایک مجروح سی مسکان اس کے لبوں کو چھو کر معدوم ہو گئی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے خالہ۔“ اسی وقت ماہِ جل اندر آ گئی تو وہ خاموش ہو گئیں اور دل میں لکک لیے کچھ دیر بیٹھ کر گھر آ گئیں۔

ایک ہفتے بعد رضیہ کی شادی تھی۔ اسی طرح ڈھیروں قیمتی تحائف کے ساتھ جب وہ صائمہ سے ملیں تو اس نے بھی رک کر ان تحائف کی تعداد کو دیکھ کر مالیت کا اندازہ لگایا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ رضیہ

بیگم سب کے رویوں کو دیکھ بھی رہی تھیں اور طرح سمجھ بھی رہی تھیں۔ جو نقاب کچھ عرصہ چہروں سے اترے تھے وہ پھر سے چڑھتے نظر آتے تھے مگر اب وہ سنبھل چکی تھیں، سب کو پہچان چکا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب انہیں ضرورت نہیں رہی تھی۔ ان کا وقت بدل رہا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا، رضیہ بیگم کا غزین پکڑ۔ صاحب کے ساتھ بیٹی شادی کے اخراجات کا لگا رہی تھیں۔ پاس ہی ربیعہ سعیدہ بیٹی مل جل کے سامان کی فہرست بنات رہی تھیں۔ اسی وقت بجا، نذیر صاحب نے دیکھا تو موبائل بیگم کی بڑھایا،

”رافع کی ساس کا فون ہے۔“

رضیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کال اٹھائی رسی بات چیت کے بعد انہوں نے دعا پو زینت ہچکچاتے ہوئے بولیں۔

”رضیہ بہن، اب تو خیر ہے شادی کی تیاری شروع ہو گئی ہیں، تو میں چاہ رہی تھی کہ ہم کچھ معاملات پر بات کر لیں۔“

”جی جی ضرور زینت بہن آپ کہیں رہی ہوں۔“

”وہ دراصل آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ ہماری زینب کا حق مہر کتنا لکھیں گے؟“

اس سوال پر رضیہ بیگم کے چہرے کے تانے بچھ عجیب سے ہو گئے، انہوں نے ابھی نگاہوں اور شوہر کو دیکھا تو انہوں نے موبائل ان کے ہاتھ لے کر پیکر آ کر نہ دیا۔ رضیہ بیگم بولیں۔

”آ..... آپ بتائیے آپ لوگ کتنا رکھوانا چاہتے ہیں؟“ نذیر صاحب کے کان کو

ہو گئے۔ ربیعہ سعیدہ بھی انہی کو دیکھنے لگیں۔ د طرف زینت کچھ رکیں، ہکلائیں، کچھ سرگوشیاں آواز آئی، یوں جیسے پیچھے سے کوئی انہیں سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھیں اصل میں بات یہ ہے کہ گھر تو

کا اپنا ہے نہیں، ورنہ ہم اس میں حصہ لکھواتے۔ اب چونکہ آپ لوگ ہمیں اچھے لگے ہیں اور بات بھی ملے ہوئی ہے تو پھر یوں کیجیے کہ حق مہر میں پانچ لاکھ روپیہ نقد اور دس تو لے سونا لکھوادیں۔“

”اصل میں وہ، میری بڑی نند آئی ہوئی ہیں آسٹریلیا سے، وہ بھند ہیں کہ ہمارے ہاں اتنا ہی حق مہر لکھوایا جاتا ہے، اس لیے میں نے آپ سے بات کی۔ وہ ہماری بڑی ہیں، ان کی کوئی بات ہم رد نہیں کرتے، وہی ہمارے سارے فیصلے کرتی ہیں۔ دیکھیں نا ہم نے زینب کو دعویٰ بھیجنے کی شرط نہیں رکھی، ہمیں احساس ہے کہ رافع آپ کا ایک ہی کمانے والا ہے۔ جو کچھ وہ کمائے گا اس پر اس کی بیوی کا بھی برابر کا حق ہوگا، شادی تو ایک بار ہی ہوتی ہے، ابھی خرچ کر لے پھر کما تارہے گا ساری عمر پڑی ہے۔“

نذیر صاحب کے چہرے پر چھائے سخت تاثرات دیکھ کر رضیہ بیگم نے بھی دو ٹوک انداز اپنایا۔ ”دیکھیں زینت بہن، ہم بہو کے لیے پانچ تو لے سونا بنوا میں گے، وہی اس کا حق مہر ہوگا، اس سے زیادہ تو ہم کچھ نہیں کر سکتے، البتہ آپ کے کہنے پر میں رافع سے بات کروں گی، اگر وہ راضی ہوا تو ایک لاکھ روپیہ بھی ساتھ کر دیں گے۔“

دوسری طرف خاموشی چھا گئی، پھر فون زینت کی نند نے تمام لیا اور سلام دعا کے بعد وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولیں۔

”ارے بہن آپ تو بہت ہی کم ظرفی دکھا رہی ہیں، اکلوتا بیٹا ہے آپ کا، اچھا کما تا ہے، سب کچھ اسی کا تو ہے، پھر اسی کی بیوی کو دینے میں کیسی عار۔ میرا بھی ایک ہی بیٹا ہے اور میں اسی کی شادی کے سلسلے میں پاکستان آئی ہوئی ہوں، ہم نے اپنی بہو کے لیے دس تو لے سونا اور دس لاکھ نقد لکھا ہے حق مہر میں، اور آٹھ ہزار ماہوار جیب خرچ بھی۔“

رضیہ بیگم کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے زمانے بھر کی مٹھاس اپنے لہجے میں مسکراہٹ نہائی معصومیت سے کہا۔

”اچھا اچھا، ماشاء اللہ، اللہ نصیب آمین۔ بہن آپ کے پاس اللہ کا دیا ہوا تاج پھر آپ نے اپنے بیٹے کے لیے اپنی بیٹی کی بی بی، ماشاء اللہ زینب خوب صورت بیٹی ہے سب بھی۔ یہ لاکھوں روپیہ آپ کی اپنی بیٹی کی قسم ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ آپ کے بھائی کا بوج ہو جاتا۔ ان کے سارے فیصلے تو ویسے بھی آ کر کرتی ہیں۔“

نذیر صاحب نے اس بات پر چونک دیکھا اور محظوظ ہونے والے انداز میں مسکرا دوسری طرف سے جواب دینے کے بجائے منقطع کر دیا گیا۔ اب آخری فیصلہ رافع کا ہو لیکن وہ تو سنتے ہی ہتھ سے اکڑ گیا۔

”نہیں امی بالکل نہیں، ایسا نہیں ہو سکا قدر لاپچی لوگوں میں، میں نے رشتہ نہیں کر لوگ انکار کر دیں۔ یہ لوگ تو بیٹی کی قیمت ہیں ہمارے مسائل کا انہیں کوئی احساس ہو اس وقت تو وہ لوگ ہمارے بڑے خیر خواہ ہ تھے۔ رشتہ ملے ہو گیا تو انہوں نے بھی پہلی پا نہیں امی، آپ انہیں صاف منع کر دیں اور مائیں تو رشتہ ختم کر دیں۔“

یوں وہ قصہ بھی ختم ہو گیا۔ نگار بیگم کو ز اس حرکت کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ انہوں سے پچیس سال پرانا تعلق توڑ ڈالا۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑا۔ اس دوران کئی رونما ہوئے، کئی افراد کی زندگیوں میں بڑی تبدیلی آئیں۔ زینب کی پھپھو نے کسی رشتے والی کو تو دے کر اس کا رشتہ کسی اونچے گھرانے میں کر اپنی مرضی کا حق مہر، جیب خرچ، زیور اور جائے حصہ سب کچھ لکھوا کر دم لیا۔ عیشہ کی جڑوار پیدا ہوئیں اور ربیعہ کالی ایسی ہی مکمل ہو گیا۔ کاملاً ہنوز اپنی جگہ قائم تھا، رافع کے رشتے بھی بات نہیں بن پائی۔ اب انہوں نے ر

لیے بھی ملنے جلنے والوں میں رشتے کا کہہ دیا لیکن رافع کے کہنے پر نذیر صاحب نے ربیعہ کو یونیورسٹی میں داخلہ بھی دلوا دیا۔ اس کا موقف تھا کہ رشتے کی آس میں گھر بیٹھ کر دہنی دباؤ کا شکار ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ خود کو کسی مثبت راہ پر مصروف رکھے۔ رافع کی نوکری کے دو سال مکمل ہوئے اور وہ ایک ماہ کے لیے پاکستان آ گیا۔ ان کے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر گئیں۔ آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس کمپنی میں وہ ملازمت کر رہا تھا، وہاں اس کا دو سال کا معاہدہ تھا۔ اسے ایک دوسری کمپنی سے آفر آئی تھی اور یہاں آنے سے پہلے وہ تمام ضروری کارروائیاں مکمل کر کے آیا تھا اس کی کمپنی میں اس کی تنخواہ بھی زیادہ تھی اور بہتر سہولیات بھی تھیں۔ وہ ماں باپ اور بہنوں کے لیے بے تحاشا سامان لایا جسے دیکھ کر رضیہ بیگم خوب ناراض ہوئیں۔

”ارے کیا ضرورت تھی اتنا پیسہ برباد کرنے کی باگل، اتنا سارا سامان، لاکھوں لگا دیا رافع کچھ تو عقل گرتا۔“

رافع ان کی باتوں اور بدحواسی پر ہنستا رہا۔ دو سال بعد انہوں کے درمیان بیٹھ کر اس کی کیفیات ناقابل بیان تھیں۔ جب اس کی ٹکٹ بک ہوئی تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ گھر والوں کے لیے پورا دینی ہی خرید ڈالے۔ پھر بھی اس نے بہت احتیاط سے پیسہ خرچ کیا۔ رضیہ بیگم نے اس کی پسند کے کھانے بنائے اور ربیعہ سیدہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے پانی پینے کے لیے بھی اٹھنے نہ دیں، سب کچھ اسے وہیں لاکر دے دیں۔ نذیر صاحب بازار جا کر ڈھیروں پھل اور مٹھائیاں خرید لائے۔ رافع ان محبتوں پر پھولے نہ سارہا تھا۔ رات کو جب ربیعہ سیدہ، رافع کے زبردستی کہنے پر سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئیں تب اس نے امی ابو کو اپنے کمرے میں بلایا اور ربن سے بندھے تین خوب صورت ڈبے ان کے سامنے رکھ دیے۔

”یہ کیا ہے بیٹا؟“

انہوں نے حیرت سے پوچھا، وہ مسکرا بولا کچھ نہیں۔ رضیہ بیگم نے حیران ہوتے ڈبے کھولے تو ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ان نظروں کے سامنے بے حد حسین اور نازک کے زیورات تھے۔ وہ دنگ رہ گئیں، پھر نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ہنس دیا۔

”امی دینی میں پاکستان کی نسبت سونا نقد سستا بھی ہے اور کیرٹ بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔ بایس کیرٹ کا زیور بہت مہنگا ہے اور ملاوٹ کا بھی بہت ہے۔ میں نے وہاں کچھ اپنے اخرا میں سے بھی بچت کی تھی۔ جمشید کے کہنے پر میرے تین سیٹ لے لیے۔ ایک ایک ربیعہ اور سیدہ ایک آپ کی بہو کا۔“

اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا تو وہ نہیں کہ ان کی ہنسی میں اشکوں کی آمیزش تھی۔ نے بے حد محبت سے ان کے چہرے پر برستی دھواؤں کا منظر دیکھا۔ نذیر صاحب نے کندھ کی صورت اسے خاموش داد دی۔ وہ مسکرا د

اگلے روز وہ حق بابا سے ملنے جا پہنچا اور اپنی کامیابی کی داستان سنائی۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی ان کا جواب اس کی توقع کے برعکس تھا۔

”تو پیسے کو کامیابی سمجھتا ہے؟ چاہ و حشم زندگی سمجھتا ہے؟ عیش و عشرت کو روح کی تسکین ہے؟ کیا تو فرعون ہے؟ اگر تو سمجھتا ہے کہ تیرا قد نکل آیا اور تو چار پیسے کمانے لگا ہے تو تو جوان غرق کر دیے تو نے زندگی کے اٹھائیس سال ابھی تجھ پر عرفان نہیں اترنا۔ ابھی تو بچہ ہے۔“ بابا کی ان باتوں پر اندر تک مل گیا۔

☆☆☆

زندگی خوب صورت لگنے لگی، سارے م خود بخود سلجھتے جا رہے تھے، دھیرے دھیرے ساری پریشانیاں تحلیل ہو رہی تھیں۔ رافع کی واپسی کے چار ماہ بعد ایک روز ربیعہ کے لیے صاحب کے ایک دوست کے توسط سے احسن کا

آیا۔ نذیر صاحب نے رافع سے مشورہ کیا اور مناسب جہان بین کے بعد رشتہ پکا کر دیا۔ اس روز رافع اسکا پ پر آیا تو بہت خوش تھا۔

”ابو، یہ تو طے ہے کہ ربیعہ کی رخصتی ہم اپنے ذاتی گھر سے کریں گے۔ آپ ان لوگوں سے ایک سال کی مہلت مانگ لیں، کیونکہ میں بھی سال سے پہلے تو نہیں آسکتا۔ اس کمپنی سے مجھے ہر سال ایک ماہ کی چھٹی تنخواہ اور کنکٹ سمیت ملا کرے گی۔ اس لیے میں اپنی بہن کی رخصتی کے لیے خود آؤں گا۔ دو ماہ کے اندر اندر ان شاء اللہ ہم اپنا گھر بھی خرید لیں گے اور اگلے چند ماہ میں ربیعہ کا جہیز بھی تیار ہو جائے گا۔“

”ان شاء اللہ۔“ ان سب کے منہ سے زیر لب نکلا۔

پھر وقت جیسے پر لگا کر اڑا۔ دو ماہ بعد انہوں نے ایک اچھے علاقے میں اپنا گھر خرید لیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد رضیہ بیگم نے ربیعہ کے جہیز کی تیاری شروع کر دی کیونکہ وقت بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ ربیعہ کے سسرال والے بہت سلجھے ہوئے لوگ تھے، ان کی طرف سے کوئی بے جا تقاضا نہیں کیا گیا۔ ربیعہ کا ماسٹرز زادہ اور تھا، احسن نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی تعلیم ضرور مکمل کروائے گا۔ رضیہ بیگم نے رافع کے رشتے کے معاملات میں لڑکی والوں سے جتنے دکھ اٹھائے تھے وہ کچھ بھی بھولی نہیں تھیں اور اسی لیے انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ بیٹیوں کے سسرالیوں پر حق مہر کے حوالے سے کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گی۔ اسی وجہ سے انہوں نے حق مہر کی بابت ربیعہ کی ساس زبیدہ بیگم کے پوچھنے پر صاف کہہ دیا۔

”بہن، آپ اپنی خوشی سے اپنی بہو کو جتنا بھی زیور چڑھائیں گی بس وہی اس کا حق مہر لکھوادیں۔ ہمارا کوئی مطالبہ نہیں، چاہے آپ ایک تولہ ہی بنا دیں چاہے کچھ نہ بنائیں۔“ زبیدہ بیگم ان کی بات پر ہنس پڑیں۔

”ارے یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، یہ تو

لڑکی کا حق ہوتا ہے۔ ہم نے بڑی بہو کو سات تو۔ زیور چڑھایا تھا، ربیعہ کو بھی اتنا ہی دیں گے۔ آپ شکر یہ کہ آپ ہمارے ساتھ اتنا تعاون کر رہی ورنہ لڑکی والے تو منہ پھاڑ کر حق مہر لکھواتے ہیں۔ رضیہ بیگم نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا بولیں۔

”نہیں بہن، نہ ہمیں ایسا کوئی لالچ ہے ہماری اولاد مادہ پرست ہے۔ یہ رشتہ صرف لڑکا لڑکی کے نہیں بلکہ دو خاندانوں کے بیچ بنتا ہے۔ آدوسرے کا احساس کر کے چلیں گے تو یہی زندگی ہوگی۔“ زبیدہ بیگم ان کے خیالات سے بے متاثر ہوئیں۔

☆☆☆

نگار بیگم کو ربیعہ کی بات پکی ہونے کی مٹھاڈی تو وہ اگلے دن ہی دوڑی چلی آئیں۔ ربیعہ کے ڈھیروں تحائف بھی لائیں اور اس سے مل ڈھیروں دعائیں الگ دیں۔ رضیہ بیگم نے رشتے ساری تفصیلات انہیں بتائیں تو وہ بہت خوش ہو پھر کچھ دیر بعد بولیں۔

”انسان سمجھتا ہے وہ عقل کل ہے، اپنی طر سے بڑے حکمرانہ فیصلے کرتا ہے لیکن جب ربیعہ فیصلہ صادر ہوتا ہے تو بندہ منہ کی کھاتا ہے۔ جانڈی عیہ کے ساتھ کیا ہوا؟“ ان کے الفاظ کی سنجھ نے رضیہ بیگم کو ہلادیا، وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں ”کیا ہوا ہے آپا؟ اللہ خیر کرے۔“

”صائمہ کے ساتھ عیہ کے سسرالیوں بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ شروع سے یہی بتایا گیا تھا فواد کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے، جائداد ہیں اور نجانی کیا کیا کچھ۔ اتنا عرصہ عیہ بھی سمجھتی رہی لیکن اب اصلیت کھلی کہ وہ تو عا جواری ہے۔ بات یوں چھپی رہی کہ اتنا عرصہ وہ بڑی رئیس جیتتا رہا اور اپنا بینک بیلنس بڑھاتا لیکن کسی نہ کسی تو اللہ رسی کھینچتا ہے۔ اب رسی کھینچنے فواد بے در پے کئی بار ہارا اور اس بری طرح ہارا

سارا بینک بیلنس حتیٰ کہ جائیداد تک لٹ گئی۔ سارے اثاثے لٹانے کے بعد اس نے عیضہ سے اس کا زیور اور حق مہر کی رقم مانگی۔ وہ بے چاری تو بے خبری میں وہ بھی دے دیتی، وہ تو بھلا ہو فواد کی خالہ زاد بہن فوزیہ کا جس نے بروقت اسے ساری حقیقت بتا کر کچھ بھی دینے سے منع کر دیا۔ عیضہ نے فواد سے باز پرس کی تو اس نے ہماری پھولوں سی عیضہ کو خوب مارا پیٹا۔ اس نے ساس سر سے شکایت کی تو انہوں نے بھی اس سے لاتعلقی اختیار کر کے جان چھڑائی۔ وہ بے چاری موقع دیکھ کر سارا زیور، اسے لی ایم کارڈ اور چیک بک اٹھا کر میکے آ گئی۔

رضیہ بیگم نے دکھ کے مارے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا آپا؟ اب کہاں ہے عیضہ؟“

”ہونا کیا تھا، خاندان کے بزرگ بیٹھے، معاملہ سلجھایا، جس گھر میں وہ دونوں رہ رہے تھے اسے بیچ کر سارا قرض چکایا، عیضہ کو اپنا زیور اور رقم میاں کے حوالے کرنا ہی پڑا۔ اس سے فواد نے ایک دکان لے کر پرچون کا سامان ڈال لیا۔ اب دونوں کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں، وہ سارا مال جس کے لالچ میں صائمہ نے رافع کو گھرا یا تھا وہ اس کی بیٹی کی قسمت میں تھا ہی نہیں۔ اب جیسی تیری زندگی گزر رہی ہے بس۔ جو آپس کے بھرم تھے وہ تو چکنا چور ہوئے۔“

☆☆☆

جب ہزار کوشش کے باوجود کوئی کام نہ ہو پائے یا ہوتے ہوتے رہ جائے تو انسان سمجھتا ہے اس کے کام میں بلاوجہ رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ رکاوٹ کس وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ اللہ اور بندے کی مرضی کے فرق کو ہی قسمت کہتے ہیں۔ یہی معاملہ رافع کے ساتھ بھی ہوا، اس کے رشتے میں شاید اسی لیے رکاوٹ بنتی رہی کیونکہ وہ لوگ صحیح لڑکی تک پہنچ نہیں پائے تھے۔

ربیعہ کی شادی میں رضیہ بیگم نے مہوش کو جو ربیعہ کی مندر مریم کی سہیلی تھی۔ بارات ولیمہ و تقاریب میں وہ لڑکی ان کی توجہ کا مرکز بنی، انہوں نے رافع کی توجہ اس کی طرف مبذول کیا تو اس نے مسکرا کر کندھے اچکا دیے۔ شادی تقاریب سے فارغ ہو کر انہوں نے ربیعہ کی بات کی اور رشتہ لے کر مہوش کے گھر پہنچ کر زبیدہ بیگم، ربیعہ اور مریم کو بھی انہوں نے ساتھ لیا تاکہ حوالہ سند رہے۔ وہاں ان کی خوب آؤ کی گئی۔ زبیدہ بیگم نے ہی مہوش کی والدہ کو ان کا مقصد بتایا اور رافع کے بارے میں تفصیلات اس کی ایک تصویر بھی وہاں چھوڑ آئیں۔ اس کے انہوں نے رضیہ بیگم کی ایما پر انہیں فون کر کے الفاظ میں یہ بھی بتا دیا کہ لڑکا بے شک اچھی پوسہ ہے اچھا کماتا ہے لیکن اپنی اب تک کی ساری کمائی گھر بنانے اور بہن کی شادی کرنے میں خرچ کر کے اس لیے وہ کسی دھوکے میں نہ رہیں۔

مہوش کے گھر والوں کو ان کی سچائی اور داری بہت بھائی۔ انہوں نے اپنے خاندان بزرگوں سے مشورہ کر کے ہاں کر دی۔ اس روز تو ان کے گھر بھاری آ گئی۔ رافع کے کہنے پر مستی میں کسی بھی قسم کے مسائل سے بچنے کی خاطر انہوں نے جہیز، بری، زیورات اور حق مہر سمیت سارے معاملات پہلے ہی واضح کر دیے۔ حیرت انگیز طرز وہ ہر بات سے متفق ہو گئے۔ مہوش کے والد صاحب بے حد سمجھ دار اور سنجیدہ طبیعت کے ما تھے۔ انہوں نے صاف اور دو ٹوک انداز میں اپنا واضح کر دیا۔

”بھائی صاحب، آپ آسانی سے جتنا کر ہیں اتنا ہی کریں۔ ہم آپ سے نہ کوئی شکوہ کر گئے نہ تقاضا۔ زیور، بری، حق مہر سب کچھ آپ مرضی سے طے کر کے ہمیں مطلع کر دیں۔ پیسہ جانی چیز ہے۔ میری بیٹی کی قسمت میں ہوا تو ضرور ملے گا۔ میں نے کسی بھی رشتے میں پیسے کو

اہمیت نہیں دی۔ میں آپ سے کبھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ کا بیٹا کتنا کماتا ہے۔ جو میری بیٹی کا نصیب ہوا اسے وہی ملے گا۔ میرا تعلق صرف اس بات سے ہے کہ آپ اور آپ کا بیٹا شریف ہیں، باکر دار ہیں، سلجھ مزاج کے ہیں اور میری بیٹی کو خوش رکھیں گے۔ باقی میری بیٹی کی طرف سے آپ کو کبھی کوئی شکایت ہوئی تو میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھ سے براہ راست بات کیجیے گا۔“

ان سے بات کر کے نذر صاحب کو اس قدر سکون کا احساس ہوا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ رافع بھی بے حد خوش تھا۔ رضیہ بیگم نے یہ سب تفصیلات سن کر شکرانے کے نوافل ادا کیے کہ اللہ کریم نے انہیں اتنے اچھے گھرانے سے ملا دیا۔ ایک سادہ سی گھریلو تقریب میں رضیہ بیگم نے مہوش کو انگوٹھی پہنا کر سال بعد رافع کی دوبارہ آمد پر شادی طے کر دی۔ اس بار رافع دہلی کے لیے رخصت ہوا تو اس کے دل میں اطمینان کی لہریں موجزن تھیں۔

☆☆☆

عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ بچوں کے فیصلے درست ثابت نہیں ہوتے کیونکہ ان کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے اور بزرگ سوچ سمجھ کر اپنے تجربے کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں اس لیے وہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں بزرگوں کے فیصلوں کی بنیاد مادہ پرستی پر ہو، وہ فیصلے ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ ٹکفٹہ بیگم نے بھی یہی کیا، رشتوں پر دولت کو ترجیح دے کر نئے رشتے بنائے اور انہوں نے جلد ہی اپنی اوقات دکھا دی۔ ایاز تملون مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ ننگ مزاج بھی تھا، کہیں ننگ کرو کر ہی نہیں کرتا تھا، چند ماہ بعد ہی دفتر میں کسی نہ کسی سے جھگڑا کر کے نوکر کی کولات مار کر آ جاتا اور کئی ماہ گھر پر ہی گزارتا۔ مزاج اس قدر شاہانہ تھا کہ اگلی نوکر ہی اپنے معیار کے مطابق ہی چاہیے ہوتی تھی، معیار سے کم پردہ راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد، ایک وقت میں کئی لڑکیوں سے اس کا چکر بھی جاری رہتا۔

ٹکفٹہ بیگم کو ان باتوں کا تھوڑا بہت اندازہ پہلے ہی تھا مگر وہی روایتی بیوقوفانہ سوچ کہ شادی کے ذمہ داری پڑے گی تو بدل جائے گا، اس سوچ۔ نجانے کتنے والدین اپنی پیاری بیٹیوں کی زندگی برباد کر ڈالتے ہیں۔ انہی لڑکیوں میں ماہ رخ کا شمار ہو گیا۔ ڈیڑھ سال میں ایاز نے تین نوکر یا چھوڑ دیں لیکن اسے دوسری نوکر کی جلد ہی مل جاتی اس لیے ماہ رخ بھی زیادہ فکر مند نہیں ہوئی۔ جب ایاز نے تیسری نوکر کی چھوڑی تو پھر سکون سے گھ بیٹھ گیا، یوں لگتا تھا جیسے اسے نوکر کی کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ پہلے کی بات اور بھی لیکن اب وہ آہ بیٹے کا باپ تھا اور اس کے اخراجات کوئی اور بھی نہ اٹھاتا۔

چند ماہ تو سب نے برداشت کیا لیکن اس بعد نسیم بیگم اور مہرین نے انہیں طعنے دینے شروع دیے۔ کچھ عرصہ ٹکفٹہ بیگم اسے تھوڑے بہت دیتی رہیں لیکن وہ بھی کوئی لکھ پتی تو نہیں تھیں، اپنا گھر ہی مشکل سے چلاتی تھیں۔ انہوں نے ا جھٹائی نسیم بیگم سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہر نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ.....

”یہ ان میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے، کوئی بچہ تو نہیں ہے کہ ہم اسے سمجھائیں، نوک تلاش کرتا رہا ہے اور کیا کرے۔ زندگی میں اور تو آتی رہتی ہے تم اپنی ہی مثال لے لو کس ط دانتوں میں رکھ کر پیسہ خرچ کرتی ہو تو یہی قناعت کو بھی سکھائی تھی نا۔ ذرا سی تنگی آئی تو دادیلا چاا بیویاں اپنے شوہروں کا ساتھ دیتی ہیں ان کا بازار ہیں، آخر کس دن کے لیے تم نے اتنا پڑھایا لکھایا سمجھاؤ اپنی بیٹی کو، کہیں نوکر کی کر کے اپنا اور نہ خرچا تو چلائے، اپنے بیٹے کا ہم دیکھ لیں گے۔“

ٹکفٹہ بیگم نے حق مہر کی بابت پوچھا کہ و رخ کو ادا کیوں نہیں کیا گیا تو وہ مزید بڑبڑا کر بولیں۔

”کون سا حق مہر بہن، یہ سب تو بس لکھانے کی حد تک ہوتا ہے، ادا کون کرتا ہے؟“

گھٹتے بیگم تو دیگ رہ گئیں، انہوں نے ایسے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں کہ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ پھر یہی ہوا، ماہ رخ نے نوکری شروع کر دی، روز صبح سویرے تیار ہو کر کھانا سا بچہ اپنی ماں کے حوالے کر کے وہ اسکول جاتی، دوپہر گھر پہنچ کر ماری ماں کے پاس جاتی، کھانا وہیں کھا کر بیٹے کو لے کر گھر لوٹی، پھر گھر میں اپنے ذمے لگائے گئے کام نمٹاتی، کیونکہ اس معاملے میں اسے کوئی رعایت نہیں دی گئی۔ اسکول کی ملازمت سے مٹھی بھر تنخواہ ملتی جس سے اس کا گزارہ بمشکل ہوتا لیکن زندگی اس طور تو نہیں گزر سکتی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے گھر میں ٹیوشن بھی پڑھانی شروع کر دی۔ حالات ان کے برے تھے اس لیے انہیں کوئی بھی منہ نہ لگانا نہ کوئی اہمیت دیتا۔ جس چاؤ سے تانی اسے بیاہ کر لے گئی تھیں وہ سب خاک ہو چکا تھا۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی، ہر طرح کی اشیائے خورد و نوش اور نعمتیں گھر میں موجود ہوتیں لیکن ماہ رخ اور اس کے بچے کو کوئی چیز استعمال کرنے کا نہ حق تھا نہ اجازت۔ باہر سے آنے والے کسی مہمان کو اندازہ تک نہ ہوتا کہ اس عالی شان بنگلے کے اندر ایک بہو کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے۔

اس کی زندگی اتنی مشکل ہو گئی تھی کہ وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اب گھٹتے بیگم کو پچھتاوا ہوتا۔ جس زندگی سے وہ اپنی بیٹی کو بچانا چاہتی تھیں وہ اس کے مقدر میں لکھی تھی پھر وہ مقدر سے کیسے لڑتیں۔ اب ماہ رخ کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھ کر ان کا حال ہی پوچھ لے۔ ایک بار ضمیر کی چٹبن سے تنگ آ کر انہوں نے ماہ رخ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے معاف کر دو ماہ رخ میں نے انجانے میں تمہارے ساتھ زیادتی کر دی۔ اگر تم رضیہ کے گھر ہوتیں تو تمہارا یہ حال کبھی نہ ہوتا، وہ تمہیں پلوں پر بٹھا کر رکھتی، خود روٹی سوکھی کھا کرتا زہ نوالہ تمہارے منہ میں دیتی۔ میں تمہاری مجرم ہوں۔ مجھے لگا تھا

نندوں کا بوجھ ہو گا تو تم گھٹ گھٹ کر جیو گی، جانتی تھی کہ زندگی کی سانسیں صرف دوسرے بوجھ سے تنگ نہیں ہوتیں، کبھی کبھی اپنے اس سانس روکنے کا سبب بن جاتے ہیں اور اعمال کی سزا تم بھگت رہی ہو۔“ ماہ رخ کے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا، اس نے اُحد کو گود میں بس اتنا کہا۔

”اب ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہ؟ خدا حافظ۔“ وہ چلی گئی اور ان کے دل کا بوجھ بڑھ گیا۔ اگر وہ رویتی، ان سے لڑ بھگت لیتی، ان کے دل پر بوجھ نہ بنتا، لیکن اس کا کوئی کیے بغیر چلے جانا انہیں مزید اذیت میں دھکیلا اب انہیں تا عمر اسی اذیت میں رہنا تھا۔

☆☆☆

رضیہ بیگم کو ماہ رخ کے حالات کے بارے میں ان کی پرانی پڑوسن ثمنیہ نے بتایا جو عرصے سے ملنے ان کے نئے گھر میں آئی تھیں۔ وہ یہ سب جان کر بے حد دیکھ ہوا۔ ماہ رخ اور دونوں انہیں بہت پیاری تھیں لیکن گھٹتے بیگم غرضی اور مادہ پرستی نے اتنے فاصلے پیدا کر دیے بھی ان سے بچ گئیں۔ ماہ رخ کا سارا قصہ کے بعد ثمنیہ قدرے جھجک کر بولیں۔

”رضیہ، برا نہ مانو تو ایک بات کہوں گھٹتے نے تمہارے لیے ایک پیغام بھجوایا ہے چونگیں۔“

”کیسا پیغام؟ اور برامانے کی کیا بات کہو۔“

ثمنیہ کچھ کہتے کہتے ہچکچا کر رک گئیں۔

”اصل میں رضیہ! بات یہ ہے کہ... چاہتی ہے تم اسے معاف کر دو اور رافع کے قتل کا رشتہ لے لو۔“

رضیہ بیگم کے تو جیسے سر پر بم پھٹا۔ انہو بے یقینی سے ثمنیہ کو دیکھا۔

”اف۔ آپ آج بھی کس قدر خود غرا

موقع پرست ہیں۔“ انہوں نے صرف سوچا، کہا نہیں۔ پھر خود کو سنبھال کر بولیں۔

”میں انہیں پہلے ہی معاف کر چکی ہوں ثمنینہ مگر جہاں تک رشتے کی بات ہے تو افسوس، آبانے دیر کر دی۔ ابھی دو ہفتے پہلے ہی ہم نے رافع کی معافی کی ہے۔ لڑکی ربیعہ کی زندگی سبیلی ہے۔“ اب کے ہم ثمنینہ کے سر پر بیٹھا۔

”کیا..... معافی کر دی..... اور ہمیں بتایا تک نہیں۔“

”تمہیں بتایا تا کہ رافع کی واپسی کی تیاریوں میں لگی رہی، پھر معافی کے ساتھ ہی آگے کے معاملات بھی ابھی سے طے کرنے تھے تا کہ کل کو اس رشتے میں بھی کوئی غلط فہمی در اڑ نہ ڈال دے۔ بس اسی سلسلے میں ہمارا آنا جانا لگا رہا۔ ربیعہ کی بھی دعوت رکھی، دو دو نئے رشتے جڑے تو مصروفیت بھی دہری ہو گئی۔ اب رافع کی واپسی ہوئی تو میں نذیر صاحب سے یہی طے کر رہی تھی کہ ایک دن مٹھائی کے ڈبے بھالائیں تو میں پرانے محلے کا چکر لگا کر سب کو مٹھائی کے ساتھ خوش خبری سناؤں۔ اس سے پہلے ہی تم آ گئی۔ شاید اس اتوار میرا چکر لگے۔“

ثمنینہ کے جانے کے بعد وہ تنہائی میں ماہ رخ کے حالات پر بہت روئیں، لیکن اس بار انہوں نے عقل مندی سے کام لیا اور یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ رافع تک یہ بات پہنچے اور وہ دیکھی ہو یا اس کے دل میں کوئی خلش جاگ اٹھے۔

☆☆☆

رضیہ بیگم نے بری کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کپڑوں جو توں کی خریداری کے لیے وہ مہوش کو ساتھ ہی لے کر گئیں تا کہ وہ اپنی پسند سے سب کچھ لے سکے۔ مہوش اچھی لڑکی تھی، وہ جب بھی جاتیں ان سے بہت احترام سے ملتی۔ اب رضیہ بیگم کی کوشش تھی کہ سنیعہ کا بھی رشتہ آجاتا تو رافع کے ویسے میں ہی اسے بھی رخصت کر دیتیں۔ اس بارے میں

انہوں نے کئی لوگوں سے کہہ رکھا تھا، بس ایک اللہ نے ان کی سن لی اور ان کے نئے محلے میں چھوڑ کر تیسرے گھر میں رہنے والی کلثوم بیگم ارمغان کا رشتہ سنیعہ کے لیے لے آئیں۔ کی حیثیت سے رضیہ بیگم قریب قریب کے آگے گھروں میں چند ایک بار ملنے گئی تھیں۔ انہوں سے ایک گھر کلثوم بیگم کا بھی تھا۔ ان کا بیٹا ارغیسر تھا اور کسی آئل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا کمانا تھا۔ نذیر صاحب ارمغان اور اس کے سے ملے، چند رشتے داروں سے بھی میل ملا ہوئی، یہاں وہاں چھان بین اور مشورے ہو۔ پھر سنیعہ کا بھی رشتہ بکا ہو گیا۔ رافع کی تو خوشی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے بھی یہی تجویز دی کہ آ

ویسے میں ہی سنیعہ کو رخصت کر دیا جائے۔ وقت کم مقابلہ سخت والا معاملہ تھا۔ ایہ ربیعہ کی ساس زبیدہ بیگم نے بہت تعاون کیا۔ ربیعہ امید سے تھی اور اس کی طبیعت اکثر بوجھل تھی اس لیے اگر رضیہ بیگم کو شادی کی تیاریاں لیے اس کی مدد کی ضرورت ہوئی تو زبیدہ بیگم جگہ خود چلی جاتیں اور جب وہ بہتر محسوس کرنی کی مدد کرانے چلی جاتی۔ احسن بھی ان لوگوں بھر پور مدد کر کر رافع کی کمی پوری کرنے کی کوشش تھا۔ نذیر صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ صرف اچھا داماد تھا بلکہ ربیعہ کے لیے بہتر پر بھی ثابت ہوا تھا۔ رضیہ بیگم خدا کا شکر ادا کرتی تھیں۔

☆☆☆

شادی میں پانچ ماہ باقی تھے۔ حسینہ کی خواہش تھی کہ شادی کے لیے گھر کو سجاایا جائے تا کہ گھر کو دیکھ کر ہی خوشی کا احساس اسی مقصد کے لیے انہوں نے گھر میں رنگ و آغا کر دیا۔ رنگ روغن مکمل ہوا تو صاحب، اظفر کو ساتھ لے جا کر کارپٹ اور خرید لائے، پھر سامان ترتیب سے لگانے میں

لگ گئے۔ وہ سب بری طرح تھک کر چور ہو چکے تھے اس لیے دو دن کھانا بھی باہر سے منلوایا گیا۔ دوپہر کو سب آرام کرنے لیئے تو اتنی گہری نیند سوئے کہ پھر مسلسل بجتی گھنٹی نے ہی انہیں جگایا۔ سب ہڑبڑا کر اٹھے، انظر نے جا کر دیکھا تو ان کی خالہ زادہ بیگم اہتمام سے تیار ہوئی ان کے گھر کے گیٹ پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ سب گھر والوں میں بجلی بھر گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیٹی انم کی شادی کا دعوت نامہ لے کر آئی تھیں۔ ان کا داماد بھی دینی میں ملازمت کرتا تھا اس لیے رافع کا سن کر خود بخود موازنہ ہونے لگا۔ زادہ بیگم کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھ رہی تھیں۔

”اور ابھی بتاؤ تیاریاں کیسی چل رہی ہیں؟ لڑکے والے کیسی بری بنا رہے ہیں کچھ خبر لی یا سب ان کی مرضی پر چھوڑا ہوا ہے؟ تم تو ایسی جھٹی ہو تم نے تو کوئی فرمائش ہی نہیں کی ہو گی ان سے۔“

زادہ بیگم کی نسبت شاہدہ بیگم سادہ طبیعت کی تھیں لیکن وہ انہیں زیادے کی چالاکیاں سکھانے کی کوشش کرنا نہیں چھوڑتی تھیں۔

”بھئی انہوں نے ہمیں جہیز کے نام پر کچھ بھی لانے سے منع کر دیا تھا، وہ تو حسین صاحب نے زبردستی انہیں تھوڑے بہت سامان پر راضی کیا ورنہ رافع تو کہہ رہا تھا سب کچھ وہ خود کرے گا۔ پھر ایسے لوگوں کو ہم کیوں بلا وجہ کی فرمائشیں کر کے تنگ کریں۔“

ان کی بات سن کر زادہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”دیکھا۔ مجھے پتا تھا تم ایسی ہی بے وقوفی کرو گی۔ تم سا کوئی سادہ نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے داماد سے خود بات کر کے انم کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ کے عروسی ملبوسات، نو بھاری اور نو ہلکے جوڑے اور ساتھ میچنگ سینڈلیں کروائیں۔ دینی سے نو سو یٹر، نو پرس، میک اپ کا برانڈ ڈ سامان الگ اور حق مہر میں نو تو لے سونا، نو لاکھ روپیہ نقد اور نو ہزار روپیہ ماہوار

جب خرچ لکھوایا ہے اور وہ خوشی سے بھئی اتنا کمانا ہے تو مانا ہے نا۔ آخر باپ پر کیوں لٹائے۔“ شاہدہ بیگم کا حیرت سے بولیں۔

”یہ نو کا کیا حساب ہے بھئی؟“
”ارے طاق عدد میں برکت بتاؤ وہاں سے کیا تیاریاں ہیں اور حق؟“
شاہدہ بیگم جڑبڑ ہو گئیں، کہہ نہ سکیں تو ایک اور تین بھی ہوتا ہے۔ بولیں تو! ”کچی بات ہے میں نے ساما نہیں پوچھیں لیکن حق مہر کا انہوں۔ تو لے سونا لکھیں گے۔“

سینڈوچ کھاتی زادہ بیگم کا ہاتھ سینڈوچ پلیٹ میں پٹخ کر وہ بولیں۔
”صرف پانچ تو لے سونا؟ ار ہو کیا؟ بے وقوف عورت یہ حق مہر عو ہوتا ہے، اس کی زندگی کا ضامن ہوتا۔ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو یہی حق مہر شوہر بھاری حق مہر والی بیوی کی زیا اسے چھوڑنے کی سوچتا نہیں اور اگر خدا دے تب بھی عورت نقصان میں نہیں رہے وہیں کچھ فاصلے پر کپڑے استر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ استر کے پاس آ بیٹھی اور بولی۔

”گستاخی معاف خالہ مگر ایک گی۔ شادی ابھی ہوئی نہیں ہوتی اور پہلے سوچنے لگ جاتے ہیں، اس معا سوچ اتنی منفی کیوں ہو جاتی ہے؟ دو بھاری حق مہر والی عورت کی شوہر قدرا اس سے ڈر ڈر کر جیتا ہے یہ بھی سمجھاؤ! آخری بات۔ کیا حق مہر کا زیور اور البدل ہو سکتا ہے؟ کہ اگر شوہر چھ عورت حق مہر کے سہارے زندگی بسر کرے تو پھر تو دنیا کی سب مال دار عورتو

س کرنی چاہیے کیونکہ ان کے پاس تو وہ پیسہ پہلے موجود ہے۔“

زیادہ بیگم کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

”دیکھو بیٹا یہ بڑوں کے معاملات ہوتے ہیں اری لڑکیاں بیچ میں نہیں بولتیں۔ بیچ بڑے ہیں ہتر جانتے ہیں کہ بچوں کے لیے کیا صحیح ہے اور کیا تم جا کر اپنا کام کرو۔“ وہ مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جی میں جانتی ہوں کہ بڑے زیادہ تجربہ کار تے ہیں لیکن یہ میری شادی اور میرے حق مہر کا مسئلہ ہے۔ میرا شوہر اپنی خوشی سے مجھے جو دینا ہے گنا مجھے قبول ہوگا۔ جو چیز ہے یہ میری اس میں بڑے کیوں رائے دیں۔ ہمارا بھی ایک ہی بھائی ہے، گل کو اس کی ساس بھی ہمارے مسائل اور مالی حالت کا خیال کیے بنا یہی الفاظ کہہ سکتی ہے جو ابھی آپ نے کہے۔ تب ہمیں بہت دکھ ہوگا۔ میری بات پر کیجیے گا خالہ، آپ نے بھی ابھی دو بیٹوں کی بیاں کرنی ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

اس کی ایک ایک بات درست تھی مگر زیادہ بیگم بس قدر غصہ آیا کہ وہ طیش میں آ کر بہن کو بے نقط بنا چلی گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے دنیہ سے ہی بنا روز فون کرتیں اور انیم کی سسرال اور بری کے لیے سے بڑھا چڑھا کر باتیں بتاتیں۔ شاہدہ بیگم انہیں تو سادہ سی عورت، ان کا بھی دل لپانے لگا۔

زیادہ بیگم نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی کہ دینی کی کمائی بہت زیادہ ہوتی ہے اور رافع بلا نجوی دکھا رہا ہے، اگر وہ رافع پر ذرا سا بھی دباؤ دے گی تو وہ مان جائے گا لیکن یہ دباؤ انہیں اس ڈالنا ہے جب وہ پاکستان آ جائے اور شادی دس پندرہ روز باقی رہ جائیں تاکہ وہ کوئی انتہائی نہ اٹھا سکے۔ پہلے پہل تو شاہدہ بیگم ان کی باتیں مگر نظر انداز کر دیتی تھیں کیونکہ انہیں لگتا تھا وہ خد رانی سے کام لے رہی ہیں، لیکن جب شادی تقریبات کا آغاز ہوا تو وہ انگشت بدنداں رہ

گئیں۔ جیسا زاہدہ نے بتایا تھا سب کچھ اس سے بھی بڑھ کر ثابت ہوا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ رافع واقعی کنبھوسی سے کام لے رہا ہے اور انیم کی شادی کی تقریبات ختم ہونے تک شاہدہ بیگم کا دل بدل چکا تھا جس سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے نجانے کیا کیا کہہ کر حسنین صاحب کو بھی اپنا ہم نوا کر لیا، وہ اس معاملے میں بڑے سے گھبرار ہے تھے لیکن وہ ڈٹ گئیں کہ وہ رافع سے خود ہی بات کر لیں گی۔

ان کی ضد دیکھ کر حسنین صاحب چند ایک بار انہیں سمجھا کر اس معاملے سے الگ ہو گئے۔ انیم کی شادی کی شان و شوکت دیکھ کر کچھ تو وہ بھی قائل ہو گئے تھے لیکن ان میں مروت کا مادہ زیادہ تھا۔ مہوش اس ساری کہانی سے یکسر انجان تھی لیکن شاہدہ بیگم نے بہن کو ہم نوا بنا کر سارا منصوبہ تیار کر لیا۔

☆☆☆

ربیعہ نے اپنے جیسی پیاری سی بیٹی کو جنم دیا تو دونوں گھرانوں میں خوشیوں کی نئی لہر دوڑ گئی۔ زبیدہ بیگم اس کے ناز اٹھائی نہ کھتی تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا حسن اور بہو نادہ تو امریکہ میں مقیم تھے۔ اس کے بعد ان کی بڑی بیٹی شبنم شادی شدہ تھی، پھر احسن کے بعد مریم اور صنم تھیں۔ گھر میں ننھی پری آئی تو سب دیوانے ہو گئے۔ مریم نے اس کا نام ہی پری رکھ دیا۔ بس پھر زبیدہ بیگم بہو کی ہمارداری کرتیں تو مریم اور صنم، پری کو اٹھائے اٹھائے پھرتیں۔ ربیعہ کو بے حد آرام ملا۔ عام طور پر لڑکیاں ایسے موقع پر میکے جا کر رہتی ہیں لیکن ربیعہ کے میکے میں دو دو شادیوں کی تیاریاں چل رہی تھیں اس لیے زبیدہ بیگم نے اسے سسرال میں ہی میکے والا آرام و سکون دیا۔

رافع بھی اپنی ننھی بھانجی کو دیکھنے کو بے تاب تھا۔ اس بار وہ آیا تو جیسے خوشیوں کی بارات آ گئی۔ آخر ان کے گھر خوشیوں کا موسم جو اتر اٹھا، ایک طرف رافع کی شادی تو دوسری طرف سنیہ کے فرض سے سبک دوشی کا خوش کن احساس اور سب سے بڑی

خوشی ربیعہ کی بیٹی کی ولادت۔ رضیہ بیگم اور نذیر صاحب شکر کے سجدے بجالاتے نہ تھکتے۔ ان کی مشکلات کے دن تمام ہو چکے تھے اب صرف خوشیوں کو محسوس کرنا تھا۔

شادی میں محض پندرہ دن باقی تھے، کارڈ بانٹے جا چکے تھے۔ مہوش کا جہیز آچکا تھا، رافع، سیدہ کا فرنیچر لے کر اس کا کمرہ سیٹ کرنے گیا ہوا تھا اور نذیر صاحب گھر پر پیک شدہ جہیز کا سامان مزدوروں سے اٹھا کر ارمغان کے گھر بھجوا رہے تھے۔ اسی وقت نذیر صاحب کے موبائل پر شاہدہ بیگم کا فون آیا۔ انہوں نے موبائل رضیہ بیگم کو تھما دیا اور خود سیدہ کے جہیز کے بقیہ کارڈن اٹھا کر باہر لے گئے۔

”کیسی ہیں رضیہ بہن، کافی معروف ہوں گی۔“ شاہدہ بیگم نے سلام دعا کے بعد پوچھا تو رضیہ بیگم بلاوجہ ہی ہنس دیں۔

”جی بس اپنی بہو کے بری کے جوڑے استری کر کے الماری میں لٹکا رہی تھی، خیر سے سیدہ کا جہیز جا رہا ہے اس کے سرال، تو کبھی معروف ہیں۔ آپ کہیے کیسے یاد کیا؟“ ان کے سوال کے جواب میں انہیں جو کچھ سننے کو ملا اس نے رضیہ بیگم کے حواس خنجر کر دیے۔ وہ پیٹنگ میں لٹکے کپڑے وہیں بستر پر گر کر خود بھی گری گئیں۔ شاہدہ بیگم نے تو اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا لیکن رضیہ بیگم کو لگان کا دل بند ہو جائے گا۔

”یا اللہ، ہماری آزمائشیں کب ختم ہوں گی۔“ انہوں نے بے اختیار اٹک بھری آنکھوں سے اوپر دیکھ کر التجا کی۔ اسی وقت نذیر صاحب انہیں پکارتے ہوئے وہیں آ گئے۔

”مبارک ہو بھئی سارا سامان وہاں چلا گیا، رافع کمرہ بھی سیٹ کر آیا، اب جلدی سے کھانا لگاؤ بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ اسی طرح سوچ میں گم شخص کی بیٹی تھیں تو نذیر صاحب کو تشویش ہوئی،

”کیا ہوا رضیہ، کیا کہہ رہی تھیں رافع کی ساس؟“ ان کے ضبط سے رکے آنسو بہہ نکلے۔

اسی وقت رافع نے اندر قدم رکھا تو وہ بہ کر تیزی سے ماں کی طرف بڑھا جو کہہ ”رافع کی ساس نے کہا ہے کہ مہوش پانچ تولہ سونا کے بجائے سات تولے لے لے گا اور پانچ ہزار ماہوار جیب خرچ لکھوا، رافع کا چہرہ طیش سے سرخ انگارے نے بھڑک کر بیڈ کی پانکٹی پر لٹا دے، ”یہ کیا بکواس ہے، ایک سال۔“ نالک کر رہے تھے یہ لوگ، اندر سے یہ لالچی اور خود غرض۔ میری طرف سے صاف امی، پانچ تولہ زیور پر مانتے ہیں تو ٹھیک ختم ہوجھیں۔ گاڑی منگوائیں اور واپس کی بیٹی کا سامان۔ میں کوئی مجھوتا نہیں کر دیا کرتی ہے، سراسر بددیانتی، اپنی بات کہہ سکتے ہیں وہ لوگ۔“ نذیر صاحب اور گئے۔

”ایک منٹ، رافع تم بیٹھو، آرام بات کرو، جوش سے نہیں ہوش سے کام لو صرف پندرہ دن باقی بچے ہیں، کارڈ بر تمہارے ولیسے میں سیدہ کی رخصتی طے۔ چکا ہے، ہم ایسے رشتہ ختم نہیں کر سکتے بات کرتے ہیں کوئی نہ کوئی حل نکل آ حسین صاحب سے بات کرتا ہوں۔“ بمشکل رافع کو قابو کیا اور حسین صاحب لیکن کئی بار ملانے پر بھی ان کا فون بند ملا۔ کر رضیہ بیگم نے ربیعہ کی ساس کو فون کیا کے توسط سے طے ہوا تھا۔ انہوں شرمندگی بھرے لہجے میں بتایا۔

”رضیہ بہن میں بہت شرمندہ ہوا کل ہی یہ بات پتا چلی ہے، مہوش بہت ہمارے گھر آئی تھی، بہت روروی تھی کہ بھی اس کی بات نہیں سن رہا، اس کے کہنے شاہدہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، آنکھوں پر ان کی بہن نے پٹی باندھ دی

یہ سب میں سہہ رہا ہوں اس لیے میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ وہ مادہ برست لوگ ہیں، انہیں میرے وجود سے صرف درہم کی خوشبو آتی ہے۔ وہ اپنی زبان سے پھرے ہیں، یہ رشتہ پانچ تولہ زیور بطور حق مہر پر طے ہوا تھا پھر یہ اتنی ساری مزید شرائط کیوں پوری کروں میں؟“

”رافع بیٹا، مجھے احساس ہے ہم سب کو احساس ہے تمہاری کٹھنائیوں کا، لیکن صبر میرا بچہ صبر۔ یہی زندگی ہے۔ تمہارا سب کچھ مہوش کا ہی ہے۔ دے دو اسے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آج کسی کی بیٹی کا احساس کرو گے تو کل کوئی اور تمہاری بیٹی کا بھی احساس کرے گا۔ غصہ تھوک دواور مان جاؤ۔“

نہ کوئی کھانا کھاتا، نہ کسی کے حلق سے پانی کا ایک گھونٹ اترتا، سب جیسے سولی پر لٹکے تھے۔ باری باری سب نے رافع کو سمجھایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ مسلسل پریشانی اور ذہنی دباؤ سے رضیہ بیگم کی طبیعت بگڑ گئی۔ سب ان کی تمارداری میں لگ گئے۔ خدا خدا کر کے وہ ٹھیک ہوئیں تو پھر سب رافع کے پیچھے پڑ گئے۔ رضیہ بیگم نے نجانے کون کون سے واسطے دیے، تین چار دن کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر رافع مان گیا لیکن جو اس کے دل میں تھا وہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بے شک اس سارے معاملے میں مہوش کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن اس کے ماں باپ کی عاقبت نا اندیشی کی وجہ سے رافع کے دل میں نکاح سے پہلے ہی اس کے لیے گرہ پڑ گئی تھی جس کی کسی کو بھی خبر تھی نہ اندازہ۔ رضیہ بیگم نے منظوری کی نوید سنائی تو شاہدہ بیگم کو بیٹی کے مستقبل سے زیادہ بہن کے سامنے اپنی ناک اونچی ہو جانے کی خوشی محسوس ہوئی۔

پھر نکاح ہوا اور پیاری سی مہوش پیارا سارو پ لیے رخصت ہو کر رافع کی زندگی میں آ گئی۔ بے حد خوب صورتی سے بچے اس کمرے میں استحقاق سے بیٹھ کر اسے اپنا آپ بے حد معتبر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ساری تقریب میں رافع بے حد

تکمائیاں ہوتی ہیں اور رافع کنجوسی کر رہا راصل ان کا اپنا داماد بھی دینی ہوتا ہے اور حال ان کی بیٹی کی شادی پوری شان و شوکت سے اس کی وجہ سے شاہدہ بیگم کو بھی لالچ آ گیا۔“

پھر زبیدہ بہن آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں، بہت غصے میں ہے اور وہ رشتہ ختم کرنے کی رہا ہے۔“

”بیٹھیں رضیہ، میں تو یہی کہوں گی کہ اس وقت پر رشتہ ختم کرنا مہوش کے ساتھ زیادتی ہو سکے وہ بے چاری بہت اچھی لڑکی ہے، اس کی پر باد ہو جائے گی، آپ رافع کو سمجھائیں کہ وہ کسی طرح کچھ بندوبست کر لے۔ اگر کوئی پیش آئے تو ہم مدد کے لیے تیار ہیں آپ خود مشکل میں تنہا نہ بھجیں۔ رافع برا نہ مانے تو ہم کچھ رقم بطور قرض بھی دے سکتے ہیں۔“

رضیہ بیگم نے دو چار باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ زبیدہ بیگم نے فوری طور پر زبیدہ کو بھی گھر بھیج دیا۔ بھی بھائی کو سمجھائے اور اس مشکل وقت میں لوگوں کے ساتھ رہے۔ رافع پھر اہوا شیر بن گیا کی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ شادی والا گھر سو گوار ہو گیا۔ نذیر صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو بولا۔

”کیوں ابو کیوں ایسا کروں میں، کیا میری پر سارا حق صرف مہوش کا ہے جو میں ساری جمعہ کے گھر والوں کے فضول سے مطالبات پر؟ میں وہاں کن مشکلات سے گزرتا ہوں، منت کرتا ہوں، اپنوں کو یاد کر کے ایک ایک دن دن، ہر ماہ اپنا بینک بیلنس چیک کر کے حسابوں کو کتنے سال رہ گئے میری واپسی کا خواب نے میں۔ ایک ایک پانی سے میرے اور آپ کے کتنے خواب جڑے ہیں۔ کون چاہتا ہے وہ سے دور مشقتیں کاٹ کر سارا دن ٹھیک ہار کر کھانا کھانے بیٹھے تو اس کے ارد گرد تنہائی ہو۔“

بنجیدہ رہا اور اس نے کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ تو ہرنی نویلی دلہن کی طرح اپنے دولہا کی راہ میں پلکیں بچائے ان پلکوں پر ہزاروں خوش نما خواب سجائے بیٹھی تھی جب وہ پلکیں ان تمام خوابوں سمیت نوجلی کیوں اور وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

رافع کمرے میں آیا، حق مہر کے زیورات، نقد رقم کا لگانہ اور منہ دکھائی کالا کٹ اس کے سامنے بستر پر پھینکا اور کمرے سے ملحقہ ڈرینگ روم میں گھس گیا۔ وہ آنکھیں میچاڑے کبھی ڈرینگ روم کے بند دروازے کو دیکھتی بھی اپنے سامنے ڈیمر اس مال و دولت کو دیکھتی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پانی رافع سادہ کپڑوں میں باہر نکلا اور بستر پر لیٹ کر اس کی طرف پشت کر لی۔ اسے شدید قسم کی گڑبڑ کا احساس ہوا مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ گڑبڑ کیا تھی۔ اسے ماں نے یہی بتایا تھا کہ رافع ان کے مطالعے پر بخوشی راضی ہو گیا ہے اس لیے وہ بالکل پرسکون ہو گئی تھی۔ اب رافع کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بخوشی راضی نہیں ہوا تھا اور اسی بات کا اسے ڈر تھا۔ ایک بے بس آنسو آنکھ سے بغاوت کرتا ٹھک کر اس کے منہ کے عروسی لباس میں کہیں دم نہ ہو گیا جسے اس کے دولہا نے ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھی، زیورات اتار کر باقی زیورات اور رقم کے ساتھ لاکر میں احتیاط سے رکھے، کپڑے تبدیل کیے اور اسی خاموشی سے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ نیند تو نہیں آئی تھی مگر اداکاری تو کرنی تھی، اور نجانے کب تک کرنی تھی۔ ایک اور بے آواز باغی آنسو نکلا اور اس کے پیچھے سارے ہی باغی ہو کر نکلتے چلے گئے۔ اس نے بھی احتجاج نہیں کیا اور لب بھیج کر لیٹی رہی۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ اس سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا۔ مردوں کو مروت اور رواداری سے کم ہی کچھ لینا

دینا ہوتا ہے لیکن اسے تو سب بھٹانا تھا، یہ کی دلہن کے حساب سے اچھی طرح۔ جب ربیحہ اپنے لینے کمرے میں آئی تو ز اس کے ساتھ تھیں۔ اس وقت اسے اح ایک ہی رات میں اپنے کیسے پرائے ہوئے زرش سے مل کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں ٹیبل پر اس کے میکے سے آباٹا سجا تھا کا انتظار کر رہے تھے۔ رضحہ بیگم نے اٹھ کر چوہا، وہ اندر تک سرشار ہو گئی، کم سے کم اس گھر میں اپنا بیت دکھا رہا تھا۔

شاہدہ بیگم نے اسے خود میں بھیج کر اس کے دماغ میں رات کا سارا منظر تاز بے زاری سے پیچھے ہٹی اور اپنی کرسی ناشتے کے دوران بھی رافع بنجیدہ رہا اور سب نے محسوس کیا کیونکہ وہ ساس کی کسی سیدھے منہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ شاہدہ بات برائے بات رسمی انداز میں رافع سے ”اور ابھی رافع بیٹا تمہیں اپنی دلہن بھئی بیٹا جان کر ایک بات کہوں گی، اگر تم بھی بات بری لگے تو درگزر کر دینا، نہ کر سکا میں اسے سمجھاؤں گی۔“ رافع نے ان انتہائی بنجیدہ اور سرد نگاہوں سے ان کی طرف اور چند لمحے دیکھتا رہا، یوں کہ وہ گڑبڑا ایک سردی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔ ”جی ضرور میں آپ ہی کو بتاتا اگر ہوتا کہ آپ اپنی بیٹی کو درست راہ دکھائیں اتنا کہہ کر وہ گری دھکیلا اٹھ کھڑا ہوا بکا رہ گئے۔ شاہدہ بیگم نے بیٹی کی طرف د نے ایک شاکی نگاہ ان کے حوالے کر کے لیں۔ باقی سب ایک دوسرے سے نظر لگے۔ کسی کو بھی رافع سے اس رد عمل کی تو اس لیے بھی پریشان ہو گئے۔

وہ دن اس قدر مصروف تھا کہ رافع کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ویسے کی تقریب میر

پورے گھر میں پھرتی، سب سے چپک چپک کر باتیں کرتی لیکن میک اپ کی نہیں اس کی آنکھوں کی ویرانی کو چھپانے سے قاصر تھیں۔ اس کے دن رات بے کل و بے چین گزرتے۔ محض دو ہاتھ کے فاصلے پر سویا شوہر دو ہزار میل کی دوری پر بیٹھا محسوس ہوتا۔ یوں جیسے ان کے بیچ کئی چلیبیس حائل ہوں، اور خلیج تو حائل تھی ان کے بیچ، انا کی، نفرت کی۔ ایک نئی نویلی دلہن جو شوہر کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سہاگن نہ ہو، اس کے دل کی کیفیت بھلا کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے۔

رائع ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا اور وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا، مہوش کو یوں لگ رہا تھا کہ اس کی کل متاع مٹی میں ملتی جا رہی ہے، رائع اس سے بات کرنے پر راضی ہوتا نہ اس کی کوئی بات سنتا۔ وہ زبردستی کہنا چاہتی تو وہ کمرے سے باہر نکل جاتا۔ وہ ویسے بھی کمرے میں صرف رات کو ہی آتا تھا اور اس وقت ضد کرتے ہوئے مہوش کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں وہ باہر جا کر نہ سو جائے اور یہ سراسر بدنامی والی بات تھی۔ ویسے بھی گھر میں دو، دو شادیاں ہوئی تھیں اس لیے دعوتوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا جا رہا تھا۔ چوٹھی کی دعوت کے نام پر جب مہوش کے گھر والوں نے بلایا تو رائع نے صاف انکار کر دیا۔ اس وقت رضیہ بیگم نے انہیں خاندان کی دعوتوں کا کہہ کر ٹال دیا لیکن کچھ دنوں کے بعد شاہدہ بیگم نے خود رائع کے موبائل پر کال کر کے دعوت کا کہا تو اس نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا۔

”معاف کیجیے گا آٹنی میں لگی نہیں رکھتا، صاف بات کروں گا کہ میں آپ کے گھر نہیں آتا چاہتا نہ ہی مہوش کو بھیجتا چاہتا ہوں۔“

شاہدہ بیگم کے تو ہاتھوں کے تو تے اڑ گئے، وہ حواس باختہ ہو کر بولیں۔

”کیوں بیٹا سب خیریت تو ہے؟ کیا تمہیں ہی سے کوئی شکایت ہے؟“ رائع کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی کال اٹینڈ کرتے ہی اس نے کمرے میں آ کر پسپا کر لیا تھا تاکہ مہوش بھی

دیکھ اپنے سرالیوں کے ساتھ دیکھا ہی روکھا پھیکا ہتھ سنیعہ کے سرالیوں سے وہ بہت تپاک سے رخصتی کا وقت آیا تو اس نے خود سنیعہ کا ہاتھ پکڑ کر اور مہوش کو اس پر ہی چھوڑ کر اتر گیا تب مہوش پنا دلہنا پنا بھلا کر سنیعہ کی دوسری طرف آئی اور کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ ویسے کے دلہا دلہن بنے بھابی نے اسے دروازے تک پہنچایا، یہ منظر کو بہت پیارا لگا۔ رخصتی کا منظر سوگوار ہو گیا، پھوٹ پھوٹ کر روئی، رضیہ بیگم اور ربیعہ تو رو ہی تھیں خود مہوش کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر گئے۔ وہ بھی تو ایک دن پہلے ہی رخصت ہو کر آئی اور پھر جو اس پر گزری تھی۔ اس کے تو اپنے ہی

سنیعہ کی رخصتی کے بعد سب مہمان بھی گئے ہو گئے اور وہ لوگ بھی بھاری دل لیے گھر آ گئے۔ کمرے میں آ کر مہوش نے زبورات اتارنے سے گریز کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی رائع نے اس پر نظر بھی نہیں ڈالی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر تو رائع کمرے میں آ چکا تھا۔ مہوش نے طے کر لیا کہ وہ زیادہ وقت بر باد نہیں ہونے دے گی اور اس کے پر رائع سے جلد بات کر کے معاملہ رفع دفع کرے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا مہوش ہمت کر کے آگے اور اس کا بازو تھام کر بولی۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے، پلیز مجھے راساقت دیں۔“ رائع نے ایک کڑی نگاہ اپنے پر رکھے اس کے ہاتھ پر ڈالی پھر بازو جھٹک کر

”مگر مجھے نہ تم سے کوئی بات کرنی ہے نہ سنی

آئندہ مجھے اس طرح مت روکنا۔“

وہ دار ونگ دینے والے انداز میں کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا اور پیچھے وہ تہی داماں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

مہوش دنیا دکھاوے کو روز بناؤ سنگھار کر کے

”دھمکی دے رہی ہو مجھے؟“

”دھمکی نہیں دے رہی، اپنی بے

رہی ہوں، آج آپ ساری بات وارڈ
اور میری بات بھی سنیں گے۔“

رائف نے ایک گہری سانس لی اور ا
کو ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا، وہ پیچھے کی طرف
”تمہارے ماں باپ کو جو چاہیے

دیا نامیں نے، اب مجھ سے مزید توقعات

رہے ہیں۔ انہیں اپنی بیٹی کی خوشیوں کی

طور پر پیسہ اور زیور چاہیے تھا، وہ میں نے

دیا، اب میرے لیے کیوں تڑپ رہی ہ

زیور، اسے پہنو، جو سنورو، پیسہ اٹھا کر ج

خرج کرو عیش کرو، مجھ سے اب کیا چاہیے

دولت سے اپنے دل کی خوشی مانگو، اسے

اور دل کا بادشاہ بناؤ اور بازار جا کر اس

ازدواجی خوشیاں خرید لاؤ۔ اب میری آ

ہے تم لوگوں کو۔“

اس کا حرف، حرف درست تھا اور

مہوش کو بھی خدشہ تھا مگر اس کی کسی نے

تڑپ کر بولی۔

”رائف پلیز میری بات کا یقین کر

پر یقین نہیں تو بے شک رعبہ سے پوچھ

مسئلہ لے کر ان کے پاس بھی گئی تھی۔ زب

میرے کہنے پر امی کو بہت سمجھایا مگر وہ

انہوں نے زاہدہ خالہ کی باتوں میں آ کر

پانچ تولہ سونا جو آپ نے اپنی مرضی سے

گیا تھا مجھے اس کی بھی کوئی خواہش نہیں تھی

مجھ سے پوچھتا تو میں حق مہر میں آپ کا

اعتبار لکھوا لی۔ میرا یقین کریں رائف مجھے

کی کبھی کوئی خواہش نہیں رہی۔ اگر آپ

پاکستان میں واپس اپنی پرانی نوکری کر۔

تب بھی بخوشی آپ کے ساتھ گزارہ کروا

میرا اعتبار کریں مجھے آپ کے اعتبار کے

چاہیے۔“

دونوں طرف کی بات چیت سن سکے۔

”یہ بات آپ خود بہتر سمجھ سکتی ہیں، بہتر ہوگا

کہ آپ آئندہ ہمیں بلانے کے لیے کوئی کال نہ

کریں، اس کے علاوہ آپ جب چاہیں کال کر سکتی

ہیں۔“

شاہدہ بیگم پر تو پریشانی کے یارے لرزہ طاری

ہو گیا، ساری تدبیریں الٹی پڑ گئی تھیں، وہ شپٹا کر

بولیں۔

”لیکن رائف، تم ہماری بیٹی کو ہم سے ملنے سے

کیسے روک سکتے ہو، شادی کے بعد وہ اب تک ہم

سے ملنے نہیں آئی، تم نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ لیکن

ہماری بیٹی کو تو بھیججو۔ ہمیں تم سے ایسی امید بالکل نہیں

تھی۔“ رائف کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا، مہوش

سانس روکے سب سن رہی تھی، اس کے چہرے پر

ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا چارہ تھا، رائف نے ایک

سخت نگاہ اس پر ڈالی اور اسی سختی سے بولا۔

”ہمیں بھی آپ سے ایسی امید بالکل نہیں

تھی۔ باقی رہی بات آپ کی بیٹی کی تو میری طرف

سے اسے اجازت نہیں لیکن پھر بھی آپ اسے لے

جانا چاہتی ہیں تو جب چاہیں آ کر لے جائیں لیکن

پھر اپنے پاس ہی رکھیے گا۔ خدا حافظ۔“ اس نے کال

کاٹ کر موبائل ہی آف کر دیا اور مہوش پھوٹ

پھوٹ کر رو دی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر پھر باہر

نکلتا وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ہاتھ جوڑ

دیے۔

”خدا کے لیے رائف میرے ساتھ ایسا نہ کریں،

آپ کیوں یہ سب کر رہے ہیں ایک بار مجھے میرا

قصور تو بتائیں میری بات بھی تو سنیں، یوں وضاحت

کا موقع دیے بنا فرد جرم تو عائد نہ کریں پلیز آپ کو

اللہ کا واسطہ ہے۔ آج میں آپ کو اس کمرے سے

باہر نہیں جانے دوں گی اور اگر آپ گئے تو میں آپ

کے ابو کے سامنے یہ معاملہ رکھ دوں گی۔“ رائف نے

غصے سے اس کا بازو جکڑ لیا، اس کی سانس جیسے رک سی

گئی، وہ غریبا۔

درمیان کشیدگی کو صاف محسوس کر رہے تھے اور اس کی وجہ بھی بخوبی سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے کئی بار اس سے بات کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

”شادی سے پہلے آپ لوگوں نے مجھ سے ہر بات منوالی، اب یہ صرف میرا ذاتی معاملہ ہے، بہتر ہوگا کہ آپ لوگ اس معاملے میں نہ بولیں اور مجھے خود نمٹنے دیں۔ آپ لوگوں نے جتنا انہیں سرچڑھانا تھا چڑھا لیا، اب انہیں سر سے میں خود اتاروں گا۔“

مہوش کے میکے والوں کی طرف سے مکمل خاموشی تھی، کئی دن تک کسی نے مہوش کو بھی کوئی کال نہیں کی اور خود اس کا بھی دل نہیں چاہا کہ وہ ماں یا بہن کو کال کرے۔ رافع کے جانے میں محض ایک ہفتہ باقی تھا، وہ بری طرح ڈپریشن کا شکار ہو رہی تھی، بات بات پر رونا آ جاتا۔ سب کے سامنے شرمندگی کے خیال سے وہ زیادہ وقت کمرے میں گزارتی۔ رضیہ بیگم اس کا انضام محسوس کر رہی تھیں مگر وہ بے بس تھیں، اس کی دل جوئی کرتیں بھی تو کیسے۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتی تھیں کہ اس کا خیال رکھیں اور اس سے محبت بھرا رو بہ رکھیں۔ رضیہ نے بھی کئی بار ان دونوں کے درمیان کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی مگر رافع نے اسے بھی سختی سے ٹوک دیا۔ رافع کے جانے سے دو دن پہلے شاہدہ بیگم نے مہوش کے موبائل پر کال کی۔

”بیٹا رافع کو منانے کی کوشش کرو، کم از کم جانے سے پہلے ہی ایک بار آ کر مل لے یا اپنے جانے کے بعد تمہیں کچھ دن کے لیے بھیج دے۔“ وہ پہلے ہی متحائل تھی، ان کی بات پر بھڑکی۔

”خدا کے لیے امی اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ نے جتنی اپنی مرضی چلائی تھی چلا دیں اب مزید میری زندگی میں دخل اندازی کرنا بند کر دیں۔ اگر رافع مجھے آپ کے گھر نہیں بھیجتا چاہتے تو میں خود بھی نہیں آنا چاہتی۔ اگر آپ کا دل چاہے تو یہاں آ کر مجھ سے مل لیا کریں لیکن آج کے بعد مجھ

رافع کے اندر اتنی تلخی بھر چکی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ استہزاء سے اس میں ہنسا اور بولا۔

”ہونہ، صرف لفاظی۔“ اتنی لمبی بات کے بعد میں اس کا یہ رد عمل دیکھ کر مہوش کا دل ٹوٹ سا، وہ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”ایک منٹ آپ یہیں رکھیں۔“ لا کر کھول کر اس نے سارا زور اور دم کا لگافہ نکالا اور سب کچھ صاف کے قدموں میں رکھ دیا۔

”یہ لیں، لے جائیں یہ سب کچھ، مجھے کچھ نہیں بیسے سوائے آپ کی محبت اور اعتبار کے، اور یہ صرف میرے اور آپ کے بچا رہے گی، میں کسی نہیں بتاؤں گی۔“ رافع کے ذہن میں جمال کی اس گونجے لگیں، اس نے سب کچھ اٹھا کر بستر پر مالا اور بولا۔

”نکاح کے وقت اس حق مہر کا حوالہ دے کر سامندی لی گئی تھی، اب اسے واپس لینا مجھ پر حرام ہے۔ منہ سے نکلی بات اور مکان سے نکلا تیر کبھی واپس نہیں آتے، یہ تو پھر شرعی معاملہ ہے۔ میں نے یہ سب تمہیں دے دیا، اب یہ میں واپس نہیں لے سکتا۔“ مہوش پھر رو پڑی۔

”لیکن ان سب چیزوں نے میری خوشیاں نکل س لیں، مجھے وحشت ہوئی ہے یہ سب دیکھ کر، نہیں بیسے مجھے کچھ بھی۔“

”ان سب چیزوں نے میری بھی خوشیاں نکل دیں، مجھے بھی اب کچھ نہیں چاہیے زندگی سے۔“ وہ ہارے ہوئے لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

مہوش ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اب یہ رونا اس کے مقدر میں کب تک لکھا ہے لیکن اسے اپنی ماں اور خالہ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جن کی مادہ پرستی نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔

☆☆☆

رضیہ بیگم اور نذیر صاحب ان دونوں کے

سے اس موصوع پر لونی بات نہ لریں۔ اسی برتسر کریں کہ رافع نے آپ کے یہاں آنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔“

اپنی بات کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور ایک بار پھر رونے کے شغل میں مصروف ہو گئی۔ دو دن بعد رافع کی فلائٹ تھی اور پھر سال بعد ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہی سوچ سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ وہ غلط فہمیاں اور نفرتیں دل میں لیے ہی واپس جا رہا تھا۔ وہ بالکل بے بس تھی۔ اس ایک ماہ میں اس نے کئی بار کئی طریقوں سے اسے موم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو ایسا پتھر ہوا تھا کہ کوئی بات اس پر اثر کرتی ہی نہیں تھی۔ اس میں رافع کا بھی اتنا تصور نہیں تھا۔ اس مال و دولت کی چاہ میں کتنے ہی لوگوں نے اس کا دل دکھایا تھا، کتنے رشتے کھوئے تھے اس نے، گو کہ اب وہ سب بہت پچھتا رہے تھے لیکن اس کا ماضی تو دکھوں سے عبارت کر گئے تھے، جنہیں وہ چاہ کر بھی بھلا نہیں پارہا تھا۔

☆☆☆

جانے سے ایک دن پہلے وہ حق بابا سے ملنے گیا تو اس کے چہرے پر طال ہی طال تھا۔ مہوش کو دکھ دے کر وہ خود کب چین سے رہا تھا، لیکن اس کی انا آڑے آ رہی تھی۔ حق بابا نے بغور اسے دیکھا اور جلالی لہجے میں بولے۔

”خود انسان ہو کر بھی دوسرے انسان کو معاف نہیں کرتا اور رب سے معافی بھی چاہتا ہے اور رحمت بھی۔ دوسروں کی خود غرضی نظر آتی ہے اپنی نہیں آتی۔ معاف کرنا سیکھو ورنہ ساری زندگی بے سکون ہے گا۔ رب نے تجھے مالک بنایا ہے تو دل بھی مالک جیسا بنالے، وسیع اور بے غرض۔ غلام نہ بن۔“

اس کا سر جھک گیا۔ نجائے کتنی دیر تک وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اسی جھکے سر کے ساتھ اٹھا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح پلٹ آیا۔ گھر آیا تو رضیہ بیگم باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ اگلی رات بارہ بجے اس کی فلائٹ تھی اس لیے ربیعہ،

سیدہ دونوں اس سے ملنے آتی ہوئی تھیں وقت وہ دونوں بھی اپنے کمرے میں تھیں وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سامان پیک کرنے کے ساتھ ساتھ آنسو اس کے دل کو کچھ ہوا، زیادتی کا احساس دل میں جا گا لیکن انا مسلسل اسے پتھر روک رہی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ اب اگر مہو کی طرف قدم بڑھایا تو وہ پیچھے نہیں ہٹے وہ اپنے خول میں بند ہو گئی تھی۔ وہ خاموش پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا لیکن وہ اس کی طرا پینگ کرتی رہی۔ کام مکمل کر کے وہ باہر رافع سے رہانہ گیا۔

”ساری پینگ ہو گئی؟“ وہ رکی اور بولی۔

”جی، جو کچھ آپ نے نکال کر رکا پیک کر دیا۔ کچھ اور ہے تو بتادیں۔“

”باہر میز پر کچھ سامان رکھا ہے دو لیے لایا ہوں وہ بھی اس میں رکھنا ہے۔“

وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی، رافع کے ایک مہم س مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ لے کر اندر آئی اور پھر سے ٹرائی بیک کھول سیٹ کرنے لگی۔ وہ اٹھا اور اس کی مدد کر اس نے پھرتی سے چیزوں کی جگہ بنا کر سیٹ کر دیا اور پھر باہر جانے لگی تو وہ ایک با ”کھانا تیار ہو گیا کیا؟“

”جی وہی دیکھنے جا رہی ہوں۔“

”اگر ابھی کھانا تیار ہونے میں وا مجھے ایک کپ چائے بنا کر لا دو، میرے سر رہا ہے۔“

وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور، ماہ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ بار بار اسے کہہ رہا تھا۔ وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ کھانا میں کافی وقت تھا اس لیے وہ چائے بنا لاؤ

کہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور ہم خالی ہاتھ رہ جائیں۔ میری برداشت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ آف پلےز میرے حال پر رحم کریں۔“

رائع خاموش رہ گیا۔ کتنے ہی لمحے گزر گئے وہ روتی رہی سسکتی رہی اور رائع بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ رو رو کر تھک گئی تو خود ہی آنسو پونچھ کر لینے لگی، تب رائع نے اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ تھک کر اسے دیکھنے لگی۔ سرخ متورم آنکھوں نے اس کے دل کو باندھ لیا، وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”میں ایسا نہیں تھا مہوش، مجھے لوگوں کے دوغلے رویوں نے ایسا بنا دیا، اس پیسے کو لے کر سب نے میری ذات کو اس قدر بے مول کیا کہ میں سچ ہوتا گیا۔ میں سب برداشت کرتا رہا لیکن جب ساتھ دینے کا وعدہ کر کے عین وقت پر تمہارے گھر والوں نے بھی وہی کیا جو سب کرتے آئے تھے تو میری برداشت ختم ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں انہیں بتاؤں گا کہ وہ اپنی مرضی کا حق مہر تو لگھوا سکتے ہیں لیکن اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کا مقدر نہیں بدل سکتے۔ میں مانتا ہوں میں نے تمہیں دکھ دیا لیکن میں خود بھی سکھی نہیں رہا۔ مان لیتا ہوں کہ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں لیکن تم اپنے گھر والوں کے ہر مطالبے کا ساتھ نہ دینے لگو اس لیے تم پر سختی کی۔ میرے دل سے یہ سب اتنی آسانی سے نہیں نکلے گا لیکن میں کوشش کروں گا کہ اپنے اور تمہارے تعلقات کو بہتر بنا سکوں۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ مسکرایا تو مہوش بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

پھر رائع دہلی چلا گیا، مہوش کے پاس صرف چند گھنٹوں کی چند خوب صورت باتیں اور یادیں چھوڑ کر۔ پورا سال گزارنے کے لیے یہ کافی نہیں تھیں لیکن وہ مطمئن تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر رضیہ بیگم کو بھی یک گونہ سکون ملا۔ انہوں نے اسے کئی بار رائع سے کہا کہ وہ اب روز اپنی بیوی سے اسکا پ پر بات کیا کرے لیکن وہ ٹال جاتا۔ گو کہ وہ

میل پر رکھ کر پھر باہر نکل گئی۔ رائع اپنے سر پر پھیر کر رہ گیا۔ کھانے کے دوران سب نے اس پر معمولی خاموشی اور اداسی کو محسوس کیا لیکن وجہ سب جانتے تھے۔ سب کو پتا تھا وہ دہلی ہے اور کے دکھ پر سب کا دل بھاری ہو رہا تھا لیکن وہ رائع کی وجہ سے خاموش تھے۔ سارا دن وہ رائع کی کڑائی پھرتی رہی، بہت سا وقت اس نے کے بیٹے کے ساتھ گزارا، اسے سنبھالتی رہی، سے باتیں کرتی رہی لیکن کمرے میں نہیں گئی۔ گئے جب اسے یقین ہو گیا کہ رائع سوچنا ہوگا کمرے میں گئی اور یہ دیکھ کر اسے جھکا لگا کہ وہ نا جاگ رہا تھا بلکہ اپنے لیپ ٹاپ پر کسی کام مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر اپنی جگہ پر گئی۔ رائع نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور دھیمے لہجے بولا۔

”یہ میری اس گھر میں آخری رات ہے، پھر سال بعد ملاقات ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم کے گھر والوں کا خیال رکھو گی اور اس گھر کی بہو بلکہ بیٹی بن کر رہو گی۔ تمہارا جیب خرچ میں ہر مارے اکاؤنٹ میں منتقل کروانا رہوں گا تمہیں چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ پھر بھی اگر کبھی مزید پیسوں کی ضرورت پڑے تو مجھے میسج کر دینا میں میسج دوں اور بس۔ مہوش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ پڑی۔

”خدا کے لیے بس کر جائیں رائع، نہیں مجھے آپ کا پیسہ، سب کچھ لے لیں مجھ سے مجھے اپنا اعتبار دے دیں۔ کل آپ کی واپسی ہے اس کے بعد پورا سال کس نے دیکھا ہے کون ہے کون مرتا ہے۔ کسی کے پاس اپنی اگلی سانس کی نہیں اور آپ اتنا لمبا انتظار سو نہ کر جا رہے کیوں اتنی لمبی سزا تجویز کر رہے ہیں میرے۔ آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا؟ کتنی بار ہاتھ جوڑ معافی مانگی ہے اس غلطی کی جو میں نے کی بھی، لیکن آپ اتنے پتھر دل ہیں کہ پھلتے ہی

اپنی بات کا اثر اس نے لے لیا۔
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے مہوش،“
 سے دے رہا ہوں تم محسوس نہ کرو۔“
 ”رائع میں جانتی ہوں کہ آپ بہت
 پونجی مجھ پر لٹا چکے ہیں جبکہ میرے لیے آ
 زیادہ اہم ہے۔ اب اگر آپ اسی طرح
 پر لٹاتے رہے تو جمع کیسے کریں گے۔ میر
 آپ نے ساری عمر دینی میں نہیں گز
 کاروبار کے لیے پیسہ جوڑنا ہے۔ اس۔
 پیسے نہ بھیجیں، اگر آپ کو نکاح نامے کے
 ہے تو آپ ابو سے کہہ دیں وہ مجھے دو
 کریں، میرے اخراجات کے لیے یہ بہ
 کیونکہ ابھی میرے پاس سب کچھ موجد
 مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ
 پاس جوڑیں۔“

رائع کو اس کے خلوص پر اعتبار آ
 مسکرایا اور بولا۔

”جو لکھ دیا وہ تو پورا کرنا ہے، ٹھیک
 پانچ ہزار ہی بھیجا کروں گا لیکن تمہارا
 اکاؤنٹ میں۔ چاہو تو خرچ کچھ چاہو
 رہو۔ کل کو تمہارے کام بھی آسکتے ہیں۔
 لہجے کی نرمی محسوس کر کے وہ مسکرا دی۔
 رہی تھی، دیر دیر سے ہی تھی۔

☆☆☆

وقت دیر دیر سے سر کے لگا
 خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ ر
 کپڑے برتن دھونے اور صفائی کے لیے
 تھی۔ کھانا وہ خود پکاتی تھیں اور مہوش
 کرداتی، لیکن پھر اس کے کرنے کو کوئی کا
 تھا۔ وہ سارا دن فارغ بیٹھی بور ہو جاتی
 اصرار پر انہوں نے برتن دھونے کا ذمہ
 لیا۔ پھر بھی تین لوگوں کے پھلا کتنے برتن
 پھر فراغت سے تنگ ہونے لگی۔ کبھی المیا
 کر سننے سرے سے ترتیب دینے لگتی،

جائے ہوئے اس سے مارا نہیں تھا جس ان کے
 جو ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی وہ اتنی جلدی کرنے
 والی نہیں تھی۔ وہ اسکا پ پر اس سے تنہائی میں بات
 کرنے سے کتراتا تھا اس لیے اسے صرف کال کر لیا
 کرتا وہ بھی ہفتے میں ایک بار اس وقت جب حق بابا
 کی باتیں اس کے دماغ میں گونج کر شور مچاتیں۔ چھ
 سات منٹ کی کال کر کے وہ اپنے دل کو یہ سمجھاتا کہ
 اس نے اپنا دل وسیع کر لیا ہے۔ مہوش اسی میں خوش
 تھی۔

ایک ماہ بعد مہوش کے موبائل پر بینک کی طرف
 سے منیج موصول ہوا کہ اس کے اکاؤنٹ میں دس ہزار
 روپے منتقل کیے گئے ہیں۔ یہ رائع کے سوا کون ہو سکتا
 تھا بھلا۔ اس نے اسی وقت کال ملائی، رائع نے فون
 اٹھاتے ہی پوچھا۔

”مل گئے پیسے؟“ اس نے ایک گہری سانس
 اندر کھینچی اور ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

”جی مل گئے، مگر کیوں بھیجے آپ نے؟“
 ”تمہارا جیب خرچ ہے، جو نکاح کے وقت
 طے ہوا تھا۔“ اذیت کی ایک لہر اس کے اندر تک دوڑ
 گئی۔

”لیکن نکاح کے وقت دس نہیں پانچ ہزار طے
 ہوئے تھے۔ گو کہ مجھے ان پانچ ہزار کی بھی ضرورت
 نہیں ہے کیونکہ آپ کی امی میری ہر ضرورت کا
 میرے کہے بغیر ہی خیال رکھتی ہیں۔“ وہ ہلکے سے
 ہنسا، اپنی ماں کی تعریف پر خوش بھی ہوا۔

”پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ طے شدہ رقم
 سے دگنی مل رہی ہے، میں فورڈ کر سکتا ہوں اس لیے
 بھیج دیے۔“ اس کے انداز میں غرور سادرا آیا، مہوش
 کو دکھ ہوا۔

”مجھے لگا تھا کہ آپ نے یہ سب تلخیاں بھلا
 دی ہیں، لیکن لگتا ہے آپ کچھ بھولنا چاہتے ہی نہیں
 ہیں۔ آپ ہمارے درمیان فاصلے ختم کرنا ہی نہیں
 چاہتے اور یہ پیسہ ہمارے درمیان ہمیشہ دیوار بن کر
 کھڑا رہے گا۔“ رائع ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ پھر

نے لے سارے سینٹ خالی کر لے۔ جیسی صفائی
نے بیٹھ جاتی، کبھی رضیہ بیگم سے کہہ کر بیچہ سنیہ
دعوت پر بلا لیتی تو ڈھیر سارے کھانے پکائی۔ پھر
پنے اور ساس سر کے دھلے کپڑے استری کرنے
مڑی ہو جاتی۔ رضیہ بیگم کہتیں۔

”بیٹا تھک جاؤ گی کچھ دیر آرام بھی کر لیا کرو۔
نی کام میرے کرنے کے لیے بھی چھوڑ دو، یوں تو
ری ہڈیاں بھی آرام طلب ہو کرنا کارہ ہو جائیں
۔“

ان کی بات پر وہ منہ بسور کر کہتی۔
”تو پھر کیا کروں امی، میں بور ہو جاتی ہوں،
ر نے کو کوئی کام ہی نہیں چجتا، کتنا آرام کروں، لی
س بھی کتنا دیکھوں۔“ وہ جواب میں پیار سے
تیں۔

”رافع سے بات کر لیا کرو، شاپنگ پر چلی جایا
رو، میکے تو وہ ظالم تمہیں جانے نہیں دیتا لیکن تم تو
میں یہاں بلا سکتی ہو، کبھی انہیں دعوت پر بلاؤ، کبھی
نی کسی سہیلی کو بلاؤ، کبھی خود چلی جاؤ۔ لو دیکھو بھلا
ھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ مریم بھی تو تمہاری سہیلی
ہے۔ تم وہاں چلی جایا کرو، اسے ریحہ کا سسرال سمجھ
ر اس کی بھابی کی حیثیت سے نہیں اپنی سہیلی کی
طر چلایا کرو۔“ اس بات پر وہ خاموش ہو گئی۔ اگلی
رافع کا فون آیا تو اس نے پوچھا،
”اگر آپ برانہ نامیں تو میں کبھی بھی مریم سے
لنے چلی جایا کروں؟“ دوسری طرف گہری خاموشی
ھا گئی۔ مہوش نے سہم کر ہونٹ دانتوں تلے دبایا
ر آنکھیں بند کر کے رافع کی جلی کٹی سننے کے لیے خود
تو تیار کرنے لگی، لیکن خلاف توقع اس نے نرمی سے
واب دیا۔

”چلی جایا کرو، بلکہ باقی دوستوں کے گھر بھی
ا سکتی ہو، میں ابو سے کہہ دوں گا تمہیں چھوڑ آیا
کریں۔“ احساس تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ
گئیں۔

”شکریہ رافع۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ اسے خود ہی

اس کی سنہاں کا احساس ہوتا چاہیے تھا۔
”مہوش، کیا تم جانتی ہو کہ میں تمہیں تمہارے
میکے کیوں نہیں جانے دیتا۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں
اپنی غلطی کا احساس ہو، جو انہیں اب تک نہیں ہوا، اور
اس لیے بھی کہ وہ تمہیں مزید کوئی الٹی پٹیاں نہ
پڑھائیں۔ مجھے احساس ہے کہ تم تنہائی محسوس کرتی
ہو۔ اس لیے تم چاہو تو ان کے علاوہ کہیں بھی جا سکتی
ہو تم پر کوئی پابندی نہیں۔ میں امی سے کہوں گا تمہیں
خاندان والوں سے ملو امیں باری باری سب کے گھر
لے کر جائیں، تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور
مصرف بھی ہو جاؤ گی۔“ دو چار باتوں کے بعد اس
نے فون بند کر دیا اور پھر ماں باپ کو فون کر کے سمجھا
دیا۔

اگلے ہی دن رضیہ بیگم اسے نگار بیگم کی طرف
لے گئیں اور پورا دن وہیں گزارا۔ ان کی بہو سفینہ
سے مہوش کی اچھی دوستی ہو گئی۔ چند دن بعد اچانک
شاہدہ بیگم اس سے ملنے آ گئیں۔ اس بار ان کے تیور
کافی بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔ آتے ہی بولنے
شروع ہو گئیں۔

”رضیہ بہن! ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی
آپ نے تو ہماری بیٹی کو گھر میں قید کر کے رکھ دی
ہے۔ آپ کی اپنی بھی بیٹیاں ہیں، وہ تو میکے بھی آتی
ہیں اور رائیں بھی گزارتی ہیں، میری بیٹی کو کیا آپ
اپنی اور اپنے خاندان کی خدمت کے لیے بیاہ کر لاؤ
تھیں۔ اس کے ابو کو بھی بہت غصہ ہے آپ لوگوں پر
اور انہوں نے ہی مجھے بھیجا ہے۔ آج میں ہر صورت
مہوش کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی اور ایک ہفتے بعد
ہی واپس لاؤں گی۔“

پیسے آ جانے کے باوجود بھی رضیہ بیگم کی ساد
طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ان کی باتوں
کے جواب میں مسلسل خاموش رہیں لیکن مہوش
خاموش نہیں رہی۔ وہ تنک کر بولی۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی امی۔
مجھے میرے شوہر کی طرف سے اجازت نہیں ہے اور

— پس — رو — رو — یہ پیراں
 معاملہ ہے اس لیے آپ مجھ پر زور بردستی نہیں کر
 سکتیں۔ آپ نے اپنی مرضی کر لی ہے اب میں آپ
 کا نہیں اپنے شوہر کا حکم ماننے کی پابند ہوں۔ دوسری
 بات یہ کہ میں یہاں قید نہیں ہوں، رضیہ امی مجھے
 اپنے ساتھ ہر جگہ لے کر جاتی ہیں اور میں اپنی
 سہیلیوں کے گھر بھی جاتی ہوں مجھ پر اس سلسلے میں
 کوئی پابندی نہیں۔ ہاں ایک بات آپ کے لیے
 جاننا بہت ضروری ہے کہ رافع باقاعدگی سے ہر ماہ
 مجھے میرا جب خراج بھجواتے ہیں اور شادی کی رات
 ہی میرا حق مہر بھی مکمل ادا کر دیا تھا۔ رہی بات
 خدمت کی تو یہاں ہر کام کے لیے ملازمہ ہے جو آپ
 کے گھر میں بھی نہیں، اس لیے یہاں میں اپنی فارغ
 ہوتی ہوں کہ سارا دن ٹی وی دیکھ کر گزارتی ہوں۔
 آپ لوگ مجھ سے ملنا چاہیں تو یہاں آ سکتے ہیں آپ
 پر کوئی پابندی نہیں۔ میں آپ کے لیے کھانا بنا رہی
 ہوں، کھا کر جائیے گا۔“

اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔
 شاہدہ بیگم اس کی باتوں پر اس قدر راجہ پا ہوئیں کہ
 ایک لمحہ کے بتا باہر نکل گئیں، رضیہ بیگم انہیں روکتی رہ
 گئیں۔ وہ باورچی خانے میں آئیں تو مہوش آنسو
 ضبط کرنی کھانا بنا رہی تھی۔ انہوں نے اسے اپنی
 طرف موڑا اور بولیں۔

”تم نے اچھا نہیں کیا بیٹا، ماں کے ساتھ ایسا
 نہیں کرتے۔ وہ بہت دگھی ہو گئی ہیں۔“

ان کی اس بات پر اس کا ضبط جواب دے گیا۔
 وہ چولہا بند کر کے باہر نکل آئی اور رو پڑی۔

”تو کیا بیٹی کے ساتھ ایسا کرتے ہیں جیسا
 انہوں نے میرے ساتھ کیا؟ میری چند باتوں پر وہ
 اتنی دگھی ہو گئیں اور انہوں نے میری پوری زندگی کو
 دکھوں کی نذر کر دیا انہیں اس بات کا ذرا بھی احساس
 نہیں۔ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا بھی کر
 ہے؟ میں نے ایسا کیا کر دیا امی، میں نے ان کا
 گریبان نہیں پکڑا، ان سے سوال نہیں کیا کہ انہوں

سے میری رمدیں یوں ہے اسباب
 ان کی وجہ سے میرے ساتھ جو سلوک
 میں ہی جانتی ہوں۔ مجھے رافع سے
 میری اپنی ماں نے میرا احساس نہیں
 شکوہ کروں جن کی زندگی میں مجھے آ
 شامل کر دیا گیا۔ وہ میرے ساتھ یہ سلوک
 حق بجانب تھے لیکن میری تو دنیا لٹ
 شوہر نے پہلے دن کی دہن کو نظر بھر کر
 اسے دھکار کر منہ موڑ لیا۔ وہ مجھے جس
 گے انہیں اپنے خوابوں کی کرچیاں پہ
 بکھری نظر آئیں گی اور وہ پھر سے
 اس لیے وہ مجھے دیکھتے ہی نہیں۔ امی کا
 دکھ کا اندازہ کر سکتی ہیں؟ اب اگر سہ
 جائے تب بھی کیا میری شادی کے وہ ا
 کر آ سکتے ہیں؟ نہیں! اور یہ سب ک
 ہوا۔۔۔ میری ماں کی وجہ سے، ان کی
 ضد کی وجہ سے۔ میں اس کے لیے
 کرنے کا خود میں حوصلہ نہیں پاتی۔“
 رضیہ بیگم کا دل کٹ گیا۔ مذہم
 اپنے کمرے میں بیٹھے اس کی سب بات
 وہ بے اختیار بہت ادو نچا بول رہی تھی۔
 میں بھی آنسو آ گئے۔ رضیہ بیگم نے ا۔
 وہ اس بری طرح بلک بلک کر روئی کہ ا
 محال ہو گیا۔ نذیر صاحب سے رہا نہ بگ
 گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چھپتے
 سی ہو کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔
 ”رافع کو معاف کر دینا بیٹا، وہ د
 ہے، لیکن حالات نے اسے یہ بنا دیا۔
 ہو جائے گا اپنی غلطی کا۔ اس کی طرف۔
 معافی مانگتا ہوں۔“ مہوش نے تڑپ کر
 اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

☆☆☆

شاہدہ بیگم گھر جا کر خاموش نہیں
 نے گھر پہنچتے ہی ساری بات حسینہ

”رائع“ وہ اتنا زور سے پتلی کہ اس کی آواز رضیہ بیگم اور نذیر صاحب نے اپنے کمرے میں سنی۔ وہ دونوں دوڑ کر اس کے کمرے میں گئے، وہ بری طرح ہلک رہی تھی۔ بین کر رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ رضیہ بیگم کو لگا ان کا دل بند ہو جائے گا۔

”کیا ہوا ہے مہوش خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ۔“ وہ دونوں اس کی منت ساجت کرنے لگے لیکن وہ اپنے آپ میں ہی نہیں تھی۔ اسی وقت نذیر صاحب کا موبائل بجایا، انہوں نے جیب سے نکال کر دیکھا تو رافع کا نام ابھر رہا تھا۔ انہیں شک تو ہو گیا تھا کہ مہوش کو بھی اسی نے کچھ کہا ہوگا۔ کال اٹھائی تو رافع بنا سلام دعا کے بولا۔

”ابو، مہوش کو ابھی اور اسی وقت اس کے میکے چھوڑ آئیں، میں مزید اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔“

نذیر صاحب کا خون غصے سے ابلنے لگا، وہ زور سے بولے،

”کیا بکواس ہے یہ رافع، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے ہم تمہاری فضول حرکتیں صرف اس لیے برداشت کر رہے ہیں کہ تم اپنا معاملہ خود سلجھا لو، لیکن تمہاری تو عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ یہی بکواس کی ہے تم نے اپنی بیوی سے؟ جانتے ہو کیا حال ہو گیا ہے اس بے چاری پتلی کی، پاگلوں کی طرح رو رہی ہے، کیوں پرانی بیٹی کی آہ لے رہے ہو؟ تمہاری اپنی بھی دودھ نہیں ہیں خوف خدا مر گیا ہے کیا تمہارا؟ ہوا کیا ہے اچانک تمہیں؟ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ابھی تمہارے ماں باپ مرے نہیں ہیں اس لیے انہیں بھی کسی قابل سمجھ لو، سارے فیصلے خود کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ہم مرجائیں تو پھر جو جی میں آئے کرنا۔“

نذیر صاحب بے حد تحمل مزاج تھے، اپنی پوری زندگی میں رافع تو کیا خود رضیہ بیگم نے بھی انہیں کبھی اونچا بولتے نہیں سنا تھا کہ اس قدر چیخ چلا کر اتنے سخت الفاظ میں ڈانٹنا۔ وہ دل پر ہاتھ

بر رافع کو کال ملا کر بے نقط سنائیں۔ حسنین نے بھی اس سے کافی سخت انداز میں بات کی اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کی بیٹی پر مایا بندیاں لگائیں تو وہ لوگ اس کے خلاف سخت دوائی کریں گے۔ مہوش نے جو کچھ کہا وہ انہوں کی کوئیں بتایا۔

حسنین صاحب کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ رافع اس رویے کی اصل وجہ حق مہر کا جھگڑا ہے۔ شاہدہ نے بالا ہی بالا سب معاملات طے کر کے انہیں بتا دیا تھا کہ رافع ان کے مطالبات پر بخوشی راضی ہوا اس لیے وہ اب تک اچنبھے کا شکار تھے کہ رافع پینٹر اکیوں بدل لیا اور وہ روایتی سخت گیر شوہر بن گیا۔ شاہدہ بیگم کی کال بند ہوتے ہی رافع مہوش کو کال ملائی اور کہا،

”تم آج ابھی اور اسی وقت اپنے میکے چلی آؤ۔“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ بات رافع نے کہی ہے، وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی۔ ”جی۔ کیا مطلب؟“ اس کے معصومیت سے نے پر رافع کو مزید غصہ آ گیا، وہ دھاڑ کر بولا۔

”میں نے کہا ابھی اور اسی وقت اپنی ماں کے چلی جاؤ اور واپس آنے کی ضرورت نہیں، میں نہیں آزاد کر کے اپنے راستے الگ کر لوں گا۔“ مہوش پر تو جیسے سات آسمان ٹوٹ پڑے۔ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا، آواز بھی کپکپانے

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ..... کیوں..... میں نے کیا کیا ہے؟“

”میرے سامنے میری فرماں بردار بیوی بننے کا رامہ کرنی ہو اور پیٹھ پیچھے اپنے ماں باپ کو بے خلاف بھڑکانی ہو۔ اگر تمہیں واقعی لگتا ہے کہ ظالم جاہل شوہر ہوں اور تم میری قید میں تنگ ہو تو چلی جاؤ اور کبھی لوٹ کر مت آنا۔ میں ابھی امی کو کر کے کہہ دیتا ہوں کہ تمہیں واپس بھجوا دیں، ساتھ جس بھیں تنگ تھا، خدا حافظ۔“

رات کے گیارہ بج رہے تھے، کمر روشنی پھیلی تھی، مہوش بستر پر لیٹی گہری۔ جب اس کے تنکے کے پاس ارتعاش سا چونک کر دیکھا، رافع کی کال آرہی تھی اسکرین پر چمکتے اس کے نام کو دیکھتی رہی؛ لی۔ وہ اس کی کال نہیں سنتا جانتی تھی، ناراضی جتانے کا۔ کال بند ہوئی، ایک موبائل بجنے لگا، اس نے پھر نظر انداز کر کے بند ہوئی۔ تین چار مرتبہ کال آنے کے ”میں جانتا ہوں تم بارہ بجے۔“ سوئیں، میری کال اینڈ کرو۔“ اس۔ موبائل واپس رکھ دیا۔ پھر سے کال آنے لگی۔ وہ مسلسل آدھا گھنٹہ کرتا رہا لیکن وہ ڈھیٹ بنی رہی۔ آخر اس نے ”اب اگر تم نے کال ریسیونہ کی تو ابو کے موبائل پر کروں گا۔“

وہ جھلا کر اٹھ بیٹھی اور دوبارہ آ۔ ریسیونہ کر لی لیکن خاموش رہی۔ دوسری طرف ہنس کر بولا۔

”میں پہلے ہی یہ دھمکی دے دیتا برباد نہ ہوتا۔“ وہ پھر بھی خاموش رہی۔

”بات تو کرو مجھ سے، جانتا ہوں لیکن میری پوزیشن بھی تو سمجھو، تمہاری اُٹھان میں ایسے ایسے الفاظ استعمال کیے کوئی بھی ہوتا تو بچھڑ جاتا۔“ وہ پھر بھی بیٹھ دیر وہ بھی خاموش رہا لیکن جب وہ بالکل دھیرے سے کہا۔

”کیا چاہتی ہو۔ سوری بولوں، ہاتھ مانگوں؟“ اور وہ کھل گئی، نرڈھے انداز میں ”میں نے ایسا نہیں کہا۔“

”تو پھر۔ بات کیوں نہیں کر رہی؟“ وہ پھر خاموش ہو گئی۔ چند لمحے دو خاموشی طاری رہی پھر رافع کو ہلکی سی سسکی

رہے ساتھ ہڑپا میں، مہوش ہی روتا بھول لراہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف رافع بھی گنگ ہو گیا۔ اس کے لیے بھی باپ کی ڈانٹ کا یہ انداز بالکل غیر متوقع تھا، وہ یکدم ٹھنڈا پڑ گیا، پھر ساری بات انہیں بتادی۔ ساری بات سن کر نذیر صاحب کو مزید غصہ آیا اور انہوں نے ایک بار پھر انتہائی غصے میں شاہدہ بیگم کی آمد اور مہوش کی ان سے بات چیت تفصیل سے بتادی۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا۔

”مجھے بتاؤ شروع سے لے کر آخر تک سارے معاملات میں مہوش کا قصور کہاں تھا؟ اگر اس کی ماں ایسی ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور؟ انہوں نے اپنی طرف سے یہ ساری باتیں کہی ہیں ورنہ مہوش تو تمہاری ساری پابندیاں ہنس کر سہہ رہی ہے۔ ایک دن بھی ہم نے اس کی آنکھ میں آنسو یا لیلوں پر شکوہ نہیں دیکھا۔ اسے جو بھی شکوہ ہے صرف اپنی ماں سے ہے۔“ رافع بری طرح شرمندہ ہو گیا اور فون بند کر دیا۔ مہوش نے احساس تشکر سے مغلوب ہو کر نذیر صاحب کے ہاتھ تھام کر چوم لیے اور بولی۔

”میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں ابو اگر آپ رافع سے بات نہ کرتے تو نجانے میری زندگی کا کیا نقشہ ہوتا۔۔۔۔۔“ وہ ایک بار پھر رو دی۔ نذیر صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شفقت سے بولے۔

”خود کو تنہا بھی مت سمجھنا بیٹی، تم ہمارے لیے کسی طرح بھی رنجیدہ سنیچہ سے کم نہیں ہو، جو بھی مسئلہ ہو بلا جھجک مجھے یا رضیہ کو بتا دینا اور کوئی بھی بات کرتے ہوئے یہ نہ سوچنا کہ یہ بات تم ساس سر سے کہہ رہی ہو، ماں باپ سمجھ کر کہنا۔ ابھی ہم زندہ ہیں اور جب تک ہم زندہ ہیں تم پر کوئی آج نہیں آنے دیں گے۔ اور اس رافع کی تو میں خبر لوں گا اس بار جب آئے گا تو کڑی شرائط طے کرواؤں گا تمہیں خوش رکھنے کی۔ ایسی شرائط لکھواؤں گا کہ تمہاری امی نے بھی کیا لکھوائی ہوں گی۔“

انہوں نے شرارتی انداز اپنایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ رضیہ بیگم نے بھی ہنس کر اسے گلے لگا لیا۔

ہیں۔ اب اکرائی کو ان کی سطحی کا احساس دلانا ہے تو اس ساری بات کو کھول کر سامنے لانا ہوگا جس کے لیے میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے میں ابو کو یہاں بلا کر تو یہ سب نہیں بتا سکتی، انہیں بے عزتی محسوس ہوگی، نہ ہی یہ کوئی اتنی چھوٹی بات ہے جو میں فون پر کر دوں۔ کل گوزرش کی بھی شادی ہوتی ہے اس کے سلسلے میں بھی کوئی ایسی کوتاہی ہو سکتی ہے، یہاں تو آپ کے والدین میری ڈھال بن گئے، خدا جانے اسے کوئی ایسا طے نہ ملے۔ سو اس بات کو کھول کر بیان کرنا ضروری ہے ورنہ وہ بھی نہیں سمجھ پائیں گی اور ابو آپ سے بدگمان ہوتے چلے جائیں گے جو کہ میں بالکل نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں ہم سب کے تعلقات نارمل رہیں۔ میرا اور کوئی مقصد نہیں۔ آپ چاہیں گے تو میں اس کے بعد دوبارہ بھی اپنے میکے کا رخ نہیں کروں گی لیکن انہیں ایک بار تو یہ سب بتانا ہے نا کہ وہ نادانی میں اپنی ہی اولاد کا کتنا بڑا نقصان کرنے چلی تھیں۔ کیا آپ میری بات کو سمجھ رہے ہیں؟“

رافع نے اس کی بات سن کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

”ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ خاموش رہ کر کچھ کے لگانے سے واقعی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ انہیں وہاں جا کر سمجھانا پڑے گا۔ ٹھیک ہے تم جب جانا چاہو چلی جانا، بات کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری ان سے کوئی جانی دشمنی نہیں ہے بس یہی مقصد تھا کہ وہ اپنی غلطی کا احساس کریں۔“

”تھینک یو سوچ رافع۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے سمجھا۔“ وہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

مسلل بجتی تیل پر اظفر نے جھنجھلاتے ہوئے گیٹ کھولا تو دنگ رہ گیا۔

”مہوش تم.....“ وہ مسکرا کر اس کے گلے لگ گئی۔ اس کا ماتھا چوم کر اظفر نے چلانا شروع کر دیا،

”امی..... زرش..... دیکھو کون آیا ہے۔ جلدی آئیں سب۔“

دکائی کی گہرائیوں میں جیسے کرتا چلا گیا۔ کچھ دیر سسکیاں سننا رہا پھر دھیرے سے بولا۔

”سنو! آتم سوری، معاف کر دو پلیز۔“ اس نے کراہتے آسو پونچھے اور سوسوں کرنی بولی۔

”کوئی بات نہیں۔“

وہ کہے۔ اب کوئی اچھی سی بات کرو، جس دونوں کا موڈ اچھا ہو جائے۔ تمہیں پتا ہے میں بہت اکیلا پن محسوس کرتا ہوں اس لیے رنج ہو جاتا ہوں۔ تم میری باتوں کو دل پر مت

ہوش نے چند لمحے خود پر قابو پانے میں صرف پھر اس سے دو ٹوک بات کرنے کا سوچا۔

”رافع میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، مدد کریں میری بات مکمل ہونے تک خاموش رہیں گے، بیچ میں نہیں بولیں گے۔“

”اوکے وعدہ، کہو میں سن رہا ہوں۔“

”میں پہلے دن سے اس بات کی قائل ہوں کہ اس کا مطالبہ سراسر غلط تھا اور آپ پہلے دن مجھ پر یقین نہیں کر رہے۔ انہیں سبق سکھانے لیتے آپ نے اپنا یا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”آج بھی یہ بات سمجھ نہیں پاتی ہیں کہ آپ رویتے کے پیچھے اصل وجہ کیا ہے۔ شاید انہیں مزہ ہوا بھی ہو لیکن وہ یہ بات اپنی زبان پر نہیں لیں گی کیونکہ ابو اس معاملے سے بالکل بے خبر۔“

”امی نے انہیں یہی بتایا تھا کہ آپ ہر پر خوشی راضی ہوئے ہیں اور آپ لوگ ان بٹل کرنے کی کوشش نہ کریں، اس لیے ان نے امی نے آف کر کے چھپا دیا تھا۔ وہ یہی ہے کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں یا چوری ہو گیا۔“

”میرا شادی کی تقریبات میں انسان کسی کے پر کم ہی دھیان دیتا ہے اسی لیے ابو نے بھی اس نہیں کیا اور انہیں لگا کہ آپ نے ان کے نرمال برادر اور سلجھے ہوئے نوجوان کا بہرہ واپس آپ چلے اور اب آپ اپنی اصلیت میں واپس آ چکے

شاہدہ بیگم اور زرش بھائی بھائی برآمدے لے دروازے پر آئیں تو حیرت سے ان دونوں کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں، پھر شاہدہ بیگم پر لرزہ طاری ہو گیا، مبہوش ان کے قریب آئی تو وہ اس کا چہرہ مٹولنے لگیں۔

”مبہوش۔ تم اکیلی..... سب خیریت تو ہے۔ کہیں رافع نے تمہیں..... مبہوش.....“ وہ تو جیسے ہذیانی سی ہو گئیں۔

مبہوش نے ان کا ہاتھ تھام کر دایا اور تسلی دی۔
”سب خیریت ہے امی ایسا کچھ نہیں ہے جو آپ سوچ رہی ہیں، رافع نے اپنی خوشی سے مجھے بھیجا ہے۔ آئیں اندر تو چلیں نا۔“

وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کے ساتھ کھٹکتی ہوئی اندر آئیں اور پھر بول پڑیں۔
”مگر مبہوش! وہ تو نہیں مانتا تھا، پھر اچانک.....

مجھے سچ بتاؤ بیٹا۔ میرا دل بند ہو جائے گا۔“
”امی میں سچ کہہ رہی ہوں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ یہ لیں آپ بے شک رافع کو کال کر کے خود پوچھ لیں۔“

اس نے اپنا موبائل ان کی طرف بڑھایا تو ان کی سانس بحال ہوئی۔

”یا اللہ تیرا شکر۔“ ان کا یہ رد عمل اس کی سمجھ سے باہر تھا، وہ گہری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”صرف ایک سوچ سے ہی آپ کا خون چڑ گیا امی، پھر نکاح کے وقت وہ انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے آپ کا دل کیوں نہیں کانپا۔ آپ نے تب کیوں نہیں سوچا کہ آپ کا وہ مطالبہ میری پوری زندگی کو گرہن لگا سکتا ہے۔“

وہ یہ بات یوں جاتے ہی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ماں کی حالت دیکھ کر اسے لگا لوہا اس چوٹ کے لیے مناسب حد تک گرم ہے۔ سو اس نے چوٹ لگا دی اور شاہدہ بیگم نجائے کب سے دل میں غبار جمع کے بیٹھی تھیں، ایسا روئیں کہ ان تینوں سے سنبالنا مشکل ہو گیا۔ اسی وقت حسنین صاحب بھی آگئے اور

ان کا جی وہی حال ہوا جو شاہدہ بیگم کا ہوا۔ مبہوش نے سب سنبھال لیا۔ اس نے سب سنایا، پہلے دن سے لے کر آخر تک ہر احوال۔۔۔ انہیں شاہدہ بیگم پر غصہ تو بہت آیا کی حالت کے پیش نظر وہ ضبط کر گئے۔ پھر نے اسی وقت رافع کو کال ملا کر معافی مانگی، شاہدہ نے بھی اس سے معافی مانگی، رافع نے بھی دا کرتے ہوئے اپنا دل صاف کر لیا۔

”حق مہر، لڑکی کا حق ہوتا ہے، خوشی ضامن نہیں۔ اس حق کو باہمی رضامندی اورا کے جذبے کے تحت طے کیا جائے تو برکت رہے ورنہ بربادی ہی بربادی۔ شوہر کی محبت اور اعتما نعم الہیل نہیں۔“ مبہوش کی بات ان کے دا نقش ہو گئی۔

☆☆☆

ماں باپ بہن بھائی کے ساتھ ایک بھرا گزار کر جب وہ رات کو زرش کے ساتھ اپنے میں سونے کے لیے لیٹی تو زرش بولی۔
”مبہوش تمہیں یہاں ہے تمہیں دیکھ کر ا حالت اتنی کیوں بگڑ گئی تھی؟“ مبہوش چوٹی۔

”کیا مطلب؟ وہ پریشان ہو گئی تھیں بے لیے۔“ زرش مسکرا کر اس کے سامنے آ بیٹھی اور پوچھا۔
”جب رافع بھائی نے ہماری دعوتیں دیں، تمہارے یہاں آنے پر پابندی لگا دی پر تو انہیں تب ہونا چاہیے تھا نا، تب تو وہ پریشان ہو گئی تھیں بلکہ غصہ ہوئی تھیں۔“ مبہوش نے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“
”مطلب یہ کہ دو دن پہلے ہم لوگ زاہد کے گھر گئے تھے، خالو نے فون کیا تھا کہ ان کی بہت خراب ہے آ کر دیکھ جائیں۔ جب ہم گئے تو انہیں بھی موجود تھی۔ امی کو دیکھ کر زاہدہ خا بالکل اسی طرح رونا شروع کر دیا تھا جیسے امی دیکھ کر روئیں۔ ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ بہت

سے قابو کر کے انہیں دوا دی تو اس کے اثر سے وہ سو گئیں، انہم نے بتایا کہ ایک ہفتے سے وہ ان دواؤں پر ہیں، جاگتی ہیں تو رونے لگ جاتی ہیں۔“
زرش خاموش ہو گئی تو مہوش بے چینی سے بولی۔
”مگر کیوں، خالہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں اچانک کیا ہوا انہیں؟“ زرش کی آنکھوں میں اداسی درآئی۔

”انہم کے ساتھ دھوکا ہوا۔ اس لیے.....“
مہوش کے سر پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو روکا۔
”کیسے..... مطلب..... کیا ہوا ہے انہم کے ساتھ۔“

”زاہدہ خالہ کی لالچ کا پھل ملا اور کیا۔ انہم کا شوہر دینی میں عام سامزدور ہے اور اتنی خاص تنخواہ نہیں ہے، بامشکل گزارہ ہوتا ہے، لیکن خالہ نے فرمائشوں کی فہرست جاری کر دی اور اپنی طرف سے بگڑے جہیز کی جھلک بھی دکھائی۔ انہیں بھی لالچ نے گھیر لیا۔ عروسی بلبوسات انہوں نے کرائے پر اٹھائے، بری کے جوڑے خاندان بھر کی نئی دلہنوں سے ادھار لیے، سونے کا پانی چڑھے نعلی زیورات بنوائے، خود بھی سب نے مایکے کے کپڑے پہنے، شادی ہال مہنگا والا کرنا مجبوری تھی سو اس کے لیے دو جگہ سے قرض اٹھایا اور شادی کے بعد انہم کی ساری سلامیاں چھین کر قرض چکایا۔ اس کے جہیز کا زیور چھین کر باقی اخراجات پورے کیے اور یوں شادی نہیں مفت کی پڑ گئی۔ بعد میں جس جس کے جوڑے لیے گئے تھے وہ سب باری باری آکر اس کی الماری سے اپنے کپڑے لیتی گئیں اور اس کے پاس بری کے نام پر تنکا تک نہ بچا۔ اس نے شور مچایا احتجاج کیا تو اسے میکے بھیج دیا۔ خالہ خالو نے بزرگوں کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب لڑکی کو اپنے ہی گھر بٹھائیں، نہ ہم واپس لے کر جائیں گے نہ ہی طلاق دیں گے۔ خالہ مجبور ہو کر خود انہم کو چھوڑنے لگیں لیکن چاروں بعد

انہوں نے پھر واپس بیچ دیا یہ کہہ کر کہ آپ لی بد میز اور بدلنا ہے۔ اس کا شوہر تو صرف پندرہ کی چھٹی پر آیا تھا وہ سارا معاملہ یونہی چھوڑ کر واپس بھاگ گیا۔ انہم کو اس کی تندوں نے کمرے سے نکال کر اس کے کمرے پر قبضہ کر لیا اور وہ واپس میکے آ بیٹھ گئی۔ اب خالو کوشش کر رہے ہیں کہ عدالت ذریعے رابطہ کر کے اسے خلع دلوائی جائے کیونکہ طلاق تو وہ دے گا نہیں، اتنا لمبا چوڑا حق مہر جو ادائیہ کر سکتا۔ ویسے تو دھوکا دہی اور جہیز کا کیس کرنا بھی ہے مگر اس سب پر بہت پیسہ خرچ ہو گا جو خالو پاس ہے نہیں، اس لیے صرف خلع کا کیس دائر کر۔ میں ہی عافیت جانی۔“ مہوش سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

وقت کا کام ہے گزرتا سو وہ گزر جاتا ہے، ہو یا برا، ٹھہرتا نہیں۔ یہی بات حق بابا اسے سمجھا۔ کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ بھی وقت گزرنے ساتھ ہی سمجھا۔ گزرتے وقت نے ان سب سارے دلدر دور کر کے خوشیاں تھما دیں۔ سیدہ کو انہم نے بیٹے سے نوازا۔ رافع سال مکمل ہونے پر جب پاکستان آیا تو ماں باپ اور مہوش کو حج کروانے گیا اور چند ماہ بعد وڑت ویزا لگوا کر ایک ماہ کے مہوش کو اپنے پاس بلایا۔ اسے گھمایا پھر آیا، شاپنگ کرانی اور واپسی پر میکے سسرال دونوں طرف۔ افراد کے لیے ڈھیر سارے تحائف دلانے۔ اگلے سال اللہ نے مہوش کی گود بھر دی اور وہ ایک ساتھ جڑواں بیٹا بیٹی کی ماں بن گئی۔ شاہدہ بیگم پورے چالیس روز اسے اپنے پاس رکھا اور رافع بخوشی اجازت دے دی۔ مہوش نے اپنی بھانجی جنگ بہت خوبی سے لڑی اور سب کی نگاہوں میں سرخرو ہوئی۔

محبت اور جنگ میں بہت سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں لیکن محبت ہو یا جنگ، اگر اصولوں چلا جائے تو خسارہ بھی منافع میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کی شادی کے اولین دنوں میں ہونے وا۔

اولادہ محمد امین ڈاکٹر کی طرف۔

بہنوں کے لیے خوب صورت ماہ



سلاطین

انکلی میٹھے

انکلی میٹھے

قیمت - 400/- روپے

فصل غم کا گلی شہوانی

رضیہ جمیل



قیمت - 300/- روپے



گل کھستار

فرح بخاری

قیمت - 400/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 16361

حسارے نوالہ نے ایک ساتھ دو بچے اس کی دودھیں ڈال کر ایسا حسین منافع تھا دیا کہ وہ سرشار ہو گئی۔ رافع کی طبیعت میں بھی خل اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد وہ سال میں دو بار پاکستان آنے لگا تاکہ ننھے سمیرا اور ثمرہ کے ساتھ وقت گزار سکے۔

سمیرا اور ثمرہ چار سال کے ہوئے تو رافع مستقل پاکستان واپس آ گیا اور اپنا چھوٹا ساریٹورنٹ ہٹا کر کاروبار کا آغاز کر دیا۔ اس کے بعد رافع حق بابا سے ملنے گیا تاکہ انہیں یہ خوش خبری سنا کر اپنے ریسٹورنٹ لے جا سکے لیکن وہ اسے وہاں نہیں ملے۔ سفیدے کے اس بوڑھے درخت کے نیچے سوکھے پتوں اور شاخوں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ کئی دن لگا تار وہاں جاتا رہا لیکن انہیں نہ ملتا تھا نہ ملے۔ اس نے آس پاس کی لوگوں سے ان کے بارے میں پوچھا لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ سب اسی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگ جاتے جیسے وہ پاگل ہو۔ جب اس نے بارہا ان کا حلیہ بتا کر اصرار کیا تو ایک بزرگ شخص نے کہا۔

”بیٹا میں پچیس سال سے یہاں رہ رہا ہوں اور جب یہاں پارک ہوا کرتا تھا تو میں یہاں واک کرنے آتا تھا۔ اب یہ پارک نہیں رہا لیکن میں عادت سے مجبور پھر بھی اپنے بیٹے کے ساتھ صبح شام یہاں واک کرنے آتا ہوں، میرے پوتے پوتیاں اکثر یہیں کھیلتے ہیں، ہفتے میں ایک بار یہاں لنگر بھی لگتا ہے لیکن میں نے کبھی بھی یہاں ایسے کسی بزرگ یا فقیر کو نہیں دیکھا۔ ان درختوں پر تو گلہریاں رہتی ہیں اور ہمہ وقت اچھل کود کرتی ہیں اس لیے ہم اپنے بچوں کو درختوں کے نیچے جانے سے روکتے ہیں۔ تمہیں ضرور کوئی وہم ہوا ہوگا۔“

وہ بزرگ تو اتنا کہہ کر چلتے بنے لیکن رافع اسی سوچ میں کم کئی گھنٹے وہیں بیٹھا رہا کہ پھر حق بابا کون تھے؟ کوئی سراب؟ یا فرشتہ؟ یا اس کا خیل۔ جو اسے زندگی کی جنگ لڑنا سکھا گئے۔

☆☆



رجسٹر بھرتے اچانک سے مجھ پر منکشف ہوا۔ کہ
چاول کانٹ چھانٹ کیے بنا بنا دیتی ہے۔

☆☆☆

بس تب ہی سے میں نے یہ خدمت ا
ذمے لے لی تھی کہ شمسہ جب بھی چاول پکائے
مجھ سے چنوا کر پکائے یا پھر میرے گھر نیاز کی بر
نہ بھجوائے، مگر شمسہ کو پہلا آپشن پسند آیا کیونکہ
کے پاس بہت بھاری وجہ تھی ہمارے گھر نیاز بھجوا
کی کہ وہ ہر جمعرات کو اپنے سر کا ختم دلائی اور
جس طرح بریانی بہت مرغوب تھی یونی میں ار
چیپی ”بڑی بہو“ تھی اس لیے میرے لیے مرحوم
کی فاتحہ زدہ بریانی کھانا عین واجب اور با
ثواب تھا۔

چنانچہ ہر جمعرات کو ختم کی بریانی کے
چاول چننا میری ذمہ داری بن گئی تھی، مگر میں بھی
”ساس موجودہ“ کی چیپی چھوٹی بہو کو سستے
چمڑے والی کبھی سو اس خدمت کے بدلے
مجھے ہر اتوار کے دن دونوں شادی شدہ مندوں
لیے پکائی جانے والی انواع و اقسام کی ڈشز کے
پیاز کاٹ کر دیا کرتی تھی جو میرے لیے مشقت
لیوا سے کم نہیں تھا۔

اور یوں ہم دونوں دیورانی جیٹھانی ا
دوسرے کو امداد فراہم کرنے کے لیے ہر وقت
بستہ رہتی تھیں۔

☆☆☆

کمرے سے آتی بلند آوازیں اب مدہم
سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھیں اور نیم دائرواڑہ بھی
زہیرے سے بند ہو گیا۔ مجھے عجیب سی بے چینی نے
آن گھیرا مگر میں نے خود کو گہرائی میں سوچنے سے باز
رکھتے ہوئے چاول کی ٹرے کھانے کی میز پر رکھ دی
اور ہاتھ میں پکڑے چنے ہوئے چاول کا کچرا ڈسٹ
بن میں ڈال دیا۔

”شمسہ چاول بھگو دوں کیا؟“

میں نے شمسہ کے پیاز کاٹنے پانی پانی ہوئے
وجود کو مخاطب کیا وہ اتنے انہماک سے یہ مشقت
انجام دے رہی تھی کہ جیسے پیاز کاٹنا اس کا بچپن کا
خواب رہا ہو۔

”ارے نہیں منزلی میں خود کر لوں گی تمہاری
اتنی مہربانی کیا کم ہے کہ اتنے گندے چاول صاف
کر دیے اف مجھے تو کھنٹوں اسی پر لگ جانے تھے۔“
شمسہ نے مجھے وہ اطلاع دی جو وہ کم و بیش
پچیس مرتبہ پہلے بھی دے چکی تھی اسے چاول چننا
پسند نہیں تھا بلکہ اتنا ناپسند تھا کہ اکثر وہ چاول بنائے
پکا دیتی تھی اور اس کا علم مجھے تب ہوا جب ایک
جمعرات اس کے گھر سے بریانی کی پلیٹ آئی تھی
جسے کھاتے ہوئے اظہر نے فوراً آٹوئی دے دیا تھا کہ
یہ بیف بریانی نہیں ”پتھر بریانی“ ہے اور تو اور اظہر کو
اس دن جانے کہاں سے دانت درد بھی ایسا آن چٹا
تھا کہ داڑھ نکلوا کر ہی لوٹا تھا تب اظہر کو انسکریم پر کئی
دن گزارہ کرتے اور ڈیٹسٹ کی طویل حاضریوں کا

مچھلی دو جمعرات سے میرا دن بھر شمسہ کی طرف رہنا گزیر ہو گیا تھا، کیونکہ شمسہ نے بچٹ کے آتے ہی بچٹ کا عجیب پلان بنایا تھا کہ چاول سے ترین خریدنے لگ گئی تھی گو یا کہ سارا خرچا چاولوں پر ہی اٹھتا تھا۔ پچاس روپے کلو کے چاول میں سے پچاس ”مگئے“ تو میں نے گن کر نکالے تھے اور اس کے علاوہ کیا کیا نکلتا تھا اگر تفصیل بتا دوں تو میری طرح دوسرے بھی ”مرحوم سر“ کی فاتحہ زدہ بریابی پر (فل شریف) ختم پڑھ ڈالتے۔

اب سستے بچٹ رسیدہ چاولوں کو چختے سے چار گھنٹے لگ جاتے تھے اور اسی دوران شمسہ کی بیٹی کو اکثر و بیشتر امجد کے ساتھ کھ کرتے دیکھا مگر آج تک اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا اور دھیان جاتا بھی کیسے شمسہ انعم بیس سال کی تو تھی معصوم سی شرارتی بہت باتوں کی مگر انتہائی چغل خور انعم سے سوائے انعم مجھے کوئی خار نہ تھی کہ وہ اوپر کے پوریشی میں ہو حرکت سے ماں کو ضرور آگاہ کرنی تھی اور مجھے



ہی اسرار میں نہ ہوتا اسرار پرے پورشن میں میں خود
نہ رہی ہوئی۔

اطہر اور مظہر دو ہی بھائی تھے اوپر نیچے کے
پورشن میں خیر سے ہم دو جٹھانی دیورانی بھی تقریباً
صلح صفائی سے ہی رہتی تھیں اور ساس جی تو اڑن
کھٹولے پر رہتیں کبھی اوپر کی طرف محو پرواز تو کبھی
نیچے کے پورشن میں دھرتا سرکار۔

اور دونوں بہوؤں کی صلح صفائی سے نالاں
بیٹیوں کی ہر وقت راہ دیکھتی ساس کو میرے دونوں
بچوں علی اور عائشہ اور شمسہ کے تینوں بچوں انم، اشعر
اور طوبی میں سے انم زیادہ عزیز اس لیے تھا کہ زیادہ
تران کے ساتھ کھسک کھسک کرنی دکھائی دیتی تھی۔ اس
لیے مجھے زیادہ بھائی نہ تھی مگر مجھے کوئی جانی دشمنی جیسی
پر خاش تھوڑی نہ تھی جو میں بلا وجہ اس کی ٹوہ میں رہتی
مگر مقام شک تو یہ تھا کہ میرا بھائی امجد جو شادی سے
قبل بھی مجھے زیادہ منہ نہیں لگا تا تھا اور شادی کے بعد
بھی شاذ و نادر ہی اسے بہن کی یاد ستاتی تھی آج کل
نہ صرف میری محبت اس کے اندر ٹھانٹھیں مارنا شروع
ہو گئی بلکہ میرے بچوں کو بھی گاہے بگاہے گھمانے
کھلانے لیے جانے لگا تھا چلو یہاں تک تو بات
لو جیکل ہی تھی کہ ہو سکتا ہے خون کی ترشش کو کب ابال
آجائے مگر میرے سرالیوں سے اس کی علیک
سلیک میرے لیے لمحہ فکریہ تھا اور یہ بھی میں ہشتم
کرنے کو تیار تھی اگر کچھلی دو جمعرات سے امجد اور
شمسہ کی بیٹی انم کو میں نے ضرورت سے زیادہ کھیل
کو دکرتے نہ دیکھا ہوتا۔

☆☆☆

”انم پوری ہی اندر آجاؤ، آدھا آنے پر کون سا
کٹ کم ہو جاتا ہے۔“

میں نے پندرہ منٹ سے دروازے سے لٹکے
اندر جھانکتی انم کو بالآخر دعوت دے ہی دی کہ امجد کی
آمد اب تو ایسے ہی تھی جیسے مارننگ شو میں ہوئی
آئے دن کی شادیاں وہ عائشہ اور علی کے ساتھ بے سروپہ
کی باتوں میں لگا تھا اور آواز اتنی بلند تھی جیسے

سماعت سے خردم اتل افراد سے مل کر کار حیرت
ہو، اس کے حسبِ منشا انم اس کی آواز سے
سیڑھیاں پھلانگتی دروازے سے چمکاؤ کی طرر
یوں شرمائے جا رہی تھی جیسے امجد نے سرفراز
کی بات نہ کی ہو کوئی عظیم الشان جوک سنا ہوا۔
”دیکھا میں نہ کہتا تھا سرفراز دھوکا نہیں
کا۔“

امجد نے یوں ٹھوٹک بجا کر کہا جیسے سا
میڈیا کو یہ اہم خبر اس نے پہنچائی تھی۔
”تو کیا پاکستان میں صرف ”سرفراز“ ہی
نہیں دیتا۔“

انم نے جس ادا سے ابرو نچا کے امجد
دریافت کیا امجد پر کیا موقوف میری بھی دھڑ
اٹھل پھٹھل پر کس کمال ہے کل کی ہاتھوں میں پا
کب ”ملکہ ادا“ بن گئی خبر ہی نہ ہوئی۔ میں نے
ارادہ ہی اپنی بیٹی اور انم سے سال بھر چھوٹی عا
دیکھا جو داڑھ سے امرود کا بیج نکال رہی تھی۔
”ارے کیوٹو! اول والوں کی کمی تھوڑی آ
مانگنے والا مانگے ادا سے۔۔۔۔۔

امجد تازہ تازہ سنیما سے کوئی مودی دیکھ کر
اور صاف لگ رہا تھا کہ شاہ رخ کی ہی دیکھی ہو
”سوسوٹیٹ“

لیجئے ملکہ ادا کا بھرپور جوابی تیر کمان سے لگا
سیدھا نشانے پر لگا۔
”تو اور کیا ایک ”دل“ ہی تو ہے جس
پاکستانی خود قیل ہیں۔“

میں نے سلا دکتا چھری روک کر زبا
قینچی چلائی حد ہی ہو گئی تھی کل کے بچے
آنکھوں کے سامنے پیار کی پتنگ اڑا رہے تھے
مجھے لگ رہا تھا جیسے میری حیثیت ”ڈور“ پکڑ
والے سہولت کار کی ہو۔

اور جلد ہی مجھے اپنے کام کی نوعیت سے
کردیا گیا۔

☆☆☆

اسے پیارہ سے دیا۔ میں نے ہمدردوں کو پھر ہوا۔
 امجد مجھے چت کرنے کے لیے کیا ہی سہا
 سنے دکھا رہا تھا اور میں خیالوں میں کئی ہوئی پیاز
 کے ٹوکڑے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”منزلی! وہ میرے پیچھے پکارتی ہوئی آ رہی
 اور میں یوں بنا کر کے آگے بڑھتی جا رہی تھی؟
 کانوں سے بھی سننے کا کام لیا ہی نہ ہو۔ مگر سیاہ
 کہتے ہیں انسان کے اعمال اور قرض خواہ قبر میں
 چھپا نہیں چھوڑتے اس لیے جلد ہی ریفیہ
 مجھے آن دیو جا۔

”کیسے مستانی ہوئی چل رہی تھی میری آواز
 پڑی تمہارے خرگوش جیسے کانوں میں“ میں اس تڑپ
 پر ضرور برا مانتی اگر کوئی اور کہتا اب ریفیہ کو بھلا
 جواب دیتی آخر کو قرض دار قرض خواہ کے سا۔
 بولے بھی تو کیا؟

پانچ سال قبل اسی امجد کھٹو کے لیے جو آ
 شادی کے لیے اتاؤلا ہوا پھرتا ہے میں نے ریفیہ
 سے پچیس ہزار ادھار لے کر اس کا ایڈیشن کرایا
 اور پھر گھر والوں کو ادھار لوٹانے کی اہم خدمت
 سونپ کر خود کو سپرد امور سرال کر دیا مگر بھول گئی
 کہ گھر والے بھی تو میرے ہی خون کے پیا۔
 مطلب خون کے رشتے تھے ہنوز کوئی بھی میرے
 ہاتھوں سے لی رقم اپنے ہاتھوں سے لوٹانے کو تیار نہ
 اور ریفیہ کے تو مانوسارے کام ان ہی پچیس ہزار
 ہی اٹکے ہوئے تھے۔

آج میکے آئی تو امجد کے کارنامے سے آ
 کرنے کے لیے تھی مگر سر راہ مگر اگئی تھی قرض دے
 جان کو آنے والی ریفیہ۔

”اے منزلی! یہیں پر مک مکا کرنا ہے کہ
 ہے کچھری میں.....“

ریفیہ شاید کوئی پاکستانی مووی دیکھ کر آئی
 عجیب مولا جی انداز تھا اس کا مگر وہ منزلی ہی کیا
 مرعوب ہو جائے۔

پیارہ میں وہ ریفیہ بنایا ہے اب
 بات کریں اپنی دیورانی سے، ویسے تو سہیلیاں بنی
 پھر ملی ہو اب جب ضرورت پڑی رشتے داری بنانے
 کی تو لگی ہو کہانیاں بنانے۔“

امجد نے انتہائی تمیز کے ساتھ بدتمیزی کی اور
 میری نصیحتوں کو آرام سے کہانیوں کے ٹوکڑے میں
 ڈال کر مجھے واپس کر دیا۔

”ناں تم نے اپنی عمر دیکھی ہے جب سے پیدا
 ہوا ہے کوئی ایک کام بھی ڈھنگ کا کیا ہے تو نے اور
 شادی کی تو ایسے جلدی پڑی ہے جیسے ٹرین چھوٹے
 جارہی ہو۔“

حد ہی ہو گئی تھی پانچ بہنوں کا اکلوتا بایس سالہ
 میرا بھائی اس سختی سی مرغی (انم) پر ایسے فدا ہوا
 جا رہا تھا جیسے کنور کیوب بنائے کا ٹھیکہ لگایا ہوا ہے
 مگر میں وہ ”دال“ بننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھی جس
 میں صرف مرغی کی خوشبو ہو ذائقہ نہیں۔

”آپا تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ انم کے میرے
 گھر آ جانے سے تمہیں پیاز کاٹنے والی بھی مل جائے
 گی اور بنا شمسہ آپا کے گندے چاول چنے تمہیں کئی
 ہوئے پیاز مل جائے گی۔“

آخر کو میرا ہاتھ پاں جایا تھا اس نے وہ رگ
 دہائی جو پہلے ہی دہائی ہوئی تھی میں قریب تھا کہ اس کی
 چال میں آ جانی کہ مجھے اچانک یاد آیا۔

”امجد تو کیا تو شادی کے بعد انم کو میرے گھر
 رکھنے والا ہے جو میری خدمات سرانجام دے گی۔
 کہاں تو کو رگی اور کہاں میں ناظم آباد؟“

اماں اور بہنیں تک تو اتنا سفر کر کے میرے گھر
 آتی نہیں تھیں بہو کو کہاں سے آنے دیں گی۔ اور خود
 امجد صاحب جو آتے بھی انم کے لیے ہی تھے اب
 جب ساتھ لے جائے گا تو پھر میرے پاس کیا ادھار
 لینے آئے گا۔

”ارے آپا ہر ہر ویک اینڈ پر لے آیا کروں گا
 ہفتہ بھر کے لیے پیاز کٹوا کے رکھ لینا بلکہ آپ ایک دفعہ
 اس کے ماں باپ سے ہاں کروادیں پھر دیکھیں

”دیکھ رفیعہ تیرے پرٹھوں کی زندگی کزری ہے تھانے“ کچھریوں میں ہم ٹھہرے سفید جھنڈا بردار (امن پرست) ہم سے ہماری زبان میں بات کر۔“

میں نے کمال بے پروائی سے اس کی بڑھک کو ہوا میں اڑا دیا۔ آخر کو فرض خواہوں سے نپٹنے کا پرانا تجربہ بھی تو کوئی چیز ہے۔

”سن منزئی چھ ماہ بعد میری بیٹی کی شادی ہے اور مجھے میرے پیسے واپس چاہئیں۔“ رفیعہ کے تن تے میں کمی آئی سامنے چمکا کھڑا جو کھڑا تھا۔

”اب رہن دے پچیس ہزار میں کون سا فلیٹ خرید لیتا ہے تم نے اور ویسے بھی تین ماہ بعد تو میرے بھائی کا سہرا بننے والا ہے۔ آجانا بارات میں اور لے جانا اپنے پیسے بھی۔“

میرے نزدیک پچیس ہزار ٹھیکریوں سے کم نہیں تھے کیونکہ ادا جو کرنے تھے لیتے وقت تو پچیس سونے کی اینٹیں لگی تھیں مجھے خیر میرے زرخیز ذہن نے سچ سڑک پر کھڑے نہ صرف رفیعہ کا مسئلہ حل کر دیا بلکہ امجد کا بھی سپایا مکا دیا تھا۔

☆☆☆

بچے کے پورشن میں خوب دھما جو کڑی پٹی تھی۔ شمسہ کی بیٹیں بھابھیاں بھی آج مرحوم سر کے نام کی دعوت اڑانے آئی تھیں اور میرا حال یہ تھا کہ آنکھوں پر کھیرے رکھے دکھتے دیدوں کو سکون دے رہی تھی۔ پانچ گلو سے ترین چاول جو چمن کے آئی تھی۔

اگرچہ میں یہ خدمت انجام دینے سے ریٹائرمنٹ لینے والی تھی کیونکہ بھائی کے سسرال میں اب منہ بسور کے ناک پھلا کے بیٹھنا تھا۔ کام تھوڑی نا کرنے تھے۔

اور ویسے بھی تصور میں کئی پیاز کی قطاریں ویسے ہی میرا داغ ساتویں آسمان پر پہنچائے ہوئے تھیں مگر کیا کیجئے اس ”وئے سئے“ کی خرافات کا شمسہ بھی اپنے ہی قبیلے کی ٹکلی، مطلب بھلا کی مطلبی۔

”دیکھو منزئی تیرا بھائی میری بیٹی کے گئے

سے جی نہیں ملتا۔“

شمسہ نے ایسی صورت بدلی جیسے خوش اخ کا کوئی ٹاک تھا جو آج پتا بھول گئی ہو۔

”ہاں تو ملے بھی کیسے کوئے جیسا تمہاری ٹختا اور دودھ جیسا میرا اور۔“

میری اور آپا کی زبان سے بیک وقت باری ہوئی تھی۔ شمسہ کے گھر رشتہ مانگنے کیا آئے اس کی تو لگتا تھا سوکھی ٹنکی میں مہینے بعد پانی آئے یہ مثال بھی مجھے اس لیے سوجھی کہ آج مہینے بھر! پائپ لائن سے گھر گھر کی آوازیں آئی تھیں، پاؤں سواری باد بہاری جو تشریف لائی تھی۔

”دیکھ شمسہ امجد جس علاقے میں رہتا وہاں ہر ہفتے پانی آتا ہے۔“

میں نے اسے قائل کرنے کے لیے بھائی شروع کر دی تھی شمسہ کی تو پہلے نکتے آنکھیں چپنے لگی تھیں۔ ”اور اماں کے گھر تو چاول ایک سوئیس روپے کلو والے آتے ہیں۔“ میں مزید پتا پھینکا شمسہ سے زیادہ تو دہلی انکم کی پانچ کھل گئی تھیں۔ ”اور تو اور اماں ابا کو اللہ حیاتی و جمعرات کے ختم کی مشقت بھی کوئی نہیں۔“

میرے اس نکتے پر اماں نے بے چینی سے بدلا تو انکم نے بھی زیادہ مسرت ظاہر نہ کی اور اس نا معقول سوچ کو سوچ کر میں تملتا اٹھی مگر اس کی آنکھوں سے کٹے پیاز کے حسین سپنے نے مجھے مر میں ہی رہنے دیا۔

خیر میرے دکھائے سپنے اتنے حسین تھے کہ نے سر مرحوم کے ختم کے فوراً بعد دھوکا رکھ لی تھی۔

☆☆☆

اظہر کا موڈ آج صبح سے ہی بہت آف تھا۔ خور انکم سے ہی پتا چلا کہ اظہر اور مظہر دونوں بھائی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا شاید پیسوں وغیرہ کا کوئی مسئلہ مگر میرے پاس فی الحال ان بے وقت کی لڑائی کے لیے بالکل وقت نہیں تھا آخر کو بھائی کی شادی اور بہترے قرضے مطلب کام تھے جو منانے تھے

ن میں اصہر اور سہرہ دووں جہاں صلا
معمول خوش گوار موڈ میں اماں کے ساتھ محو گفتگو
میں نے جھٹ سے فرمائش کر دی۔
”اظہر اب مظہر بھائی سے روپے واپس
گئے ہیں تو مجھے دیجئے بہترے کام رکے پڑ
ہیں۔“

”تمہارے قرضے تو ادا ہو گئے باقی کا موا
چو لہے میں ڈال دو۔“

اظہر نے جل کر کہا تو میری حیرت دو چند
بھلا قرضے کے معاملات جو میرے شمسہ اور
کے مابین تھے ان سے اظہر کیسے واقف ہوئے۔

”قرضہ کون سا میری جیب سے ادا ہوا ہے
گھر میں راشن میں کسی سے مانگ کے
ڈلواسکتی۔“ میں نے پہلے اپنی شاطر دماغی پراتر
پھر اظہر کی کنجوسی پر تلملا کر کہا۔

”تمہاری جیب سے نہیں مگر میری جیب
ضرور ادا ہوئے ہیں۔“

اظہر نے اب جو کہا وہ مجھے صوفی سے ا
جانے پر مجبور کر گیا۔

”کیا مطلب؟“

میں نے انجان بننے میں اتنی شدت دکھا کر
خود کو کچھ بے مطلب سننے سے روک رہی ہوں۔
”مظہر نے جو میرے پیسے لوٹائے تھے، وہ
کی بیوی نے تمہارا قرضہ ادا کر کے پورے کر د
میرے ہاتھ تو کچھ نہیں آیا۔“

اظہر نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے
اور چبا جانے والے انداز میں کہا تھا۔

میں ہک دک رہ گئی ہو گیا شمسہ نے مٹا
کے رشتے کو نبھانے میں میری دو پٹا بدل بہن
کا خوب ثبوت دیا تھا اور میں سوچ میں پڑ گئی کہ
میں اس ”وٹے سٹے“ کا قرض کیسے اتاروں گی؟

۲

”ارے باؤں ہوی ہو لیا؟“ ہمیشہ جی سن دین و
سنی تھی اب کیا قرض کی بھی لین دین ہوا کرے گی۔“
شمسہ کے تو بال میرے پیروں تلے تھے پھر بھی
تلملا اٹھی شرط بھی تو عظام چانے والی تھی جیمز کی لسٹ
کے ساتھ جو اماں اور بہنوں نے بتائی تھی میں نے
ایک اضافی جٹ بھی شمسہ کو تھما دی اور ریفیہ کی توپوں
کا رخ بھی اس کی طرف کر دیا تھا۔

”رہتے دے شمسہ! اپنا تو رشتہ ہی مطلب کا ہے تم
نے کب مجھے بنا مطلب کے کچھ کرتے دیکھا ہے
اب میرے چاند جیسے بھائی کے لیے تیری سختی سی
مرغی میں نے یوں ہی تھوڑی مانگ لی ہے۔“
میں نے کچھ شمسہ کے سامنے اور کچھ دل میں
کہہ کر ایک فلمی قہقہہ لگایا۔

شمسہ کے جوڑے کے بل کھلے تو ماتھے پر بل پڑ
گئے مگر اس نے مطلب کا رشتہ نبھایا خوب تھا اور نہ
صرف ہمارا منہ مانگا جیمز انم کو دیا بلکہ تمام گھر والوں
کے فرمائشی تحائف کے ساتھ ساتھ ریفیہ اتار دی کے
چھپیں ہزار بھی ادا کر دیئے۔ اور یوں میں نے اور
شمسہ نے ”وٹے سٹے“ کا رشتہ کامیابی سے آگے
بڑھایا تھا۔

☆☆☆

”آباد را چاول تو جن دینا۔“ میں پیاز کاٹنے
والی مشین گئے لیے چاول چنتے ہوئے شدید صدمے
کے زیر اثر تھی۔

میرے جائے نے ”وٹے سٹے“ کی رسم میری
ہی طرح خوب نبھائی جہاں مجھے انم کو پیاز کاٹنے
والی مشین قرار دے کر رشتے کے لیے راضی کیا تھا
وہیں انم سے بھی پیار کی پٹیکٹیں یہ کہہ کر بڑھائی تھیں
کہ جن کاموں سے اس کی جان جاتی ہے اس کے
لیے ”آبا“ ہمیشہ درکار رہیں گی۔

مطلب کا رشتہ بنانے میں تو دونوں ماں
بیٹیوں نے مجھے بھی مات دے دی تھی میں جہاں
شمسہ سے تمام واجبات ادا کروا کے سرور بھی وین
میرے ساتھ بھی شمسہ نے دو دو ہاتھ کر دیے تھے۔

ایکل رضا

شہزادہ کی سیلہ

پہلا باب:

الماس برادرہ.....

رکھ لیا اور دھوپ سے بچنے کی لا حاصل کوشش کی
اس کوشش نے اس کے چہرے کے نقوش کو مزہ
فراہم کی تھی۔

آرٹ کالج کی سڑک کا موڑ مڑتے ہی وہ
گلی میں داخل ہو گئی۔ جہاں پہنچتے ہی منظر یک
بدل گیا۔ درخت غائب ہو گئے اور دھوپ نھر کر

قہر باری کرنے لگی۔ اس نے ناگواری سے
سنان گلی کو دیکھا۔ اطراف کے قدیم گھر و
منحوسیت معمول کی طرح اپنے عروج پر تھی۔

دیواریں، برادرہ جھلکانی کھڑکیاں، اکھڑے ف
رنگ و روغن سے عاری، ٹوٹے پھوٹے گھر، گن
ٹائوں اور بند کواڑوں کے پیچھے سے بھی برہنہ۔

اس کے دائیں بائیں دو ٹھکی نالیاں بہہ رہی تھیں
کاسیہ پانی بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
نے نچوٹ سے پانی کی اس رفتار کو خود سے

لگاتے ہوئے دیکھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ
نفرت سے دیکھے یا نظر اندازی سے..... پانی کا
تو بس بہتے جانا ہوتا ہے۔

کچھ اس کا موڑ یہاں آ کر مزید تپ جاتا
ذہن میں یہ علاقہ، یہاں کی غربت کچھ اس طو
گئی تھی کہ اس کا دل کرتا کہ وہ کالج میں ہی رہے۔

اس کا بس چلتا یا کالج والے اسے اجازت
دیتے تو وہ یقیناً ایسا ہی کرتی۔

ایک اور موڑ مڑ کر وہ اپنی گلی میں داخل
تھی۔ چہرے پر پھیلی ناگواری نے اب کر یہ صو

گل و گلزار کو کم جانا، حرص پہ تھا آمادہ
کیا چاہنے کا سوال سادہ، سب پانے کا جواب مادہ
حدت، عجز، اشک رضا سے نکھارا تھا جس کو

ٹوٹا جو الماس وہی تو بکھر گیا ہر سو برادرہ
شام کے رنگ شہابی دکھتے ہوں یا شامی.....
حقیقتاً وہ سیاہ ہوتے ہیں۔ گزرتے سچے لمحوں اور آتے

پکے سموں کے درمیان جھولتے رنگ..... پل صراط پر
کھڑے، ادھار لیے گئے، سکتے، لرزتے، ٹھٹھراتے،
سانوں اور قید ہوا میں ڈگمگاتے رنگ..... یہ نہ تاباں

ہوتے ہیں نہ تاریک..... یہ تو بس پل بھر کی نظر کا
سامان ہوتے ہیں۔
زندگی بھی ایسی ہی ہے۔ شام رنگی..... یہ نہ

شہاب رنگی ہے اور نہ ہی شام رنگی..... ساکت
سانوں کی ڈوری جب ٹوٹتی ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا
ہے کہ یہ تو سب سیاہ ہے۔ شام کے سچے رنگ کی

طرح..... ہر صورت سیاہ اور سیاہ بھی وہ جسے کسی اور
رنگ میں نہیں رنگا جاسکتا۔ سیاہ رنگ سارے رنگوں کو
نگل لیتا ہے۔

☆☆☆

دو پہر کی تیکھی دھوپ میں سہ پہر ہو جانے کے
باوجود کاپ موجود تھی۔ جو بن کا چولا پہنے وہ کسی مجھول
کی طرح رخص کر رہی تھی اور سیدھ میں لگے پام کے

درختوں میں سے انی کی طرح نکل رہی تھی۔ آرٹ
کالج کی بیرونی دیوار کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے
اس نے ہاتھ میں دبی فائل کو اپنے سر پر ٹیڑھا کر کے

اختیار لری سی۔ اپنی جی میں داس ہونا اس لے یے
 پل صراط پر چلنے کے مترادف تھا۔
 اس جلی میں دائیں بائیں پانچ، پانچ گھر تھے۔
 بالکل سامنے سین کا گھر تھا۔ دیار کی سیاہ لکڑی کے
 پرانے کواڑوں والا..... جس پر دس سال پہلے سین
 نے اپنی چھوٹی بہن زویا کے ساتھ مل کر بچا بچا پہلے
 رنگ کا پیٹ کیا تھا۔ جسے سب پیار سے ”چھوٹی“
 کہتے تھے۔ دروازہ رنگ کرتے سے انہیں احساس
 ہی نہ رہا کہ پیٹ کو انہوں نے کس مقدار سے
 استعمال کرنا ہے۔ جب ایک کواڑ پر رنگ ہو گیا تو



رنگے ہی رہنے دیا تھا۔ اب اس کے گھر کا دروازہ دو رنگی تھا۔ سیاہ پیلا اور سیاہ کالا..... جو دیوار کا اصلی رنگ ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ سیاہ..... بیرونی اتنی زنجیر اور گواڑ کھولنے اور بند کرنے والی جگہوں سے تو دروازہ اس قدر غلیظ ہو چکا تھا کہ وہاں سے چھونے پر اسے احساس ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھ گندے نہیں ہوئے بلکہ ناپاک ہو چکے ہیں۔ وہ لاکھ ہاتھ دھوئی پھر بھی یہ احساس کافی سے تک اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس جگہ سے تو پیلا پیٹ بھی سیاہ ہی ہو چکا تھا۔ اب اس کا کوئی حل نہیں تھا سوائے پیٹ کا ایک اور کوٹ کرنے کے یا برداشت کرنے کے۔ پہلا کام مشکل تھا اس لیے وہ دوسرا کر رہی تھی۔

ناگواری سے دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگی۔ ہر گھر سے حسب معمول چٹل چلنے کی آواز آرہی تھی۔ گھوگھو..... گھوگھو..... مدھم مدھم آواز اسے اتنی واضح سنائی دے رہی تھی کہ اس کا دماغ چٹختنے لگا۔ یہ آواز اس کے اندر ایسے جذبے جگاتی تھی جو نفرت کی حدود سے کہیں زیادہ تجاوز کیے ہوئے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس آواز کی گونج میں اسے جنگیں لڑنے کو کہے تو وہ یقیناً نفرت سے سب دشمنوں کو مار گرائے۔

ہر گھر سے آٹا اڑ رہا تھا۔ باریک باریک جو ہوا کا ہی حصہ لگتا تھا۔ یہاں آکر گلی کسی روٹی تنگ گزر گاہ جیسی دکھائی دیتی جہاں برف کے ننھے ننھے گالے گر رہے ہوں۔ دیکھنے میں یہ منظر خوب صورت تھا۔ دودھیا منظر..... اسے لگتا تھا جیسے گلی تیز دھوپ میں بھی کھر میں لپٹی ہوئی ہو۔ گمان نہیں ہوتا تھا کہ یہ گندم کا برادہ ہے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رحمت ذرات کی شکل میں زمین پر اتر رہی ہے۔ لیکن اسے اس آٹے سے اتنی نفرت ہو چکی تھی وہ اس رحمت کو زحمت سمجھنے جتنی اہمیت بھی نہیں دیتی تھی۔ اس آٹے کے برادے کو وہ گرد کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کے گھر سے تو اس گرد کے دو بادل اٹھ رہے ہوتے تھے۔ آٹے کا اور ایک چونے کا..... جسے بابا ”الماس برادہ“ کہتے تھے اور وہ اسے صرف ”گند“ سمجھتی تھی۔

جس وقت وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ امتحان دوپہر تھا۔ ناشتے کے بعد پیپر کی پریشانی کی وجہ سے اسے کچھ کھایا ہی نہیں گیا تھا۔ ٹین گھٹنے کا پیپر، اس بعد اشاپ پر بس کا انتظار..... جو بس بھی آتی پیچھے سے ہی بھری ہوئی آتی تھی۔ خالی بس کا انڈر کرتے کرتے اور گھر آتے آتے اسے کافی دلیک لگ گیا تھا۔ تیز دھوپ نے جسم کی نمی بھی خشک نہیں کرتی۔ آتے ہی اس نے فائل کو مکن میں پیچھی چار پرچ دیا۔ اماں کو نے میں جایا بچا پھٹے ہوئے ٹاٹ کھولی کے اندر چکی چلا رہی تھی۔ بابا دوسرے کو میں دیوار کے سائے میں سکر کر بیٹھے اپنے چو کے طغروں پر تیزی تیزی سے ریگ مال پھیر رہے تھے۔ سفید گرد کے دو بادل ان ہی دو کونوں سے اٹھ رہے تھے۔

”اماں! جلدی سے کھانا دے دو بہت بھو“

.....“
دروازے کی آہٹ پر اماں نے اپنی ٹاٹ کھولی سے ٹاٹ کا پردہ سر کا گراس دیکھا اور بابا کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر مڑے۔ دونوں اگھبرا گئے تھے جیسے جوان اولاد کے سامنے کوئی ڈالنے پکڑ لیے گئے ہوں۔ سین کے چہرے ناگواری تھی۔ ویسی ہی جیسے وہ دیکھنے کے عادی۔ پھر بھی گھبراتے تھے۔ بھوک کے آگے کے الفاظ ا کے منہ میں ہی رہ گئے۔ تو اس کو گھر میں اتنی اہمیت بھی نہیں دی جاتی کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ فائل چارپائی پر پھینک کر وہ پیر پختی ہوئی اندر گئی۔

”کتنی بار کہاں ہے اس کے آنے سے پکا کام ختم کر لیا کرو۔“ اماں نے چپ والی راز دار سے بابا کی سرزنش کی۔ ”پتا تو ہے کہ اسے اس گھر سے کتنی چڑ ہوگئی ہے۔“ اماں کا اشارہ بابا کے طغرو کی طرف تھا۔ جن پردہ ریگ مال مار رہے تھے ا جہاں سے سفید برادہ اڑ رہا تھا۔

”تو میں کیا کروں؟“ بابا جھنجھلائے۔ ”کام کا زور ہے۔ رات سے لگا ہوا ہوں۔ کام نہ کروں تو کھائیں گے کہاں سے۔ تم ہی چکی نہ چلاتیں، اسے اس سے بھی تو چڑ ہے۔“ بابا اماں کی طرف ملے۔ دونوں ایسے موقع پر ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔

”آج بوری دینی ہے ہر صورت۔ کمپنی کی گاڑی آنے والی ہے۔ مجبوری میں بیٹھی ہوں میں۔“ اماں نے اپنی طرف کی وضاحت دی۔ بابا نخوت سے جھنجھلائے کہ بس اب مزید تاویلیں نہ دو۔

”اچھا..... اب اس کے لیے روٹی بنا۔ بھوک لگی ہے اس کو۔ بھوکی ہے بے چاری صبح کی۔“

”بیانی ہوں۔“ اماں کہتی ہوئی ٹاٹ کی کھولی سے باہر نکل آئی۔ اس پیڑھی سمیت ہی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ جب سے اماں کے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی پیڑھی کے پاؤں کے نیچے پیسے لکوائے تھے۔ گھر کی صفائی وہ اسی پیڑھی پر بیٹھ کر کرتی تھی۔ جھاڑو ہاتھ میں پکڑ کر وہ پیڑھی پر پیہوں کے بل ہی گھومتی رہتی تھی۔ پوچا بھی ایسے ہی لگتا تھا اور کپڑے بھی اسی پیڑھی پر بیٹھ کر دھلتے تھے۔ کھانا بھی وہ اسی پیڑھی پر بیٹھ کر بیانی تھی۔ اس سے کافی آسانی رہتی تھی۔ کھانے کے دوران نمک، مرچ کے ڈبے پکڑنے، صفائی کے دوران جھاڑو پھیرنے، پوچے کو بار بارٹل کے پاس جا کر گیلیا کرنے میں اور کپڑے دھوتے ہوئے بھی۔ اب اسی پیڑھی کو کھینچتی ہوئی وہ کچن میں چلی گئی۔

دو سال پہلے ڈاکٹر نے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اس کے گھٹنے کا آپریشن بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے اس برکوتی توجہ نہیں دی تھی اور آپریشن کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک تو آپریشن پر لاگت بہت زیادہ آ رہی تھی۔ دوسرا اچکی چلنے میں یقیناً کافی دن کا ناتھ پڑ جاتا تھا اور ایسا وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ پھر کسی پڑوسن کے مشورے پر اس نے اپنی پیڑھی کے نیچے پیسے لکوائے تھے اور دونوں

ٹانگیں ہوتے ہوئے بھی وہ اپنا بچ ہو گئی تھی۔ اماں دن اپنی شادی کے دن کی طرح خوش تھی۔ اس کی پیڑھی کے نیچے پیسے لگے تھے۔ اس کی لا مشکلات کا حل چار پیہوں نے نکال دیا تھا۔

صبح کے تیسرے کونے میں چھوٹی زدو ٹوٹے ہوئے کھلونے وغیرہ سے کھیلنے میں مصہ تھی اور ایسے مصروف تھی کہ اسے نہ تو سین۔ میں آنے کے بارے میں کچھ پتا چلا اور نہ ہی اماں کی ایک دوسرے کو سرزنش کرنے کا۔ وہ کھلونے سے کھیلنے میں اس طرح مگن تھی جیسے اس کی کل متاع ہو۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی بہت کم بولتی تھی اور اس سے بھی کم کھاتی تھی۔ کے ذہن میں کوئی مسئلہ رہ گیا تھا۔ اماں کہتی تھی ایک دن خود ہی بولنے لگے گی۔ زدو یا اس وقت سال کی تھی۔ اس ایک دن کا انتظار کرتے کہ چودہ سال بیت چکے تھے۔

اماں پیڑھی کھینچی ہوئی باورچی خانے میں گئی۔ سالن تیار تھا۔ جلدی سے اس نے روٹی تو پر ڈالی۔ اندر سین کپڑے بدل کر گرمی میں ست کے نیچے خاموشی سے لیٹی تھی۔ پنکھا ہوا کم اور زیادہ دے رہا تھا۔ اماں نے جا کر کھانا اس سامنے رکھ دیا۔ وہ ہانپتی کانپتی خود چل کر آئی کمرے کے آگے لکڑی کی موٹی دلیز تھی۔ اس پیڑھی اندر نہیں آ سکتی تھی۔ ایک دو بار اس نے کو کی تھی اور بری طرح سے گرمی تھی۔ پھر اس نے کرنا چھوڑ دیا۔ وہ سین کو آواز بھی نہیں دیتی تھی اسے پتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ اسے ہی جانا تھا۔

سین کے آگے کھانا رکھ کر وہ پنکھا تیز کر۔ لیکن پنکھا تیز نہیں ہوا..... ڈیمر فل اسپڈ پر ہی جس کے نتیجے میں وہ اپنے پرزوں کے ساتھ تھوڑے بہت پر بھی ہلا رہا تھا۔ چہ چکا افسوس ہوئی وہ پھر سے سین کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اسے آج ہی تو پتا چلا تھا کہ پچھلے میں نئے بیہ

پڑنے ہیں۔

سین نے نظروں ہی نظروں میں چھابی کو دیکھا۔ پھر منتظر کھڑی اماں کو..... رومال میں لپٹی روٹی کے اوپر آلو کو گھسی سے بھری ہوئی کٹوری رکھی تھی۔ پانی کا گلاس اماں نے ساتھ پڑے صندوق پر رکھ دیا۔

”کھا لو.....“ اماں منت بھرے لہجے میں بولی۔

سین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا تو ذکر منہ میں رکھا۔ اماں اس کے طرف بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اس بات کے انتظار میں تھی کہ وہ کیا کہتی ہے۔ جیسے آج انہوں نے نئی ڈش تیار کی ہو اور وہ جاننا چاہتی ہو کہ سین کو وہ کیسی لگی۔

”ٹھیک ہے ناں؟“ اماں نے کسی حد تک

خوشامدی سے پوچھا۔

”کیا خاک ٹھیک ہے۔“ اس نے لقمہ فرش پر تھوکا۔ ”چونا چونا..... ہر جگہ چونا۔ چونا کھانے کو، چونا پھانکنے کو۔ کیا چونا ہی رہ گیا ہے اس گھر میں۔“ وہ بری طرح سے چلائی۔

”نہیں تو..... کہاں.....“ اماں فوراً وضاحت دینے پر تل گئی۔ ”میں نے ہاتھ اچھی طرح سے دھوئے تھے۔ برتن، تو..... سب اچھی طرح سے دھویا ہے۔ ابھی بھی چونا کہاں سے آگیا اس میں۔“

”لیں۔ خود چکھ کر دیکھ لیں۔“ غصے سے اس نے چھابی اماں کے آگے کی۔ اماں نے روٹی تو ذکر سالن کے ساتھ کھائی۔ پتا نہیں واقعی اسے بھی چونا محسوس ہوا یا وہ سین کو جھٹلاتا نہ چاہتی تھی۔

”میں بازار سے کچھ منگوا دیتی ہوں یا ایسا کرتی ہوں کہ سیکنہ کے گھر جا کر پیاز والا انڈا بنا دیتی ہوں۔“

”رہنے دیں..... روز کی طرح میں اپنے ہی آنسو کھا لیتی ہوں آج بھی۔“ وہ اوچی آواز میں پولی اور پھر چادر اپنے اوپر تان کر لیٹ گئی۔ اماں جانتی تھی کہ اب اگر اسے سو بار بھی کہہ لو تو وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ منہ بسور کر وہ باہر آ گئی۔ ٹھیک ہے، رات کے کھانے کے لیے کچھ اچھا بنا لیتی ہوں۔ لیکن کیا

اچھا..... جو سین کو پسند تھا، وہ اس گھر میں روز نہیں بن سکتا تھا۔ باہر نکلتے نکلتے اماں ڈھکی ہو گئی۔ نہیں وہ کچھ بھی کر لے گی۔ لیکن آج کچھ دے گی اسے وہ..... صبح سے بھوکا ہے۔ امتحان ہو رہے ہیں اس کے، پڑھائی کا بھی بوجھ ہے۔

”کیا ہوا۔ نہیں کھایا کھانا اس نے۔“ بابا نے کی اتری ہوئی شکل اور ہاتھ میں چھابی دیکھی تو پوچھا۔ ”نہیں..... اس منحوس کام کو چھوڑ کیوں دیتے۔ پورے گھر میں چونا، چونا ہو رہا ہے حالانکہ

نے سارے برتن اچھی طرح دھوئے تھے۔“ اماں با بولنے لگی۔ ایسے وقت میں میاں بیوی ایک دوسرے بول کر اپنی پریشانی کم کر لیا کرتے تھے۔

”کیا کروں پھر..... ساری زندگی یہی تو

آ رہا ہوں۔ اب ایک دم سے کچھ اور کیسے کروا اس نے اسی خوشبو میں سانس لی ہے۔ یہیں پلٹی ہے وہ..... کہیں اور سے تو نہیں نہ اٹھا کر لے آئے اسے..... یہ یہی کھانا کھاتی رہی ہے جو ہم بھی کھا رہے ہیں۔ پہلے تو بھی ایسا نہیں کرتی تھی اب ا دم سے اسے کیا ہو گیا ہے؟“ بابا سدا کی بے چا سے بولے۔ جس پر اماں کو شرمندگی ہوئی۔ تار میں گردن ہلائی خاموشی سے باورچی خانے میں گئی۔ وہ جانتی تھی کہ پایا جو کہہ رہے ہیں ٹھیک رہے ہیں۔ جانتی وہ بھی تھی جو اندر چادر تان کر بے ہی لپٹی ہوئی تھی۔

بابا غربت والی بے بسی سے سر جھٹک کر سے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔ خشک ناڈل پر پھر۔ ریگ مال پھرنے لگا۔ سفید برادہ اڑنے لگا۔

☆☆☆

پہلے پہل یہ گھر صرف اور صرف ضرورت مطابق چل رہا تھا۔ یہ ایک ایسا گھر نہ تھا جس باہر کی دنیا کا اثر معدوم تھا اور ابھی نئی اور روایتوں میں جنگ نہیں چھڑی تھی..... پھر بہت میں اس میں خواہشات کا مکمل دخل شروع ہ پرانے زمانے کے بنے اس گھر میں ماضی کا جا

فلکست کھا کر بھٹکتا ہوا نظر آتا تھا۔ گھر میں بابا تھے۔ اماں تھی اور ایک چھوٹی بہن زویا..... جس کا وجود گھر میں نہ ہونے کے برابر تھا۔

اماں چکی چلاتی تھی۔ ملک کی ایک مشہور کمپنی پتھر کی چکی کا آٹا بھی الگ سے بچتی تھی۔ پہلے پہل اماں فیکٹری جا کر یہ کام کرتی تھی۔ وہ صبح جاتی تھی اور شام میں آتی تھی۔ بابا اپنا کام گھر پر ہی کرتے تھے اور اماں کے فیکٹری جانے کے بعد اسے اسکول چھوڑنے اور لانے کے علاوہ دوپہر کا کھانا بھی وہ ہی دیتے تھے۔ اس نے بچپن کو ایک الگ ہی رنگ میں گزارا تھا۔ غیر فطری لیکن مسکور کن احساس تھے۔

اماں کی عدم موجودگی نے اس کے اندر کسی طرح کا کوئی احساس محرومی پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ اماں کے فیکٹری جانے اور آنے پر بہت خوش ہوا کرتی۔ وہ اس دن بھی بہت خوش ہوئی جس دن اماں نے گھر میں چکی لگائی تھی۔

اماں سمیت محلے کی اور بھی بوڑھی عورتوں کو، ان کے ہی مطالبے پر، فیکٹری والوں نے ان کے گھروں میں چکیاں لگا کر دے دی تھیں۔ اس شرط پر کہ صفائی کا خاص خیال رکھا جائے گا..... اماں اسی شرط کی وجہ سے چکی کو ٹاٹ کی بنائی کھولی کے اندر بیٹھ کر چلاتی تھی۔ اب بھی کبھی کبھی ٹیم صفائی کی صورت حال چیک کرنے آ جایا کرتی اور سین کا دل کرتا کہ وہ اس دن گھر میں خوب سا گند ڈال دے تاکہ اماں کی چکی سے تو اس کی جان چھوٹے۔

سین سے چھوٹی بہن زویا تھی۔ جو دن بھر میں ایک ہی جملہ ”اماں بھوک لگی ہے“ بولتی تھی۔

اماں کا کہنا تھا کہ بچپن کا بخار اس کے سر پر چڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹر ز کہتے تھے کہ اسے بہتے علاج کی ضرورت ہے۔ اس کے تالو کا آپریشن ہونے والا ہے۔ دانی کہتی تھی کہ اسے روز نہار منہ کشتے کھلائے جائیں ورنہ یہ لڑکی ساری زندگی ایسی ہی رہے گی۔ حکیم کہتے تھے کہ اسے کم از کم پانچ سال لگاتار پھلکیوں کی ضرورت ہے اور تعویذ گنڈے والے

بابے کہتے تھے کہ اس کے نام کے دو بکرے کے طور پر دیے جائیں۔ یہ سارے حل ایسے پورے نہیں کیے جاسکتے تھے۔ بات جو بھی نتیجہ یہ تھا کہ زویا سال بھر میں ”اماں بھوک“ کے علاوہ بس چار پانچ لفظ ہی نئے بولے اور ”اماں بھوک لگی ہے“ بھی وہ دن میں بار بار ہی کہتی۔ اگر اسے روٹی مل جاتی تو ٹھیک ورنہ تنک خاموش ہی رہتی تھی۔

اس کا مستند علاج اس کے تالو کا آپریشن باقی سب مسئلے نفیاتی تھے جو بعد میں ٹھیک تھے۔ لیکن اماں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے چہرے پر آپریشن کا کوئی داغ پڑے۔ اس ط کی شادی ہونے میں مسئلہ ہوگا۔ بے چارہ سادی اماں..... اس کی شادی کے مسئلے کا ایک بڑے مسئلے کو فراموش کر رہی تھی۔ اس ہونے کا۔ چھوٹی سارے محلے میں ”گوگئی“ سے مشہور تھی۔

بابا سالوں سے چونے کے کام سے تھے۔ چونے میں پانی ڈال کر پہلے آمیزہ پھر اس آمیزے کو سانچوں میں ڈال کر بنانا۔ ”طغرنے“ جن کے بہت سے نمونے۔ بریلین لکھی ہوتی تھی، کسی پر کلمہ، کسی پر لور اور کسی پر صرف اللہ، محمد۔

طغروں کے علاوہ بھی بابا بہت سے بنانے میں ماہر تھے..... تاج محل، مسجد، شاہی قلعہ، شیشے جڑے گل دان، سر پر عورت، بہر شیر، عقاب، گھوڑے، جڑوا اونٹ اور بڑے مکمل..... کچھ چیزیں سانچوں میں۔ ریڑ کے سانچوں میں یا آہنی سانچوں کچھ چونا گوندہ کر گھومتے چاک پر بنتی تھیں۔ دان، مکمل وغیرہ۔ کچھ کو سانچوں میں سے نکال کے اوپر پھر ہاتھ سے بھی بھر پور محنت ہوتی تھی محل، مسجد، عقاب، شیر..... یہ ایسے نمونے پھر نوک دار اوزاروں کی مدد سے سانچوں

کاری کو مزید بہتر کیا جاتا تھا۔ بابا بے حد باریک بینی سے ہر ہر ماڈل پر کام کرتے تھے۔ ریگ مال سے ماڈلوں کی سطح کو ہموار کیا جاتا۔ پھونکیں مار کر برادہ پیچھے کیا جاتا۔

کچھ نمونوں کو ہاتھ سے بنانا پڑتا تھا۔ جن میں زیادہ تر آرڈر کا مال ہوتا تھا۔ بنانے والے اپنی مطلوبہ چیز کا نمونہ، تصویر یا خیال اپنے ساتھ لاتے تھے۔ اب اس چیز کا سانچہ تو بابا کے پاس ہوتا نہیں تھا۔ اس لیے پھر وہ بابا کو ہاتھ سے ہی بنانی پڑتی تھیں۔ جیسے سال پہلے ایک گاہک بابا کے پاس ایک خاص آرڈر لے کر آیا تھا۔ وہ سیر کرنے کی پہاڑی علاقے میں گیا تھا۔ وہاں کی ایک مسجد اسے اتنی پسند آئی کہ وہ اس کا ماڈل بنا کر اسے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بابا کو مسجد کی لی گئی بہت سی تصاویر دکھائی تھیں اور بابا نے ایک دن کے اندر اندر مسجد کی ہو بہو نقل چونے کے ذریعے بنادی تھی۔ وہ امیر گاہک اتنا خوش ہوا تھا کہ اس نے بابا کو اضافی پیسے دینے چاہے تھے لیکن بابا نے اپنی محنت کے علاوہ باقی اضافی پیسوں کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔

”میرے فن کی قیمت ہے لیکن اتنی ہی جتنی میں محنت کرتا ہوں۔ میرے اندر لالچ کے جذبات مت جگائے۔ ورنہ پھر میں ایک سیدھی سادی تھالی بھی بنانے کے قابل نہیں رہوں گا۔“ گاہک بابا کے جذبات کی قدر کرتا ہوا خاموشی سے چلا گیا۔ پہلے کی بات اور بھی لیکن اب وہ بابا کے ان اصولوں پر راضی سمجھتی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے بچپن سے ہی اس سب سے بے ہر تھا۔ بابا کے طغروں سے تو وہ بہت دل کے ساتھ کھلا کرتی تھی۔ جو ماڈل ٹوٹ جاتے تھے وہ سب اس کی جاگیر ہو جاتے تھے۔ اسے یہ کام ہمیشہ سے بہت پسند رہا تھا۔ بچپن میں وہ اپنی چھٹی بابا کے پاس ہی گزارتی تھی۔ صبح اٹھ کر بابا کے پاس آنا اسے اچھا لگتا۔ بابا فجر کے بعد سے کام کرنے لگ جاتے۔ اماں اٹھ کر ناشتا بنانے لگ جاتی اور وہ

پیری پیاری باتوں سے بابا کا دل بہلاتی رہتی۔ کے ماڈلوں پر وہ ریگ مال مارتی تھی۔ بابا کام کر جاتے اور اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے رہتے۔ ساتھ ساتھ وہ اسے بتاتے بھی جاتے تھے کہ اس ماڈل کا نقشہ ہے۔ اسے کس طرح بناتے ہیں۔ اس کی خاصیت ہے۔ چونا کیا ہوتا ہے۔ چونے کی گھٹی ا کی ٹس ٹس میں تھی۔ بابا چونے کو ”الماس برادہ“ کہتے تھے اور ہمیشہ اس کے نہ سمجھنے پر اسے سمجھا۔ تھے کہ الماس برادے کیا کیا مطلب ہوتا ہے۔

”پتھروں میں الماس کو ”کورا پتھر“ کہا ج ہے بٹی۔ الماس کی کوئی خاصیت نہیں ہوتی۔ ا کے باوجود یہ ہی سب سے زیادہ خاصیت رکھتا ہے۔ یہ ویسائی اثر اپنا لیتا ہے۔ جیسا ہم اس سے چاہیں۔ یہ بد کے پاس بد ہوتا ہے اور نیک کے پاس نیک۔ یہ مٹی پکار مٹی جواب دیتا ہے اور مثبت پکا مثبت۔ یہ ہراک کی انگلی میں اس کی جنم گھٹی کو چکھ ہے۔ یہ اس فطرت کے مطابق چلتا ہے جس تحت ہم اسے چلانا چاہتے ہیں۔ نہ یہ باغی ہے اور سرکش..... یہ اپنے اثر پر حرف آنے نہیں دیتا ہے۔ چونا بھی الماس کی ہی قسم ہے۔ سالم حال

میں یہ بھی پتھر ہوتا ہے۔ الماس زمین کی آگ جل کر الماس بنتا ہے۔ چونا نامیں ٹوٹ کر چونا بنتا ہے۔ لیکن یہ اسی لیے ٹوٹتا ہے کہ ہم اسے اپنی پسند کے بھی قالب میں ڈھال سکیں۔ یہ الماس سے بھی کم برست ہے۔ اس کے برادے میں عجز ہے اور الما جیسی خاصیت ہی ہے۔ یہ بھی اس رنگ میں رہ جاتا ہے جس میں ہم چاہتے ہیں۔ مشاق ہاتھ اپنی مرضی سے موڑ کر الماس سے بھی زیادہ قیمتی دیتے ہیں۔ اسی لیے میں اسے الماس برادہ ہوں۔“

وہ سمجھ کر بھی انجان رہتی۔ ابھی اس کے ذہن نے اتنی وسعت نہیں اختیار کی تھی کہ وہ ان پیچیدہ لفظوں کے مطلب سمجھ سکتی۔ پھر بھی اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ الماس اور چونے کی نسبت یقیناً کوئی بہ

ہی خاصیت رکھتی ہے اور بابا کی بات میں یقیناً بہت دم ہے۔ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔

بابا کا ہاتھ بٹاتے بٹاتے وہ ان کاموں میں اتنی اچھی ہو گئی کہ بابا کی ہی طرح کام کرنے لگی۔ اسے یہ کام اچھا لگنے لگا۔ اس کا، اس کام میں دل لگ گیا تھا۔ بابا بھی آہستہ آہستہ ماڈلوں پر ریگ مال مارنا چھوڑتے گئے۔ وہ باقی سارا کام خود کرتے اور ریگ مال مارنے کا کام اس کے لیے رکھ چھوڑتے تھے۔ وہ بابا کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ پہلے بابا اس کے ریگ مال مارے ہوئے نمونوں پر ہلکے سے پھر سے ہاتھ مار دیا کرتے تھے۔ جہاں انہیں کمی رہ گئی ہوتی اسے دور کر دیا کرتے تھے لیکن پھر بابا سارے کا سارے اس پر ہی انحصار کرنے لگے۔ اس کے کام کا ایک حصہ مکمل ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے بہت کچھ مزید سیکھنا تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔

اس کے اندر یہ سب شوق صرف بابا کی ہی وجہ سے ہی نہیں آیا تھا۔ اس میں کچھ عمل دخل اس آرٹ کالج کا بھی تھا جسے وہ اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا کرتی تھی۔

کسی زمانے میں ان کا گھر آرٹ کالج کے سرونٹ کوائرڈ کا حصہ تھا۔ پھر جب آرٹ کالج کی اراضی کا کچھ مسئلہ ہوا تو ان کا گھر سرونٹ کوائرڈ سے باہر کر دیا گیا۔ نئی دیواریں بنادی گئیں اور گھر میں تاریکی چھا گئی۔ تایا اباتب ساتھ رکھتے تھے۔ دونوں نے مل کر گھر کا ایک نیا راستہ نکالا تھا۔ گھر کی دوسری طرف سے..... بابا کے کہنے پر کالج کی انتظامیہ نے دیوار میں ایک کھڑکی کھلی رکھنے کی اجازت دی تھی۔ یہ کھڑکی سین کے کمرے کی تھی۔ جو آنے والے دنوں میں اس کی ذات کے اندر بہت سی تبدیلیاں لائی تھی۔ ایسی تبدیلیاں جنہوں نے اس کے طفلانہ خیالات اور غیر منظم سوچ کوئی دلیری بخشی تھی۔

وہ پہروں اس کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کو دیکھا کرتی۔ جوان کے گھر سے اور ان کی فلی سے ایسر مختلف تھی۔ ایک دیوار کے فرق میں دو الگ الگ دنیا

آباد تھیں۔ وہ بچپن سے ہی سوسائٹی۔ سمجھ چکی تھی۔

اسکول سے واپسی پر وہ اکثر اس پاس بیٹھ جایا کرتی تھی اور پھر اداس بھو گھر کے اندر ماڈل بنانے کے بعد اس تفریق تھی جو اس کو بیک وقت خوش بھی اداس بھی..... کالج کے پارک میں لڑکیاں خوش گپیاں کرتے نظر آتے۔ مصوری کر رہا ہوتا، کوئی مجسمہ سازی عجیب عجیب طرح کا کام کرتے نظر کاغذوں، رنگین کپڑوں اور مختلف طرح سے، جسے وہ کسی بھی صورت سمجھ نہیں طرح کا کام تھا جو وہاں نہیں ہو رہا ہوتا تھا

ان سب کے چہروں پر دولت خوش حالی کا اطمینان اور فراوانی کی طر پارک کی گھاس میں بیٹھے ہوتے اور اس دنیا کے سب سے خوش قسمت لوگ لگتے میں وہ گھاس بھی خوش قسمت ہوتی جم ہوتے تھے۔ وہ سلی بیٹج بھی، ہاتھ میں فالتیں بھی..... وہ سب خوش باش چہرے۔ اداس کر دیتے۔ اماں بابا نے اس کی نہیں کی تھی۔ پھر نجانے کیوں وہ ان کو محسوس کرنے لگی۔ اس کا ذہن خود ہونے لگا۔ جس نے اس کا اندر باہر مچر تھوڑی وسعت سے پرکتی تو جان جاڈ جگہ موجود ہوتے ہیں۔ سیری، امیر کا فاقوں، غریبی میں بھی۔ اماں اسے دبا روکتی تھی۔ پھر انہوں نے اسے اس کے دیا۔ اس گھر میں اور تھا ہی کیا۔ اب کیا تفریق سے بھی محروم رکھتی۔

یہ کھڑکی جب بھی بند بھی ہوتی اس پر سحر طاری کیے رکھتی تھی۔ وہ ان لڑ باتیں سنا کرتی جو آسانی سے بند کھڑکی تختے کے پار سے سنی جاسکتی تھیں۔ کچھ

اس کے نمبر ٹھیک آئے تھے۔ نہ اتنے کم تھے کہ اسے کہیں داخلہ نہ مل سکتا اور نہ ہی اتنے زیادہ کہ پورے ملک کی یونیورسٹیز اسے بلاوے بھجواتیں۔ بابا اس کے لیے کوپروڈ کے کالج کا پراسپیکٹس لے آئے تھے اور اس نے چپکے سے آرٹ کالج کا پراسپیکٹس خرید لیا تھا۔ اس نے اسے فل کیا اور جمع کروا دیا۔ دونوں کالجز کی میرٹ لسٹ میں اس کا نام آ گیا تھا۔ کوپروڈ والے اسلامیہ کالج میں بھی اور پاس والے آرٹ کالج میں بھی۔ اب مسئلہ فیس کا تھا۔ کوپروڈ کی فیس آسانی سے ادا ہو سکتی تھی اور آرٹ کالج والے کی فیس گھر تک کر بھی ادا نہ ہو سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ پرنسپل کو کسی طرح اپنے ”شاہکار“ دکھا دے تو وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اسے آسانی سے، بنا فیس کے بھی داخلہ مل جائے گا۔ چڑا سی کو اپنے نمونے دکھا کر وہ پرنسپل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ پرنسپل صاحب اپنے بڑے سے کش پش آفس میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

”یہ سب میں نے بتائے ہیں۔“ وہ بابا کے بتائے ہوئے ماڈل لے گئی تھی جو وہ خود بھی اب آسانی سے بنا سکتی تھی۔

”اچھا؟“ پرنسپل نے ایسے کہا کہ تو پھر ہم کیا کریں۔

”میں ایک لائق اسٹوڈنٹ ثابت ہوں گی۔ آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“ اتنا اعتماد اس کے اندر نجانے کیسے آ گیا تھا۔

”بنا فیس کے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اس کی ظاہری حالت اور چہرے کی بے چارگی سے اصل بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

”آپ کو ٹیلنٹ نہیں چاہیے کیا؟“ اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”شاہکار.....“ دیکھ کر بھی اسے رد کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات تو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی۔

وں کی برائیاں کرو رہے ہوتے، ہنستے ہنستے ان کی س کرتے، ان کے پڑھانے کے انداز کی نقل کرتے۔ کچھ کھیل، تعلیم اور کالج میں ہونے والی نئی نیوں کو ڈسکس کرتے اور کچھ ”راز و نیاز“ اس سے انجان کہ پرانی معدوم کھڑکی کے پیچھے ایک بیٹھی لڑکی ان کی راز دار بن چکی ہے اور ان کی ہنسن کر اس کی آنکھوں میں ایک دل چسپ چمک لگی ہے۔

دل ہی دل میں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی کالج میں پڑھے گی۔ وہ یہاں پر بابا کے کام کو بنیادوں پر سیکھے گی۔ اسے دنیا میں نئی جہت سے ف کروائے گی اور یقیناً تب وہ اپنی کلاس کی سے لائق اسٹوڈنٹ ہوگی۔ اس کے استادوں کو پرفخر ہوگا۔ جو ایک کام کو اتنی مہارت سے کرنی اسی سوچ کے پیش نظر وہ بابا کے کام کو مزید دل سے سیکھنے لگی تھی۔ بابا کو اس کے خیالات کا ذرہ بھی احساس ہوتا تو وہ اس کو کام کرتے ہوئے کے لیے بھی اجازت نہ دیتے۔ کہاں کام کرنے..... جن گھروں میں ایک وقت کی روٹی چھکی کی منٹ ہو وہ ایسے کالج میں داخلے کا کیسے سوچ ہیں جہاں کی کینٹین کی چائے ہی اتنی مہنگی ہو کہ سے ان کے گھر دونوں کی ہانڈی آرام سے بن گئی۔

یہ بات سین بھی جانتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ جادو کی چھڑی کے خواب دیکھ رہی تھی یا وہ ابھی ایک ایک روپیہ جوڑنے لگی تھی۔ وہ تو بس اس کی اسکا کرشپ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ دن پڑھنے لگی اور بابا کے ساتھ کام سیکھنے لگی۔ اس پر ہم آ بھی گئے تو کیا۔ جب وہ پرنسپل کو اپنا بنایا ڈول دکھائے گی تو وہ اسے فوراً ایڈمیشن دے دیں۔ وہ جانتی تھی۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ خواب ت کا روپ نہ دھاریں تو بھالے کی طرح دل تر جاتے ہیں۔

”ٹیلنٹ پہلے ہی سے اس ملک کے اندر بہت موجود ہے۔ ہم اپنے کالج کے نام پر اسے باہر نکالتے ہیں۔“ پرنسپل نے فخر، جس میں غرور کی چاشنی بھی تھی، سے کہا۔ ”فیس جمع کروانے کی آخری ڈیڈ لائنوں پر ہوں۔ میں تمہیں ایک ہفتے کا اور وقت دے دیتا ہوں۔“

”لیکن میرے پاس فیس.....“

”اپنے یہ ماڈل اٹھاؤ اور..... جاؤ.....“

اس دوران چہرہ اسی بھی اندر آ گیا تھا اور میز پر جائے لگاتے ہوئے ترس بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی ضد پر اس نے اسے اندر تو بھیج دیا تھا لیکن شاید وہ جانتا تھا اندر اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

”میں اپنے کلاس فیلوز کی بھی مدد کر دیا کروں گی۔“

”یہاں مدد کسی کو نہیں چاہیے۔ سب کو ڈگری چاہیے۔ تمہیں کس نے کہا کہ ہم یہاں کام سکھاتے ہیں۔“

”لیکن..... آپ میری بات.....“

”میرے چائے پینے کا وقت ہو گیا ہے۔“ پرنسپل نے ہاتھ سے باہر کا اشارہ کیا۔ یہ دفع ہو جانے کا سب سے مہذب اشارہ تھا۔ وہ یک ٹک پرنسپل کو دیکھنے لگی۔ کیا وہ ”کالج“ کا ”پرنسپل“ ہی تھا۔ اپنے روپے سے تو اسے کسی دکان کا ملازم بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا اللہ اتنا ہی فیاض ہے۔ اس کے اندر سے شکوہ پھوٹا جو اس کے پورے چہرے پر چھا گیا۔

”صرف فیس کی بات ہوتی تو میں کسی طرح بندوبست کر بھی لیتی لیکن یہاں آنے کے لیے مجھے بدتہذیب بھی ہونا پڑتا، جو میں نہیں ہو سکتی تھی۔“ اس کا اشارہ پرنسپل کی طرف تھا جس کے جواب میں پرنسپل نے ساکت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ کا دھواں چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ماڈل اکٹھے کرنے لگی۔ اس کا دل بری طرح سے ٹوٹا تھا۔ تب ہی باہر جاتے چہرہ اسی سے نجانے کہاں

کو تباہی ہوئی یا اس نے ہی میز پر ماڈل رکھے ہوئے تھے کہ ان میں سے ایک ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔

”اوہ..... یہ کیا کر دیا آپ نے۔“

سے زیادہ وہ ڈکھ بھری آواز میں بولی۔

”زیادہ جلاؤ نہیں..... یہ لو پیسے یہاں سے۔“ پرنسپل نے اپنی کوٹ کی

سے ایک سوکانوٹ نکالا اور اس کی طرف پرنسپل کے بعد اس نے گرے ہوئے

ٹوٹ کو دیکھا اور دہشتی رہی۔

”کیا یہ کم ہیں؟ میں اور بھی دے سکتا ہوں۔“

اگر یہ تمہیں کم لگ رہے ہیں تو جان لو کہ زیادہ ہیں۔ اس ماڈل کی حیثیت سے ہم

اوقات سے بھی۔“ سچ بات سچ دھوکا کمرے میں پھیلی۔ پرنسپل نے بدلہ لے

”آپ مجھے داخلہ نہ دیتے..... پر بھی نہ گراتے۔“ روتی ہوئی وہ باہر آئی

باغ میں بیٹھ کر ہی نجانے کتنی ہی دیر رو اس کے باقی سارے ماڈل اندر پرنسپل۔

یہ رہ گئے تھے۔ اسے اب ان کی ضرورت تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ ایک ملاز

باہر لا کر کوڑے کے ڈرم میں پھینک رہا ہے اس کے رگ و پے میں اتر گئی

اس کی حیثیت، اس کی اوقات برہنہ درخت کی طرح اس کے سامنے آ

وہ ایک ایک شاخ پر اپنی بھدی اصلی تھی۔ یہ ہی وہ دن تھا جب اس نے با

لعنت بیچی اور ان وقتوں کو کو سا جب وہ کام کرتی رہی تھی۔ وہ کو پر روڈ والے

میں آ گئی۔ ایک عام سے کالج..... لیکن اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ تو اس عام سے زیادہ عام ہے۔ کم حیثیت، اوسط، غی

اپنے جیسی لڑکیوں میں تھی جو کہ کسی صورت نہیں تھیں۔ وہ سب اس سے اتنی بہتر تھیں۔

آتی تھی۔

چونا، چونا، چونا..... اس گھر میں سانس لینے کے لیے صاف ہوا بھی نہیں ہے۔ الماس برادرہ؟ ہونہہ..... وہ نخت سے سوچتی..... یہ تو وہ کوئلہ تھا جس نے ان کی زندگی بھی کوئلے کی ہی طرح سیاہ کر دی تھی۔ ابا کی بات کو وہ اب بھی۔ کالج جانے کے بعد اس کا ذہن واقعی وسعت اختیار کر گیا تھا۔ وہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اماں جانتی تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جوڑ جوڑ میں بھری دس کے بعد اس کے بس میں کچھ نہ رہا تھا۔ ہاں وہ اتنا کر دیا کرتی تھی کہ اس کے کالج سے آنے سے پہلے پیہوں والی پیڑھی گھسیٹ گھسیٹ کر فرش دھو دیا کرتی اور قطب الدین کو کہہ دیتی کہ کام ختم کر لے..... لیکن بابا کا تو کام ہی یہ تھا۔ اب اگر وہ یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے..... ساری زندگی یہ کام کرنے کے بعد وہ ایک دم سے کیسے کسی اور کام میں خود کو جذب کر لیتے۔

اسے چونے، اڑتے ہوئے آٹے، زویا، اس گھر سے، اپنے کمرے سے..... ایک ایک چیز سے مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے چکی کی گھوگھو سے نفرت ہو گئی تھی۔ اکثر وہ سوتے میں چلا اٹھتی۔

”اماں بند کر دو چکی مجھے سونا ہے۔“

”چکی تو بند ہے میں تو باورچی خانے میں ہوں۔“ اماں کی آواز آتی۔

کبھی اسے محسوس ہوتا کہ بابا ریگ مال طغروں پر نہیں بلکہ اس کے کانوں پر گزر رہے ہوں۔ وہ اٹھ کر دیکھتی تو اسے پتا چلتا کہ بابا تو گھر پر ہی نہیں ہیں۔ سب چیزیں اس کے اعصاب پر سوار تھیں اور اسے چڑا رہی تھیں۔ اسے کس چیز سے زیادہ نفرت تھی وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔ ماں باپ اس کے پیار کے ہاتھوں چپ تھے اور وہ ایسے پیار کو نہیں مانتی تھی جو منہ بند کر دیتا ہے۔ وہ پیار میں منہ بند کروانا جان گئی تھی

☆☆☆

کالج میں کوئی فنکشن تھا۔ اس نے اماں سے

واہ وہ دنیا کی سب سے قابل رحم مخلوق ہے۔ وہ کم دولت مند تھیں پر پھر بھی خوش تھیں۔ آلو اور نان ایسے کھاتی تھیں جسے فانیو اشار سے منگوا کر کچھ کھا رہی ہوں۔ بوتل کو بڑی عیاشی تھیں۔ اماں سین کو اتنے پیسے تو دیتی ہی تھی کہ وہ بیاہی کر سکے۔ دونوں میاں بیوی کے اپنے تو خرچے رہ نہیں گئے تھے۔ چوتھا وہ اسے دے تھے۔ پھر بھی نجائے کیا بات تھی کہ اس کے اندر اس کتری بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہاں عام سے گھرانوں کی لڑکیاں وہ، وہ فیشن تھیں کہ سین دنگ رہ جاتی۔ وہ ہنستی تھیں، بولتی، خوش ہوتی تھیں، چچہا جاتی تھیں۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا تھا کہ اس کی تو مسکراہٹ بھی کسی کام میں ہے۔ اس کے پاس کوئی ایک بھی چیز ایسی جس پر وہ اترا سکتی..... اس کی خوب صورتی بھی پہنچ کر زریو ہو گئی۔ جب اس نے اپنے سے بھی نیک شکل و صورت کی لڑکیوں کو خود سے زیادہ اعتماد لیکھا۔ تو اس کا سارا اعتماد خاک میں مل گیا۔ اس کو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ شاندار ماضی نہ ہی روشن

جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا انتشار بھی ہی گیا۔ خلفشار کج روی پر آمادہ تھا۔ وہ کب تک سے جنگ کرتی۔ اس کی بہت سی باتیں بدلنے لگی۔ اس کے جنم کا ستارہ عقرب..... زہریلا تھا۔ اس کے اندر پرورش پانے لگا۔ وہ بات بات نے لگی، چڑنے لگی۔ زویا گھر میں اس سے سب زیادہ قریب تھی لیکن کالج میں داخل ہونے کے بعد اس سے بھی خدا واسطے کا بیر ہو گیا۔ وہ ہر اس پر بھی پھنکارنی رہتی..... زویا اس کے آتی تو وہ اسے پرے دھکیل دیتی..... اس سے کیا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ہر کام میں زویا جیسے دلی تھی لیکن اب جیسے گلوں کی رت بدل چکی۔ زویا نے بھی جان لیا تھا کہ سین اب پہلے والی نہیں رہ گئی۔ وہ اب خود ہی اس کے قریب نہیں

ایک ہفتہ پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے اتنے پیسے چاہئیں۔ اماں نے جسے تیسے کر کے اسے اتنے ہی پیسے دے دیے تھے جتنے اس نے مانگے تھے۔ یہ پیسے اس نے اسے اپنی جوڑی ہوئی رقم میں سے دیے تھے۔ جو دونوں اس کی شادی کے لیے جوڑ رہے تھے۔ پہلے کے دن ہوتے تو اماں اسے پیار سے سمجھا دیتی..... فنکشن پر نہ جانے کا کہہ دیتی، پرانے کپڑے پہن لینے کو کہتی یا پڑوس کی کسی لڑکی کا کوئی لباس منگوادیتی..... جیسا کہ وہ اکثر شادی پر ارد گرد سے مانگ ہی لیتی تھی اور سب ایک دوسرے کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ عید وغیرہ کے کپڑے لڑکیاں بڑی آسانی سے ایک دوسرے کو آفر کرتی تھیں۔ خاص کر ایسے حالات میں جب انہیں پتا چلتا کہ فلاں کے خاندان میں کوئی شادی آگئی ہے یا کوئی خاص تقریب ہے۔

وہ ایسے ہی حالات میں تو پلی بڑھی تھی۔ اس نے کتنی ہی بار اپنی پڑوسنوں کے کپڑے پہنے تھے اور انہیں بھی پہننے کو دیے تھے۔ لیکن اب اسے اس محلے سمیت محلے کا ایک، ایک فرد بھی برا لگنے لگا تھا۔ کہاں ان کے جسموں کے اترے ہوئے کپڑے پہننا..... اس کا موڈ اس طرح کا ہو چکا تھا کہ بابا، اماں اسے کچھ بھی نہیں کہتے۔ وہ ایسے ہی چلنے لگے جیسا سبین چاہتی تھی۔

پیسے لے کر وہ اکیلی بازار سے جا کر شاپنگ کر آئی۔ اس بار زویا کو بھی نہیں لے کر گئی تھی۔ اس نے اپنی پسند کی چیزیں لی تھیں۔ ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ اسے کچھ پیسے بچا لینے چاہئیں بلکہ لباس کے بعد جو پیسے بچ گئے تھے اس نے انہیں بھی چھوٹی موٹی فضول کی چیزوں پر خرچ کر دیا تھا۔ اماں نے تمام چیزیں دیکھ کر اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ بھی نہیں کہ پالوں پر لگانے والی پن اتنی مہنگی لینے کی کیا ضرورت تھی۔ ٹاپس ضرورت سے زیادہ مہنگے ہیں۔ جوڑیاں بھی اتنی قیمت کی نہیں تھیں جتنی ان پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح خوش ہو جائے۔ اب

اگر اس نے یہ سب لے ہی لیا ہے تو وہ فنک ہو کر جائے۔

لیکن پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا۔ نہ تو چیزیں پہنیں اور نہ ہی فنکشن پر گئی۔

اماں نے صبح اسے جگاتے ہوئے اسے آج فنکشن پر جانا ہے وہ اٹھ کر تیارا وہ سمجھی تھی کہ اس کی آنکھ نہیں کھل پائی یا نہیں کہ آج اس کے کالج میں فنکشن ہے اماں کے خیال کے برعکس وہ جسم پر تنی ہوڈ نیچے جاگ رہی تھی۔ اماں کی آواز پر اس سے ہاتھ ہٹائے بنا کہا تھا کہ اسے جانا..... اس نے اس انداز سے کہا کہ اماں پر اس کے سر پر کھڑے کھڑے کافی دیر سوچتی رہی اور پھر باہر نکل گئی۔

فنکشن سے ایک دن پہلے وہ اپنی سہیلی چلی گئی تھی۔ اس نے اس کی تیاری دیکھ لی تھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کالج کے فنکشن جائے گی۔ یہ بات اماں بھی جانتی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ جب سے اپنی سہیلی کے گھر۔ لیکن وہ اسے اس بات پر گریہ نہ کی تھی کہ ہمت ہی نہ ہوئی۔

سارا دن اس نے کچھ نہیں کھایا۔ پڑی وہ سوئے کا فریب کرتی رہی۔ گھر میں خلاف معمول خاموشی تھی۔ بابا سامان دیے گئے ہوئے تھے اور آج چکی بھی بند تھی۔ ج تو جمعرات کا دن تھا۔ آج تو چکی پہلے کی نہ چلتی ہے۔ کیونکہ گاڑی آنا لینے آئی ہے۔ خاموشی تھی۔

”نہیں آنا ہو گا آج کسی وجہ سے گاڑی چار بائی پر لیٹی وہ ایسی ہی بے معنی باتیں سوچ رہی تھی۔ اس کی اونچی ایڑی والی جوتی ہی کر تھی۔ اتنے پیسے تو اماں نے مجھے سوٹ سیم کے دیے تھے جتنے کی اس نے صرف جوتی

اور کڑھنے سے اگر رنگ بدلتا تو وہ سیاہ ہو چکی۔

اماں نے دوپہر میں اسے کھانا کے لیے بھیج دیا۔ وہ چادر کے اندر صبح سے شس سے مس نہیں کی۔ سارا دن وہ چارپائی پر، زویا صحن کے کونے پر اور اماں اپنے کمرے میں بند رہی۔

شام میں زویا اس کے لیے روٹی لے کر آئی۔ دوپہر کے کھانے کی غیر حاضری کے بعد اس رات کا کھانا کھانے میں دیر نہیں کی۔ کافی دن کھانے میں سے چوٹے کی بوئیں آتی تھیں۔ اماں فحش والوں کے گھر جا کر روٹی سالن بنا آتی تھی۔ وہ اس کو خوش کرنے کی غرض سے..... کہ کسی رات وہ راضی ہو جائے۔ اکثر وہ سوچتی تھی کہ وہ بابا کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ سب بات اسی کے لیے تو کر رہے ہیں۔ ورنہ وہ دونوں تو آپس کی محبت کے سہارے بھی خوش رہ سکتے۔ وہ احساسِ ندامت کا شکار ہوئی، لیکن پھر اگلے لمحے پرانا سورج پھر سے طلوع ہو جاتا۔

”تو اباماں کو کچھ سوچ کر اولاد کو پیدا کرنا چاہیے تھا کہ جب یہ اولاد بڑی ہوگی تو وہ اسے کیا سبق دیں گے۔“ وہ نوحہ سے سوچتی۔

ابھی اس نے کھانے کا پہلا لقمہ ہی منہ میں رکھا کہ بڑے ذوق کے بعد پھر سے جانی پہچانی سے اس کے تھنوں میں تھکی۔ چوٹے کی تھک..... فٹنشن برنہ جانے کا ڈکھ، کچھ زندگی کی حسرتیں، کچھ مل آرزوئیں۔ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے۔ چھابی کے پکڑے ہی وہ اماں کے کمرے کی طرف گئی۔ دھڑام سے دروازہ کھولا۔

”کھا کر دیکھیں ذرا یہ۔ آج پھر.....“ اس نے اتارے ہوئے کہا اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کا فقرہ منہ میں گھٹ کر مر گیا۔

اماں اپنی چارپائی پر لیٹے، دہری ہوئی، ولے کھا رہی تھی اور بری طرح کھانس رہی تھی۔ لمحے کو وہ سارے شکوے بھول گئی۔

”اماں؟“ وہ اماں کی طرف لپکی۔ ”کیا ہوا؟“ وہ بری طرح سے گھبرا کر بولی اور دیوار کی طرف سے اس نے اس پتھر و جود کا رخ اپنی طرف کیا۔ ”کچھ نہیں.....“ اماں نے بری طرح سے کھانستے ہوئے کہا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ کچھ سے کہیں زیادہ کچھ ہو گیا ہے۔ اماں جس چادر کو منہ میں ٹھونسنے کھانس رہی تھی وہ خون سے تر بہتھی۔

☆☆☆

کھر نے برشکال کا روپ دھار رکھا تھا۔ ماور انہم آسمان کی نیلی بے کراں چھتری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کھڑکی پھلانگ کر وہ آرٹ کالج کے باغ میں ننگے پاؤں ہی نکل آئی تھی۔ سردیوں کا باغ اس سے تر تھا اور چاروں اور کھر بھی۔ اتنی کہ ہاتھ برابر کے فاصلے پر کی چیز نظر نہ آتی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی نجانے کس طرف جارہی تھی۔ اس کے پیروں کی کوئی سمت نہ تھی۔ کوئی منزل ہوئی تو سمت ہوئی۔ وہ تو دیوانگی میں یہاں نکل آئی تھی۔ جیسے اکثر نکل آتی تھی۔

عین درمیان میں ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے ارد گرد پھیلی خاموش فضا کو دیکھا اور ایک چیخ پوری طاقت سے بلند کی..... ایسی دیوانگی سے چلائی کہ پر بھی اس کا غم کم نہیں ہوا تھا۔ وہ پھر سے چلائی تھی اور اب کے اور زور سے چلائی۔ بے جھجک ہو کر، بے خوف ہو کر، اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ سوائے پورے شہر میں سنی جاسکتی تھی۔

وہ پھر چلائی اور لگاتار چلاتی رہی، وہ اپنا غصہ کس پر نکال رہی تھی۔ کھر پر، اوس پر، سوئے ہوئے بے خبر لوگوں پر یا یہ وہ اضطراب تھا جو اس کے جسم میں سے اسی آہ و بکا کے ذریعے سے ہی نکل سکتا تھا۔ چلانے کے بعد جب وہ تھک گئی تو اس پر اپنی بے بسی عیاں ہوئی۔ اس سب کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔ وہ وہیں نیچے گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اماں بابا نے اسے سالوں سے کبھی روئے نہیں دیا تھا۔ اسے تو شاید رونے کا اصل طریقہ بھی نہیں آتا تھا۔ آج وہ جیسے پہلے بار رو رہی تھی۔ یہ آواز اتنی بھیاںک تھی کہ اسے خود بھی اس کے بھیاںک ہونے کا پورا پورا اندازہ تھا۔

اس کے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنے شکوے کیوں بھر دیے گئے تھے۔ اس نے محرومیوں میں آنکھ کھولی یا وہ محرومیاں اس پر بعد میں عیاں ہوئیں۔ اسے وہ سب قبول تھا، اب وہ خدا سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کرے گی، کبھی ناشکری نہیں کرے گی۔ کبھی اماں سے نہیں لڑے گی اور نہ ہی بابا پر بولے گی۔ وہ سب کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن اس کے لیے نہیں جو ہونے جا رہا تھا۔

بابا بھی کھڑکی پھلانگ کر اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ کی طرح یہاں ہی ہوگی۔ لیکن آج اتنی کھڑکی کہ وہ اسے ڈھونڈ ہی نہیں پا رہے تھے۔ وہ چلاتے ہوئے اسے پکار رہے تھے۔ اس کے کانوں میں اپنی ہی آواز کے بھانک اثرات عرقید نہ پا چکے ہوتے تو وہ یقیناً بابا کی آواز سن لیتی۔

دھند کے باعث انہیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ پھر ان کے کانوں میں اس کے روپنے کی آواز پہنچی۔ آواز جو آری کی طرح تیز دھار تھی۔ اسی آواز کا تعاقب کرتے کرتے ہی وہ اس کے پاس پہنچے اور وہ انہیں ایک جگہ مل گئی۔ زمین پر گر گئی۔ ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے اس کے پاس پہنچ کر اسے کندھوں سے اٹھایا۔

”اتنی جلدی گھبرا گئیں۔“ وہ پیار سے بوجھ رہے تھے۔ وہ پھل کر ان کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔ آج وہ جیسے سارے اگلے پچھلے شکوے بھول گئی تھی۔ دکھ نے اسے سن کی ڈوری کی طرح مروڑ کر رکھ دیا تھا۔

”میں پہلے بھی اتنا کون سی مضبوط تھی بابا۔“ آج اس نے بڑے عرصے کے بعد بابا سے اتنے پیار

سے بات کی۔

”کچھ نہیں ہوگا تمہاری ماں کو۔“ بابا اداس ہو گئے۔ جیسے انہیں خود بھی یقین وہ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ او کوئی ایسی ہی جھوٹی آس چاہتے تھے۔ کہا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا اسے..... بہن ہے انہوں نے۔“

”مت جھوٹ بول لیے مجھ سے۔“ جھوٹ بول لیے اپنے آپ سے۔ آپ اماں رہے؟ وہ لمحہ لمحہ مر رہی ہیں۔ ہم ایک از کے منہ میں جاتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور رہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم اتنی جلدی گئی ہو۔“ انہوں نے جلدی سے اس تردید کی۔

”یہ سب ہمارے ساتھ ہی کیوں بابا..... اگر انہیں کچھ ہوا تو میں مر جاؤں بابا کی کسی بھی تسلی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔“ کچھ نہیں ہوگا..... نہ تمہیں، نہ۔ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تو سمجھتے ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی بھی بچی ہی تھی۔ چھوٹی بچی، یا جیسے اس کا بچپن پھر سے اس سے اچھی تو زوایا گئی۔ جو خاموشی۔ رہی تھی اور محل سے پیسی تھی۔ اسے آنے کا پہلے سے ہی قرار تھا۔

”گھر چلو..... خدا سے دعا کرو..... گا۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگائے گھر کی طرف تھے۔

لیکن کچھ ہونے والا تھا اور یہ بات جانتے تھے۔ بین ہر وقت روتی رہتی۔ ا نے فی الحال بند کیا ہوا تھا اور گھر کا کام سنا اماں مہینے بھر سے ہسپتال میں ہی ایڈم اماں کا اچھے سے اچھا علاج کر دیا۔ زندگی میں کسی کی جان کا شکوہ نہیں

ہو رہی۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔ سب تکلیفیں ختم ہونے والی ہیں۔“ اماں نے کہہ دیا جو وہ سننا چاہتی تھی لیکن یہ الفاظ اس طرح ادا ہوئے کہ اس کا دل پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔

”سین.....؟“

”جی اماں.....“ اس نے اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکا تھا۔

”کیا تمہارے دل میں کوئی ہے؟“ اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ یہ سوال غیر متوقع تھا اور بے موقع بھی.....

”مجھے بتاؤ سین..... میری بیٹی.....؟“ اماں نے اصرار سے پوچھا۔ دُور کہیں ایک آواز بادلوں کے تھہ پر سوار اس تک پہنچی۔ ”میرا نام میراں ہے۔“

”میں تمہاری ماں ہوں سین..... مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ.....“

آواز پھر آئی۔ ”لڑکی اپنا نام تو بتا جاؤ۔ پھر کبھی ملاقات ہوئی تو تمہیں کس نام سے پکاروں گا۔“ وہ اس آواز کے طلسم میں کھونے لگی تھی۔ اماں نے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے دبا ہوا تھا۔

”نہیں..... کوئی نہیں.....“ اس نے اتنی مدہم آواز سے کہا تھا جیسے خود بھی اس بات کا یقین نہ کرنا چاہتی ہو کہ کوئی نہیں ہے۔

”تمہارے بابا کہاں ہیں؟“

”وہ باہر لاؤنج میں سو رہے ہیں۔“ جب سے اماں کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی بابا دن رات ہسپتال میں ہی گزارتے تھے۔ زویا ان دنوں پڑوس کے گھر میں رہ رہی تھی۔

”انہیں بلا کر لاؤ.....“ اماں نے کہا تو۔ وہ فوراً باہر نکلی بابا کو اٹھا کر اس نے انہیں اماں کا پیغام دیا۔ بابا فوراً اماں کے کمرے کی طرف لپکے۔

”تم یہاں ہی رہو.....“ بابا نے اندر جانے سے پہلے اس سے کہا تو۔ اس کے قدم رک گئے

بابا نے اماں کو سرکاری ہسپتال سے برائيوٹھال میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی طرح کی کوتاہی نہ چاہتے تھے۔ سین نے ایک دو بار ان سے پوچھا کہ وہ اتنے پیسے کہاں سے لے کر آ رہے ہیں لیکن اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پائے۔

دن بھر بابا کی ہسپتال میں ڈیوٹی کے بعد رات وہ اماں کے پاس رہتی اور ساری رات تقریباً بے کر گزارتی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اماں کو نہیں کر رہی تھی۔ اماں خاموش تھی۔ اماں کے لیے کوئی نصیحتیں نہیں تھیں اور نہ ہی۔ نجانے وہ ہسپتال کے بستر پر لیٹی چھٹ کو کھورتی کیا سوچتی رہتی تھی۔ آنسوؤں کی ایک موی لکیر ان آنکھ سے پھسل کر گال تک جیسے ثبت ہو کر رہ گئی۔ انہیں اپنی آنے والی موت کا یقین ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر بھی امید دلاتے اور کبھی مایوسی سے گردن ہٹاتے۔ لگتے۔ کھانا بازار سے آرہا تھا۔ جسے زویا کے وہ کوئی بھی نہیں کھا رہا تھا۔ گھر میں کیا ہو رہا تھا اور نہیں..... زویا کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ رے یا صحن کے ایک کونے میں پڑی رہتی اور اماں باری بابا اور سین کو ہسپتال سے آتے جاتے دیکھتی رہتی۔

ایک رات سین معمول کے مطابق ہسپتال میں اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اماں سو رہی تھی اور وہ ہسپتال کی خاموش وحشت میں خود کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اماں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سو نہیں رہی تھی۔ اسے جاگتا دیکھ کر اماں اسے پکارا تھا۔

”سین؟“ اس آواز میں اس قدر پیار تھا کہ سین کو لگا اماں نے ساری زندگی اسے اس ملائم لہجے میں نہیں پکارا ہے۔

”جی اماں.....“ وہ ایک دم سے سیدھی ہوئی۔ اماں کے پاس آئی۔ ”اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ وہ اماں کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ وہ اب بے ہوش ہے اور اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس نہیں

تھی۔ لیکن کسی کے رونے کی کھٹی کھٹی آواز باہر آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی یہ آواز کس کی ہے۔ جو باہر آ کر بھی رونے لگ گئے۔

”کیا کہہ رہی ہیں اماں؟“ بابا کے باہر نکلنے پر اس نے ان سے پوچھا۔

”اس کی..... اس کی آخری خواہش ہے کہ وہ تمہاری شادی کر دے۔“ بابا کا ضبط جواب دے گیا تھا اور وہ وہیں راہداری میں بیٹھ کر رونے لگے۔

☆☆☆

چند دن کے درخت خزاں کی لپیٹ میں تھے۔ زمر دی گھاس پیلے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ افق شب کی تاریکی میں کم ہو رہا تھا۔ کالج میں شاید چھٹیاں چل رہی تھیں۔ ہر طرف گرد اور دیرانی تھی۔ دیکھنے کے لیے، کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ صبح سے یہیں۔ بیٹھی ہوئی تھی ڈومنی چڑیوں کا ایک غول بھڑا مار کر اڑتا ہوا ڈور جا رہا تھا۔ اپنے اپنے گھونسلوں میں۔

وہ بھی تو ایک ایسا ہی موسم تھا۔

”میرا نام میراں ہے۔“ الا بچی کی خوشبو جیسی ایک آواز صبح سے اس کے کانوں میں رس بکا رہی تھی۔ اور یہ آواز ایسی تھی کہ وہ اتنے نرم میں بھی مسکرا اٹھی۔

یہ بقرعید کے دنوں کی بات تھی۔ ہر طرف عید کی تیاریاں تھیں۔ بابا کی طبیعت خراب تھی۔ مال بنا ہوا بڑا تھا۔ بابا نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے شاہ عالمی چچا کریم کے پاس لے جائے اور پیسے بھی لے آئے۔ مال کا جانا بھی ضروری تھا اور گھر میں پیسوں کا آنا بھی..... دونوں کام جلد ہونے لازمی تھے۔ اس لیے بابا کو اسے زویا کے ساتھ بھیجنا پڑا تھا۔ تانگے پر سامان لا کر وہ چچا کریم کے پاس چلی گئی۔ چچا کریم کے لڑکے تانگے پر مال دیکھ کر خود ہی مال اتار اتار کر اندر کارخانے میں منتقل کرنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں نازک ماڈل کا ایک کارٹن تھا۔ جس کے بارے میں

وہاں تک پہنچائے اور جس کو وہ تانگے میں پکڑے بیٹھی رہی تھی۔

جب اس کے ارد گرد کا مال اتر درمیان وہ مشکل سے سیٹ ہو کر بیٹھی تانگے سے نیچے اتری..... کارٹن اس تھا۔ اترتے سے اس کی شال الجھ گئی۔ بابا کارٹن پکڑے وہ شال اپنے سر پر جمانے رہی تھی جب کوئی بے دھیانی میں اس غلطی کس کی تھی کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہاں میں پکڑا ہوا کارٹن نیچے گر گیا تھا۔ جس والے کو بوکھلادیا۔

”اوہ..... میں معذرت خواہ ہوں گیا تھا کہ کارٹن کے اندر موجود کوئی ہے۔ جس کا ہلکا سا شور بلند ہوا تھا۔ سین طرف دیکھا۔ اس کا دار چینی جیسا کمرہ لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ کسی دوسرے باشندہ ہے۔

اس کے خدو خال دیکھتے ہوئے وہ کی سی کیفیت میں چلی گئی۔ اس کے چہرے کا لالہ پالی پن نمایاں تھا۔ اس کی آنکھیں چاندنی کی طرح روشنی پھیلائی ہوئی تھیں بال جدید کٹ کے تھے اور اس پر بہر تھے۔ اس کے ہونٹ سرخ تھے۔ گل مہر کی طرح دیکھتے ہوئے اور کی والے سرخ ابھی ابھی کوئی مشروب پی کر ہونٹ صاف دیا گیا ہو۔ وہ ابھی کم عمر تھا۔ لیکن اس کا کہ وہ چند ہی سالوں میں ایک بھر کر ابھرے گا۔ اس کی ذات کی تکمیل نہیں پس منظر میں ہوئی تھی۔

اس نے جیکٹ کو اپنی کلائی پر دھر اس وقت آدمی آئین کی شرٹ میں تھا۔ ایسے عالم میں جب ان لوگوں سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ خود ایک

جب وہ اپنی پینٹ کی ہپ پاکٹ سے پیسے نکال رہا تھا تو سین نے دیکھا تھا کہ آدمی استیوں میں سے جھانکتے اس کے بازو بہت مضبوط تھے اور ان پر کسرت کے ابھارتھے۔

”کتنے کے تھے یہ سب.....“ اب وہ قیمت پوچھ رہا تھا۔

”فن کی قیمت ہوتی ہے۔؟“ وہ بھی خود اعتمادی سے دو بدو بولی۔ ”یہ مشین سے نکلے ہوئے ماڈل نہیں ہیں۔ ہاتھوں سے بنے تھے اور کافی محنت سے بنے تھے۔“

”تو کیا تم انہیں بازار میں سجانے کے لیے لائی تھیں۔ کیا بیچنے کے ارادے سے نہیں لائی تھیں۔“ اس کی بات نے اسے لا جواب کیا۔ سین بلا ارادہ ہی مسکرائی تھی۔

”میری غلطی کا ازالہ بتاؤ۔“ اس نے پوچھا۔ سین کا دل چاہا کہ اسے کہہ دے کہ وہ یہاں ہی کھڑا رہے۔ جب، جب وہ یہاں سے گزرے تو وہ اسے یہاں ہی کھڑا پائے۔ یہی تھا اس کی غلطی کا ازالہ اور اس کے نقصان کا مداوا۔

”بولو.....“ وہ لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ اس اوکے۔“ اس کے انداز پر سامنے والے کا دل ”اوئے ہوئے“ کرنے کو چاہا۔

”کیا واقعی؟“ سین نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔ اس کی انگلیاں جو شال سے کھیل رہی تھیں وہ اس نے ہونٹوں میں دبائیں۔ سامنے والے کے لیے یہ کھیل بھی انجانا اور خوش گوار تھا۔

”پھر میرے ساتھ ایک کپ کافی پی لو۔ ازالے کی صورت میں۔“ سین نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ ایک دم سے اتنی بے تکلفی؟

”جوس؟“ اسے لگا شاید اسے کافی پسند نہیں۔ وہ اب اس کے سامنے اطمینان سے کھڑا تھا اور کلائی پر دھری جیکٹ کو اس نے کالر سے پکڑ کر گھما کر پیچھے

ایسے میں ایک ایسے لڑکے کو دیکھنا جو آدمی بن پہنے ہوئے تھا۔ ایک عجیب خوش گوار، کھلا سا احساس تھا۔

”مجھے لگتا ہے میں نے آپ کا کافی نقصان کر دیا۔“

”نہیں کوئی بات نہیں.....“ کیا خاک کوئی نہیں تھی۔ اس نے اس کا نقصان کر دیا تھا۔ اس جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا وہ تب بھی یہ ہی..... لیکن اب اسے کہاں اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کا دل اس کے بس سے فرار پا کر نکلے لگا تھا۔

لڑکے کو جیسے خیال آیا کہ اسے جھک کر کم از کم کو تو اٹھا لینا چاہیے۔ اس نے اس کارٹن کا کور لیا۔ تاج محل کے چھ میں سے تین ماڈل ٹوٹ تھے۔ تین ثابت تھے۔

”اوہ..... میرے خدایا.....“ لڑکا بولا..... اس نے اپنے سر کو تھام لیا تھا۔ ”یہ تو بہت قیمتی معلوم ہے۔“ اس نے اس انداز سے کہا کہ سین کا باک وہ زمین پر بیٹھ کر ٹانگیں مار مار کر رہے.....

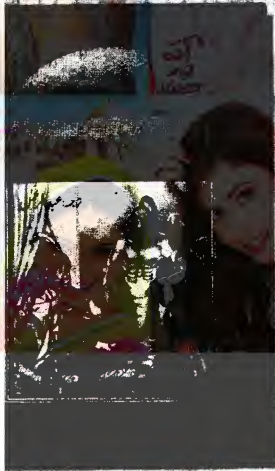
”میرے بابا اسے دوبارہ بنالیں گے۔“ ”یہ تمہارے والد نے بنایا ہے۔“ اب وہ کسی استیاق سے پوچھنے لگا۔

”جی.....“ وہ مشرقی دلہنوں کی طرح تمیز سے ”جی.....“ سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ سامنے والے نے اسے گنگ کر دیا تھا۔

”کیا تمہارے والد ایک انسانی چہرہ بنا سکتے تھے میرے بابا.....“

”میرے بابا انسانی چہرے نہیں بناتے.....“ نے ایک دم سے اس کی بات کافی۔ سامنے والے نے اسے ہی خیال کیا۔ اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے والد سے پیسے نکالنے کے لیے لگا تھا کہ اس کے نقصان کی وجہ سے اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ بدلا ہے۔ جس میں غلطی

اللہ کے واسطے سبحانہ و تعالیٰ



کی خوشبو اور گلوتن کی مہک سین تک پہنچی اور وہ،
پرے نہیں ہو پائی۔

”وہ پیچھے دکان ہے۔ میں خود بھی پینا چاہ رہا تھا
لیکن میرے ساتھ کوئی ساتھی ہی نہیں تھا اور مشروب
کو تب تک طلب نہیں کرنا چاہیے جب تک آپ کے
ساتھ کوئی ساتھی نہ ہو..... اکیلے انسان کے لیے خدا
نے دنیا میں بہت سادہ پانی رکھا ہوا ہے۔“
وہ اس کی بات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ
سکی۔

”دیکھو تمہیں بھی ضرورت ہے۔ تھکی ہوئی لگ
رہی ہو۔“

وہ صرف تھکی ہوئی تو نہیں نظر آ رہی تھی۔ وہ تو
ٹوٹی ہوئی بھی لگنے لگی تھی۔

”یا سن ایپ..... یا اورنج؟“

”مجھے بھی نہیں۔“

”تم روڈ ہو رہی ہو۔“

”میں تم سے بچ رہی ہوں۔“

”اوہ.....“ وہ بے اختیار ہنسا۔ ”لیکن کیوں؟“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر والے میرا انتظار کر
رہے ہوں گے۔“

”کیا مشرقی لوگوں کے پاس اس کے علاوہ

اور کوئی کام نہیں کہ وہ اپنے گھر سے مٹی ہوئی لڑکیوں کا

انتظار کریں۔“

”مغربی لڑکوں کے پاس اور کوئی کام نہیں کہ وہ

مشرقی لڑکیوں کے راستے روکیں۔“

”مغربی لڑکے بے چارے کیا کریں۔ مشرقی

لڑکیاں اتنی خوب صورت جو ہوتی ہیں۔“ اس نے

آنکھ دبا کر شرارت سے کہا تھا۔ شرم سے سین کے گال

سرخ ہو گئے۔ ایک دم سے وہ آگے بڑھی۔ وہ جلدی

سے چچا کریم کی دکان میں گھس جانا چاہتی تھی۔

”لڑکی اپنا نام تو بتا جاؤ..... پھر بھی ملاقات

ہوئی تو تمہیں کس نام سے پکاروں گا۔“ اس کے پیچھے

اس نے صدا لگائی۔

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنمیں

بچے ہمیری پوٹو کو بھول جاتیں گے ایسی د

جنمیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہ

کتاب بذریعہ رجسٹری منکوائس

300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل

فی کتاب۔ 1200/- روپے

ڈسکاؤنٹ۔ 300/- روپے

آج ہی۔ 950/- روپے

منی آرڈر سال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منکوائس کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 6361

دیسے میرا نام میرا ہے۔ اس سے پہلے
دیکھا۔ جیسا وہ خود تھا ویسا ہی اس کا نام بھی
..... میرا..... خدا کی رحمت.....
خدا کی رحمت کوئی انسانی روپ الٹی تو وہ یقیناً
جیسی ہی ہوتی.....

نا چاہتے ہوئے بھی اس نے دکان کے اندر
نے سے پہلے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ
کا جو مسکرا رہا تھا اس کے پلٹ کر دیکھنے پر اونچی
واز میں ہنسنے لگا۔

وہ گھر آئی اور اس نے بابا کو بتایا کہ اس سے
نا ماڈل ٹوٹ گئے ہیں۔
”میں نے تمہیں احتیاط کرنے کا کہا تھا۔“ بابا
آواز میں ڈکھ تھا۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے اپنے
سرے میں چلی گئی۔

بعض کتابوں کو پڑھنے اور بعض انسانوں کو
سننے کے لیے تنہائی اور خلوت کی ضرورت ہوتی
ہے کیونکہ ان کا کوئی بھی جز چھوڑا نہیں جاسکتا اور
مکمل جزئیات سے جاننے کے لیے یکسوئی درکار
ہوتی ہے۔ وہ اس خلوت میں ساری رات گن رہی۔
اس منظر کو بار بار اپنے ذہن میں دہرائی رہی۔ ایک
ایک جز کے ساتھ اسے یاد کرنی رہی۔ اس لڑکے کا
بیال چاہ جلال والے قلعے کی مانند تھا۔ جس کی
مضبوط تفصیلوں کے اندر وہ قید ہو چکی تھی۔ وہ اس منظر
کو کبھی بھی بھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اب بھی وہ یہی کر
رہی تھی۔ اس واقعے کے ایک ایک لمحے کو پھر سے
ہر ارباب تھی۔

میرا..... میرا..... میرا..... کھڑکی سے
ہر خشک پتے گرداب زدہ چکر کاٹ کر زمین پر گر
پڑے تھے۔ ہوا شاخوں پر مضرب بجانے لگی تھی۔ یہ
بدیہی کہ بہار دور ہے لیکن آمد ہوگی ضرور۔

”تمہاری کیا مرضی ہے سین۔“ بابا اس سے
چہرہ رہے تھے اور کل سے تیسری بار پوچھ چکے تھے۔
کھڑکی سے ہٹ کر اس نے بابا کو دیکھا۔ وہ اتنی بے
تس کب سے ہو گئی تھی۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہی تھی کہ بابا

کی طرح پورا کرنے کے لیے کتنے بے چین ہیں۔
میرا..... خدا کی رحمت..... وہ کیوں اس
رحمت سے محروم کر دی گئی۔

”تم اپنی ماں کو مزید پریشان نہ کرو..... اگر تم
اسے مرتے ہوئے خوش دیکھنا چاہتی ہو تو اس کی بات
مان لو۔“

اس کے پاس انکار کرنے کا اختیار تھا۔ پھر بھی
وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کس کے سہارے انکار
کرتی۔ ایک اجنبی کے خیال کے سہارے جو آیا اور
چلا گیا۔ اس کے پاس سوائے ہاں کے اور آپشن ہی
کیا تھا۔ وہ ماں کو خوش دیکھنا چاہتی تھی اور خود کو
بھی..... لیکن خود کی خوشی کے اسباب موجود نہیں
تھے۔

رشید اس کا تایا زاد تھا۔ جو میٹرک بھی بمشکل ہی
پاس کر سکا تھا۔ اس کے بال ہٹ کر یا لے تھے اور آگے
اور پیچھے تمام سر کے بال ایک برابر تھے۔ سر پر ہر
وقت تیل لگا کر رکھا تھا اور پان اس کی پسندیدہ غذا
تھی۔ خاندان میں جتنے بھی لڑکے رہ گئے تھے وہ ان
میں سب سے زیادہ بہتر تھا۔

”جیسے آپ اور اماں مناسب سمجھیں۔“ دل
میں کہیں چپکے سے خنجر اتارتے ہوئے اس نے اپنی
رضامندی دے دی۔ اماں کو خوش کرنے کے چکر میں
اس نے اداسی اپنے حصے میں ڈال لی تھی۔

اس کی رضامندی کے بعد بابا نے تایا ابا سے
بات کی اور جلد ہی بات پکی ہو گئی۔ جمعے والے دن
دونوں کا نکاح کر دیا گیا۔

تائی اس رشتے سے زیادہ خوش نہیں تھیں۔ سین
کو نکاح کے وقت ان کا موڈ دیکھ کر اس بات کا اندازہ
ہوا، کہ وہ اپنے شوہر اور اماں کی خراب طبیعت کی وجہ
سے اس نکاح پر آمادہ ہوئی تھیں۔ ان کے کہنے پر ہی
رخصتی کا وقت کچھ عرصے بعد طے کیا گیا تھا۔ جس پر
کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

نکاح کے بعد وہ ساری رات کھڑکی سے باہر

بیارے بچوں کے لئے

چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیاں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کہانی
آپ اپنے بچوں کو متنبہ دینا چاہیں

ہر کتاب کے ساتھ 1 ماسک

قیمت -/300 روپے

ڈاک خرچ -/50 روپے

بند یہ دھاک مٹوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی - فون: 5361

چاندنی کو چھٹکارتی رہی تھی۔

سنسان بے مہرات ہر ظلم سے بے بہرہ تھی۔
جامد ہوا میں جھنجھٹا ہٹ تھی۔ شاید وہ آنسو جو اس کے
دل میں قید تھے باہر کی تازہ ہوا میں آزاد ہو کر اسی پر
مسکرانے لگے تھے۔

”میران.....“ آواز کہیں دفن ہو گئی تھی۔

”میران.....“ اس نام کی قبر اس کے دل میں
بن چکی تھی۔ محبت کے دیوتا کا خوش الحال بت اس
کے من کے مندر میں جگ گیا تھا۔

بھولی لڑکی..... کیا آس پالی تھی اس نے.....

☆☆☆

کہتے ہیں کائنات میں کہیں بھی اندیرا نہیں
ہے۔ بلکہ وہاں روشنی کی عدم موجودگی ہے۔ جسے ہم
اندیرا سمجھتے ہیں وہ تو خالی پن ہے۔ کھوکھلا پن
ہے۔ کورا پن ہے۔ یہ تو ہم ہیں جو اپنی عقل میں اس
قدر کوتاہ ہیں۔ جو روشنی کی غیر حاضری کو اندیرا خیال
کرتے ہیں۔

شاید اسی طرح اداسی اور غمی بھی کچھ نہیں ہے۔
یہ بھی محض خوشی کی عدم موجودگی کا نام ہے۔ کیا ان
معاملات میں بھی ہم کوتاہ ہیں۔؟ یا جد سے زیادہ
جذبات پسند ہیں۔؟ کیا کسی کی موت کا غم اصل میں
اس کی سانپوں کی عدم موجودگی کا نام ہے۔؟ یا یہ
باتیں کائنات کے اندیرے تک ہی اچھی لگتی ہیں۔؟
کائنات کے اندیرے میں تو ہم کسی بھی طرح
روشنی کی عدم موجودگی کا حل نکال سکتے ہیں یا ہم اس
کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے لیکن کسی کی موت
کے غم کے حل کے لیے ہم اس کی سانپوں کو پھر سے
کیسے رواں کر سکتے ہیں۔ یہاں عدم موجودگی کا نظریہ
کارفرما ہے یا ہماری بے بسی کا؟

☆☆☆

دو پہر کی تنکی می دھوپ میں سہ پہر ہو جانے کے
باوجود کاٹ موجود تھی۔ نومبر ختم ہو جانے کے باوجود
بھی وہ جو بن کا چولا پہنے کسی مجھول کی طرح رقص کر

ن اور پھر میں نے پام سے درجوں میں سے
کی طرح نکل رہی تھی۔ آرٹ کالج کی بیرونی
دوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ہاتھ کا چھجا
کر ماتھے پر رکھا اور دھوپ سے بچنے کی لا حاصل
کوشش کی..... اس کوشش نے اس کے چہرے کے
کوش کو مزید سختی فراہم کی تھی۔ ناگواری سے دیکھتے
ہوئے وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اپنی گلی میں پہنچی تو ہر گھر
سے حسب معمول چکی جلنے کی آواز آرہی تھی۔ ”گھو
..... گھو گھو.....“ مدھم آواز اسے اتنی واضح سنائی
یہ رہی تھی کہ اس کا دماغ جھٹکنے لگا تھا۔

جس وقت وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی اسے
وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ صبح بابا اور زویا کے
بے ناشتا بناتے بناتے اسے کالج سے دیر ہو گئی
تھی۔ خود وہ ناشتا کر ہی نہیں سکی تھی۔ پھر اس کے
ساتھ اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ کالج میں ہی کچھ کھا
سکتی۔ گھر آتے ہی بیک کو اس نے سائڈ پر ڈال
دیا۔ اماں کی کوٹ پر ٹاٹ کی کھولی خالی تھی۔ چکی
کوشش تھی۔ بابا دوسرے کونے میں اپنے چوڑے کے
لوں پر اوزار سے نقش نگاری کر رہے تھے۔ وہ گھر
میں اندر داخل ہوئی تو بابا ایک لمحے کو اپنے کام سے
بگڑ گئے۔ اس سے نظریں چار ہوئیں اور وہ نظریں
ریٹھیں۔

سین کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ بھوک ختم
کرنے کے لیے روٹی ضروری تھی اور روٹی کے لیے
لازمی تھا۔ جیسا کہ اماں کہا کرتی تھی۔ اس نے
روٹی کا ٹاٹ سر کاٹا اور جھک کر اندر بیٹھ گئی۔ اماں کو
ہوئے ہفتہ گزر چکا تھا۔ چکی کے پاٹ جامد

”گھو گھو.....“ چکی کے وسط میں گندم کی مٹھ
کراس نے قطب گھما دیا۔ پاٹ گھومنے لگے۔

”گھو گھو..... گھو گھو.....“ ارض و سما میں آواز
اسرائیل کی مانند پھیلنے لگی تھی۔

☆☆☆

امریکا کا مصروف ترین شہر..... نیویارک۔

پر سوہ سید دروں کی مانند درجوں اور ہر اہا۔ اس
پر نقیص ایرانی نقش و نگاری کی گئی تھی۔ اسلامی آرٹ
کے اندر ”خط درباری“ میں آیتیں رقم تھیں۔ گنبد کے
وسط میں ہزار عددوں والا عظیم فانوس جھلک رہا تھا۔
اس ہزار عددوں والے فانوس میں لا تعداد عکس جھللا
رہے تھے۔ جھول رہے تھے۔ سرخ حُرکی ٹوپیاں
اور ان کے اوپر لگے سیاہ پھندے بھی گھوم رہے
تھے۔ سفید براق پہناوے جن میں ہوا بھر چکی تھی
فانوس کے شیشوں میں ایسے نظر آرہے تھے جیسے زمین
پر بہت سی سفید تتلیاں رقص کر رہی ہوں۔ یہ حرکت
اپنی سست تھی جیسے ساکت جھیل کے وسط میں کوئی
سوکھا ہوا پتہ گر جائے۔

یہ صوفیانہ رقص تھا، رقص درویش، بڑے ہال
کے موزیک فرش پر ہر کوئی انفرادی اور اجتماعی ہر انداز
سے چکرا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دائرے بناتے
سب بڑے دائرے میں گھوم رہے تھے۔ ”درویش
چکر“ چھت کے گنبد سے بھی زیادہ وسیع ہو چکا تھا۔
مہیب اندھیرے میں فریب نظر بکھرا ہوا تھا۔ نزدیک
ہی موسیقی بج رہی تھی۔ ساز نواز ساز بجا رہے تھے۔
موسیقار مدھم سُر بکھیر رہا تھا۔ اس کی شاعری کے
بول صوفیانہ تھے۔

”چمن ہا زان جنوں ویرانہ گردو

کہ از ہنگامہ ہا بیگانہ گردو“

صوفیانہ موسیقی ہر سوائے جلوے بکھیر رہی
تھی۔ دف بج رہا تھا۔ ستار کے تار مل رہے
تھے۔ رقص اپنے عروج پر تھا۔ یہ عروج چکا چونہ نہیں
تھا۔ ہوا میں روشنی کے ذرات تیرنے جیسا تھا۔ ہر
کوئی ایک وجد میں تھا۔ اپنے اندر کے وجد میں.....

”ازاں ہوئے کہ افگندم دریں شہر

جنوں ماند ولے فرزانه گردو“

موسیقی سے حال کھیلا جا رہا تھا۔ درویشانہ
وصف پیدا کیا جا رہا تھا۔ خود کو دنیا کے لیے تیا گیا جا رہا
تھا۔ تزکیہ نفس کیا جا رہا تھا۔ خود کی روح کو جاننے کی
کوشش کی جا رہی تھی۔ اپنے اندر جھانکا جا رہا تھا۔

اس نے زندگی میں کوئی ایک بھی برائی نہیں
پر نور چہرہ..... عجز سے جھٹی آنکھیں.....
خوف خدا..... خدا کی قرب کا متلاشی چہرہ
رضامندی تھا۔

ایڈم اپنے نام کے ساتھ ”رائل“
لگاتا ہے۔

”رائل.....“ کو تم بدھ کے بیٹے کا نا

☆☆☆

(باقی)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف بہنوں کے لیے خوبصورت ناوا

کتاب کا نام	معنفہ
شہزاد کے دواڑے	شازیہ چوہدری
نکھلا دھڑا	شازیہ چوہدری
بہر	فرحہ اشپانی
بہن دے آنسو	فرحہ اشپانی
حان ہاں ہے	فرحہ اشپانی
دل بدلیس	شرہ بخاری
ہستی کا آئینہ	شرہ بخاری
دو غلطی دیہاتی سی	آبیہ سلیم قریشی
آرزو گہرائی	آبیہ سلیم قریشی
ایمان، امید اور محبت	میرہامہ
لا حاصل	میرہامہ
اسے دقت کا قیاس	راحہ جمیلی
شام آرزو	ایم سلطانہ فر
رنگ، خوشبو، ہولہول	انصاف آفریدی
آنکھیں کا شہر	فاطمہ مختار
بونا آبی	جمہر قریشی
میرے خواب ناوا	محمد مہار



”چنان با بندگی درسا ختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی“

یہ تین روزہ اجتماع تھا۔ جس میں بہت خاص
خاص لوگوں کو شرکت کی اجازت ملی تھی۔ دن کم تھے
اور ترکی سے آئے حاجی صاحب کے دیوانے بہت
زیادہ تھے جو سب ہی ان سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کی
صدائیت میں ہونے والے ”درویش چکر“ اور
صوفی رقص“ کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان
ہی میں سے ایک ”ایڈم.....“ بھی تھا۔ اس وقت
صوفیانہ رقص میں جو اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سفید
اجنبی پہناوا جس کے لیے اس کا جسم عادی نہیں تھا
اس پر پاکیزہ چولا چڑھا چکا تھا۔ وہ پہناوا جیسے اس
کے لیے ہی بنایا تھا..... اگرچہ اس نے بھی عام سی ٹوپی
بھی نہیں پہنی تھی لیکن ترکی ٹوپی اس وقت اس کے سر
پر کسی تاج کی طرح تھی ہوئی تھی اور انسانوں کے ہجوم
میں وہ کوئی نیک و پارسا دیوتا دکھائی دیتا تھا۔ لوگوں
کے ہجوم میں خوب رو رعنا اور منفرد دیوتا۔

وہ اس قدر پرسکون نظر آ رہا تھا کہ ہال میں
موجود کوئی بھی شخص اس کی پرسکونی میں اس کا مقابلہ
نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ہر ہر عضو میں صداقت کا نور
تھا۔ رقص میں اس کی رفتار مد ہوش کن تھی۔ وہ ترکیہ نفس
کی گہرائیوں میں بری طرح گر چکا ہے اور اب جیسے
وہاں سے خود کو پاک کر دے اور اپنی اپنا چاہتا ہے۔

موسیقار شاید اسی کی وجہ سے اپنا نغمے کو اختتام
پذیر نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ جو سدھ بدھ سے بے
گمانہ تھا اسے اس حال سے جگانے کے لیے ابھی
مزید وقت درکار تھا۔ اسی باعث موسیقار ایک دو بار
اپنا نغمہ ختم کرتے کرتے رک گئے تھے اور پھر سے
آغاز کر چکے تھے۔

ایڈم کی حالت ایسی تھی جیسے وہ انسانیت کا درس
دیتا انسانیت پر فٹا ہو جانا چاہتا ہو لیکن اسے فٹا ہو
جانے کا موقع نہ فراہم کیا جا رہا ہو۔ ہر آنکھ اسے دیکھ
رہی تھی۔ اس کی نیکی، اس کی پاک روح، سب کے

گلے کسارے

پہلے سے پہلے دودھ کا دو گلاس مزید پانی ڈال کر بیڑا
غرق کیا اور اپنے کے لیے چوبے پر رکھا، ایک گہری
سانس بھرنے کے بعد پلٹ کر سامنے چھوٹے سے
لاؤنج میں لگے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ ٹک ٹک ٹک۔
سوئیاں مخصوص رفتار سے سفر کرتی سات کے ہند سے
کو چھوٹنے والی تھیں۔ ماحور نے اسٹیل کا چمچ داہنے
ہاتھ میں لیا اور بائیں میں اسٹیل کا تھال تھا، آنکھیں
سکڑ کر گھڑی کو گھورتی، مسلسل ہونٹوں کے مختلف
زاویے بناتی دیکھنے والے کو یقیناً پاگل ہی لگتی۔
اور یہ آئی سوئی سات پر اور یہ مچا گھر میں
دھال۔

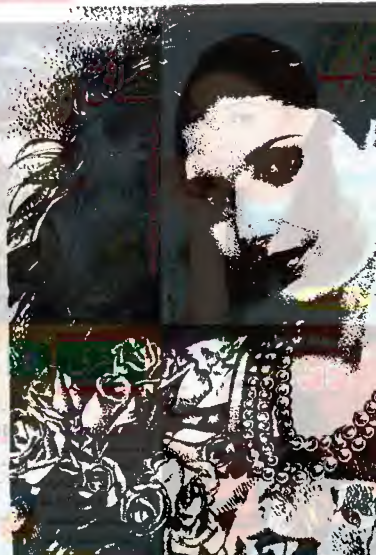
دن کا آغاز معمول کی آوازوں سے ہو چکا
۔ ماحور نے جھٹکے سے باورچی خانے کی کھڑکی
کھولی تو لوہے کی گرل کے نیچے بیٹھی چڑیاں ایک
تھ پھڑ پھڑاتی اڑ گئیں۔
”بگھتیں! یوں آکر بیٹھ جاتی ہیں جیسے دعوت
دے رکھی ہو، یہاں دال بگھارنی عذاب بنی ہوئی“

دن چڑھتے ہی ماحور کی جلی کٹی شروع ہو چکی
۔ اس نے قنات تل کھول کر سنک میں پڑے
ت کے جھوٹے ٹگ کھٹکا لے، فرج سے دودھ نکال
اس کی میلائی تنہا کر اسٹیل کے کنورے میں ڈالی،

”اٹھ جاؤ، اٹھ جاؤ بے شرمو! اٹھ جاؤ، سات
بج گئے۔ اسکول، کالج تمہارے باپ کا نہیں جو تم
لوگوں کے لیے گیٹ کھلا رہے گا۔ اٹھ جاؤ ورنہ چچے
کے بجائے اس تھال کو تم لوگوں کے سر پر بجاؤں گی۔
اٹھو۔“

تھال پر مسلسل چمچ مارتی، بے تحاشا شور پیدا
کرتی وہ ساتھ ساتھ حلق بھی مچاڑ رہی تھی۔ اس سے
چھوٹے بہن بھائی جاگ جھپکے تھے، اکلوتے داش
روم کے باہر لائن لگنی شروع ہوئی تھی۔

”سیف، ریان، جنت..... اور یہ زوہان۔
ہاں یہ زوہان کا بچہ کدھر ہے، ابھی تک نہیں اٹھاتا۔
پنے کا اب۔“



مجله فول

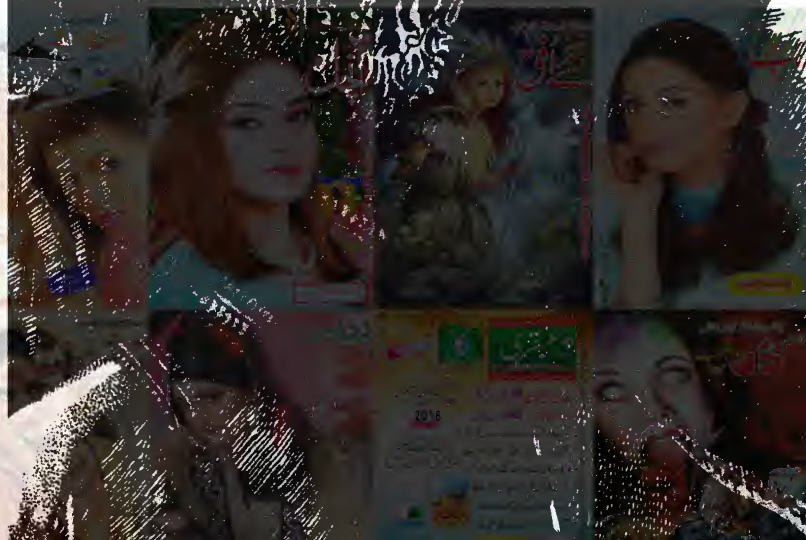
روزانه



URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

WWW.URDU.TUBE



والے پرائنگ لئی تھی جولائن میں موجود نہیں تھا۔

”ایہا۔ زوہان اپنے بچے سمیت واش روم میں گھسا ہوا ہے تب ہی ہم سب یہاں کھڑے ہیں نا، حد ہو گئی۔ بس صبح صبح ٹرک کا ہارن بن جاتی ہو، بجے جاتی ہو، بجے جاتی ہو، جہاں روکتا مندی آنکھوں والا سیف ابھی گردان جاری رکھتا لیکن اس کی کمر پر کس کر تھاں بجا تھا۔ بند آنکھیں چوٹ کھل گئیں، وہ کمر سہلانا ماحور کو غصے سے دیکھ رہا تھا اور اس کے پیچھے کھڑا ریان دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے کلا بھاڑ کر ہنسا تھا۔ جنت کے بھی دانت نکل آئے تھے جو بھی کبھی نکلتے تھے۔

”کیوں بے۔ مجھ پر ہنساؤ۔ تیری بیٹی تو ڈر ہاتھ میں دے دوں گا، سمجھا۔ جب دیکھو گدھے کی طرح ہنہاتا رہتا ہے۔ ذرا کانچ پیچ، تیری ساری ہنسی حلق کی حوالات میں قید ہو جائے گی۔ سر زمان آج اکناکس کی ایکسٹرا کلاسز لیں گے بیٹا تیری۔“ سیف کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ریان کے دانت اندر ہوئے تھے۔ سر زمان اس کی دھتی رگ تھے اور سیف کا من پسند کام اسے دباتے رہنا تھا۔

”ایہا! آج میرا ناشتا نہ بنانا، دیے بھی سر زمان سب کھایا پیا اگلا لیتے ہیں۔“ ریان کراہنے والے انداز میں بولا۔ ہاتھ بھی پیٹ پر ٹکا لیا تھا۔

”تم لوگ اپنی بکواس بند کرو اور چار منٹ میں تیار ہو کر ناشتے کے لیے آؤ۔ ورنہ واقعی بغیر ناشتے کے دفان ہونا پڑے گا اور مہینے کا آخر چل رہا ہے، میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں کی جیبیں بھی خالی ہیں۔“ وہ سینے پہ بازو باندھتے ہوئے مزالینے والے انداز میں بولی۔

”جی بہتر۔“ سیف نے سیلوٹ کیا اور سر جھٹک کر بولا۔ ”آج آپ واقعی ہمیں بغیر ناشتے کے دفان ہونے دیں، کیونکہ آدھے کلودودھ میں ڈیڑھ کلویانی ملا کے جو بھی کسی آپ اس وقت ہمیں پلا کے بھیجتی ہیں نا، اس کی وجہ سے سارا دن مجھے کچے ڈکار

”دو جوتے پڑیں نا تمہاری کمر پر، تو سارا کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ زیادہ خرے کیا کرو، شکر گرد جو یہ بھی مل جاتا ہے ورنہ مہینے آخر میں جو حالت ہو جاتی ہے، میرا تو دل کرتا ڈر اپر سے تم لوگوں کے منہ میں دودھ کے قطرہ دیا کروں۔ ہونہہ! لیکچر دیتا ہے۔“ سیف کی طبیعت اچھی طرح سے صاف کرنے کے بعد ایک زد ہانک واش روم میں گھسے زوہان کو لگائی۔

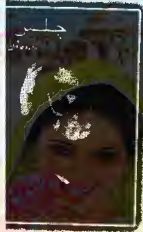
”زونی! جلدی باہر آ، اندر کون سی بلڈنگ تعمیر کر رہا ہے جو نکلنے کا نام نہیں لے رہا، جلدی کر دو! تیش اپنے بھائیوں کو بھی لگانے دے، نہیں تو تجھے رکھ کے دوپھٹر لازمی لگا دوں گی۔“ زوہار دھمکانے کی دیر بھی۔ وہ کھٹ کی آواز سے کنڈی گ باہر تھا۔ سیف فوراً واش روم میں گھسا تھا۔ ماحور سب کو جلدی کا کہہ کر بچن کی طرف مڑی، بچن پہلے چھوٹا سالاؤنچ تھا جس کے بچوں بیچ عقل باز اور دائیں پھیلا کے بے سدھ پڑے تھے۔ ماس نے سرسری نگاہ ان پر ڈالی اور ان کے اوپر پھلانگتی بچن میں پہنچ کر ٹافٹ تو لے کو چولہے پر چڑھ کر سلاکس گرم کرنے لگی۔ یہ روکھے سلاکس ان سر بہن بھائیوں نے اٹلی ہوئی ”پھی لسی“ میں ڈبو کر کھانے تھے، لاؤنچ کے ایک سرے پر چھوٹی چوکور ٹیبل اور چار پانچ کرسیاں رکھی تھیں، وہیں بیٹھ ناشتا کھانا ہوا کرتا۔ ماحور کے ٹیبل لگانے تک سر تیار ہو کر کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سب کے آدھے دودھ، سلاکس رکھنے کے بعد خود وہ ٹافٹ جنت پیچھے کھڑے ہو کر اس کی چوٹی بنانے لگی۔

”ایہا! رات بابا کتنے بجے گھر آئے تھے؟ سلاکس کا بڑا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے ریان پوچھا تھا، نظریں قریب ہی چت پڑے عقل منغل تھیں۔

”مجھے نہیں معلوم، میں دھیان نہیں رکھتی ہاں، جس دن نہیں آئیں گے اس دن دھیان

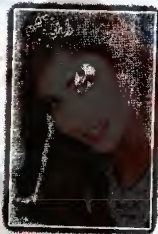
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل لریک گلشن



نادرہ خاتون

قیمت - 300 روپے



رضیہ جمیل

300

دل لریک دستِ کڑوا



فوزیہ یاسمین

قیمت - 750 روپے



نہیمہ ساجد

قیمت - 400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 16361

باندھتے ہوئے لا پرواہی سے جواب دیا۔ وہ سارے بہن بھائی چور نظروں سے بڑی بہن کو دیکھ گئے، چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف سارے میں بے سدھ عقیل مغل کے خرائے بد نما آواز پیدا کر رہے تھے۔ ماحور نے انتہائی سنجیدگی سے سیف اور ریان کے چہروں پر ایک نظر ڈالی اور آنکھوں کو بے پرواہی سے مسلتے ہوئے اپنے لیے الگ سے بنائی جائے کا بڑا سا گھونٹ بھر اور بولی۔

”سیف! آج تم فاکہہ آئی سے بات کرنا، اگر وہ ٹیوشن کی فیس جلدی ادا کر دیں تو مہربانی ہوگی۔ بجلی کا بل دو ماہ سے نہیں گیا، اس بار بھی ادا کیجی نہ ہوئی تو چھٹی سمجھ بجلی کی۔“

”کہہ کر دیکھوں گا، لیکن امید کم ہی رکھیے گا کیونکہ ان کے جتنا باتوں کا جمع جتھا میں نے کسی کے پاس نہیں دیکھا۔ ویسے کمال کی ہمدردی ہیں میری لیکن جب بھی فیس بڑھانے کی بات کروں یا ایڈوائس مانگوں تو ان کے ماتھے پر ڈیڑھ کلوی ٹلنٹیں ابھرتی ہیں۔“

ماحور کے چہرے پر تنگ سا چھا گیا، ایک لمحے کو وہ چپ سی ہوئی پھر اگلے ہی بل اس نے خود کو نارمل کرتے ہوئے ہلکے ہلکے لہجے میں کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں، تم ان سے کچھ مت کہنا۔ میں کرتی ہوں کچھ، اب بس جلدی کرو اور نکلو، دیر ہو گئی تو جنت اور زوہان کو فائن ہو جائے گا۔“ وہ سب کو جلدی جلدی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے آج واپسی پر کچھ دیر ہو سکتی ہے، سیف تم گھر کی چابی ساتھ لے جانا، کیونکہ سب سے پہلے تم دونوں ہی گھر پہنچو گے کالج سے، تو یہ نہ ہو کہ باہر ہی کھڑے رہ جاؤ، بابا سے تو ہرگز امید مت رکھنا کہ وہ دروازہ کھول دے گا۔ چلو نکلو اب جلدی۔“ وہ غلٹ میں بات مکمل کرتی فناف جنت اور زوہان کے بیگزا اٹھا کر داخلی دروازے تک لے گئی، ان کو اسکول بیگز پہنا کر ماتھے پر پیار کیا، سیف اور ریان بھی اپنی کتابیں لیے

چھوڑتے ہوئے وہ کالج جاتے تھے۔ واپسی بھی اسی ڈھنگ سے کرتے۔

ماحور ایز اے کاؤنٹر گرل جاب کرتی تھی چھوٹے سے ریستورنٹ میں۔ جاب اتنی اچھی نہیں تھی لیکن تنخواہ اتنی اچھی ضرور تھی کہ رو دھو کر گزارہ ہو رہا تھا۔ آج کل کہیں اور نوکری ڈھونڈنے کے چکروں میں تھی، اچھی بھلی اکٹامکس کی ڈگری تھی مگر جابز کا کال تھا۔ آج ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا، واپسی پر یقیناً دیر ہو جانی، اس لیے جاپانی سیف کو دے دی تھی، وہ بے چارہ واپس آ کر کھانا بھی بناتا اور ہلکی پھلکی صفائی بھی بناتا۔

دروازہ بند کر کے ماحور واپس پلٹی تو ذہن مسلسل ان کاموں میں الجھا تھا جو اسے ابھی کے ابھی بھگتاتے تھے۔ میز سے برتن اٹھاتے اس کی نظر عقل مغل پر پڑی تو ناگواری کی تیز لہر اس کا رواں رواں سرسرائی ہوئی گزر گئی۔ اونچے خراٹے، چت لینے کا عامیانہ انداز اور ہونٹوں کے کناروں سے بہتی رال۔ سر سے لے کر پاؤں تک وہ نشئی ہی لگتے تھے، برتن وہیں پٹخ کر وہ بے حد جارحانہ انداز میں عقل مغل کی طرف بڑھی تھی، اس سے پہلے کہ وہ باپ کو جھنجھوڑا لیتی، کسی ان دیسی طاقت نے اس کے دماغ میں ادب ملحوظ خاطر رکھنے کی سرکشی سی کی تھی، وہ ایک بے بس سی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

”بابا..... بابا..... انھیں یہاں سے..... اندر چل کر لیں..... انھیں.....“

کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر آواز دے کر اٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ کس سے کس نہ ہوئے۔ بڑی مشکل سے دبایا غصہ پوری شدت سے عود کر آیا، وہ کان کے قریب منہ رکھ کر زور سے چلائی۔

”بابا..... اندر بستر پر تیکے کے نیچے پڑا پڑی ہے۔ جا کر اٹھالیں ورنہ کوڑے میں ڈال دوں گی اور اگلی کے لیے میرے پاس ایک ٹکا نہیں ہے،

عقل مغل کے وجود کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ایک آنکھ کھول کر پہلے ماحور کا چہرہ دیکھا کہ کہیں مذاق تو نہیں کر رہی، پھر دونوں آنکھیں کھول کر پھرنی سے اٹھے اور جسم کھجاتے اندر کمرے بھاگے۔ ماحور نفرت سے بھرپور نظریں ان پر گاڑ چند بل تو کھڑی رہی پھر ایک زوردار ٹھنڈا قر پڑی کرسی کو دے مارا اور پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی.....

ٹپ ٹپ..... آنسو بڑی اعلانیّت سے اس کے چہ پر پھیلتے چلے گئے..... بھی بکھار ہمیں رونا کسی با، ہوتا ہے اور رو ہم کسی اور بات پر پڑتے ہیں، کوئی متعلقہ بات ہمیں متعلقہ پر رونے کا جواز فراہم دیتی ہے اور محرم بھی رہ جاتا ہے۔

چند بل وہ یوں ہی پلکیں جھکوتی رہی اور ذہن کرتی رہی عقل مغل کی چیخ و پکار کا، جو وہ ابھی شرم کرنے والے تھے جب انھیں تیکے کے نیچے کچھ ملتا۔ وہی ہوا، مغفلات کا بند ٹوٹ گیا اور وہ کسی زور ریل کی طرح عقل مغل کے منہ سے بہتی ماحور ساعتوں میں سوراخ کرتی چلی گئیں۔ وہ بھی تھے، ان کو بڑیا بھی نہ ملی اور نشہ بھی ٹوٹا اور نہ ماحور نہ اٹھانی تو کم از کم اگلے دس گھنٹے مزید ان کے ”قاف“ کی سیر کرتے گزرتے۔ وہ زندگی کو دھوپر طرح ہلکا ہلکا اڑاتے اور رگ رگ میں نشے کی دوڑاتے لیکن ستیا ناس ہو ماحور کا جس نے ان ساری دیہاڑی کا کباڑہ کر دیا تھا۔

ماحور کان لیے کاموں میں مصروف ہو چکی کیونکہ بابا نے تب تک چپ نہیں ہونا تھا جب تک گھر سے نکل نہ جانی۔ شاید اس کے بعد بھی نہ ہو ہوں پروہ کون سانسیتی تھی۔ اس کی زندگی میں چھو۔ بڑے کتنے ہی مسائل ڈائن کی طرح بال کھو۔ لپٹاپنی زبان نکالنے زندگی کی خوشیاں چوس رہے تھے۔

عقل مغل کی راگنی برداشت سے باہر ہوگذا اس نے بقیہ کاموں کو وہیں پر بریک لگایا۔ سنگ!

ابھی جھاڑو لگانی تھی۔ سیف اور ریان کے کمرے کے بستر بھی سمیٹے باقی تھے لیکن اس نے سپاٹ چہرے اور جھلملائی آنکھوں سے بکھرے بالوں پر الٹا سیدھا برش پھیر کر انہیں اوچی سی پونی کی شکل دی۔ کھوٹی سے جبکٹ کھینچ کر اتاری اور پہن کر اس کی پاکٹ میں گھر کی اسپریم جاپی اور چھالہ کے تین چھوٹے چھوٹے پکٹ ڈالے، اسکارف مفلر کی طرح لپیٹا، باؤں میں گھسے ہوئے پرانے کیونس شوز پہن کر وہ بالکل تیار تھی۔ اپنی فائل میز سے اٹھا کر ایک دفعہ سرسری نظر ڈال کر ڈاکو منٹس پورے ہونے کا یقین کیا اور کمرے کے اندر سے نکلے جھکے نظر آتے عقیل مغل پر غضب ناک نگاہیں پھیلتی زوردار آواز کے ساتھ بیرونی دروازہ مارتی گھر سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

”بس یہ آخری بار اٹھانے آیا ہوں تمہیں تالاق۔ اب دوبارہ نہیں آؤں گا۔ بتاؤ بھلا حد ہوگئی۔ بار بار الارم کو ہاتھ مار کر لحاف میں غرق ہو جاتے ہو۔ ذرا ہوش میں آؤ گے تو دادیلا کرو گے کہ ”دادا! ہو گیا نا میں لیٹ.....“ اب میری بلا سے، بھلے انٹرویو کے لیے پہنچو یا نہیں، میں تمہیں مزید اٹھانے نہیں آنے والا۔“

دادا کوئی پانچویں دفعہ مومن کو نیند سے جگانے آئے تھے۔ وہ ہر بار ”ابھی اٹھتا ہوں“ کہہ کر دوبارہ سے لحاف کی گرمی میں اتر جاتا۔ دادا کے مبر کا ہاتھ نہ لبریز ہو چکا تھا۔ ان میں اتنی بھی ہمت کہاں رہ گئی تھی اب۔ اوپر سے روزانہ اسے جگانے کا مشکل ترین مرحلہ انہیں سر کرنا ہی ہوتا تھا۔ مومن دادا کی دھمکی سنتا، کسل مندی سے لحاف پرے کھسکاتے ہوئے وہ بامشکل اٹھ کر بیٹھا اور مندی آنکھوں کے ساتھ بال سنوارتے ہوئے بولا

”دادا۔ سوچ رہا ہوں کہ نہ ہی جاؤں۔ نوکری ملتی تو ہے نہیں۔ بس جوتی کے سوراخ بڑھوا کر آ جاتا ہوں۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ایک دکان بچ کر بچھ

میلن مجھ سے نوکری نہیں ہوتی۔ اپنا کاروبار کر مجھے۔ بس.....“

”اب تیرا ٹیلر ختم ہو چکا ہو تو اٹھ جا پو نہ تو کسی گورنری اولاد نہ تیرا دادا کوئی وزیر اعلا لیے ایسے خواب اپنے لحاف میں جھاڑ کر اٹھا کر آیا کاروبار کرنے والا۔ شرافت سے تیار ہو کہ اب۔ فائل پکڑو، ناشتا کرو اور جوتیاں چنجانے! کھڑے ہو بر خوردار! آج خوار ہو گے تو کل کو سکو گے نا اور یہ دن کا آئندہ نام بھی نہ لینا۔ ان دکانوں نے آج تک بھرم رکھا ہے، ورنہ کب۔ دونوں دادا پوتا مرکبپ گئے ہوتے۔ جلدی آؤ تمہارے سلاش چڑیوں کو ڈال دوں گا۔“

دادا کمر پر ہاتھ باندھے، جھکے کندھوں باہر نکل گئے۔ پیچھے مومن بڑبڑاتا ہوا لحاف غصے پرے اچھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہنہ۔ ڈال دیں سلاش چڑیوں کو، کیا پڑتا ہے۔ سوکھے سلاش حلق سے اتارنا کوئی نہیں۔ نہ جیم نہ بٹر۔ بس ملائی لگاؤ ملائی۔ جہاں ساند ہی کھانے سے پہلے دماغ کی چولیس ہلا ہے۔ بڑا دل کردہ آزمایا تو شہد لگا دیا۔ دادا تو دکانوں کی آمدین کو ٹرسٹ میں دے دیتے ہیں ہی نہیں چلتا جاتی کہاں ہے۔“

وہ مسلسل بڑبڑاتا دارڈروب کھنگالنے لگا انٹرویو تھا اور ایک بھی ”انسانوں“ والا لباس اسر پاس نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے سارے کپڑے ڈھیر ہونے لگے اور چہرے پر غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ مایوسی سے سرکونی میں ہلا۔ مڑا اور سائیڈ ٹیبل سے سیل فون اٹھا کر کال ملائی ”ہاں شادی! یار پانچ منٹ کے اندر سوٹ لے کر ادھر پہنچ، جوٹو نے محبت بھائی کے میں پہنا تھا۔ بک بک نہ کر۔ جلدی پہنچ۔ اگر آ کی تو بھول جا کہ اب کوئی اسائنمنٹ بنا کے دے تجھے۔ سمجھا اور تائی ساتھ میں میرون والی لانا۔“

کرنے۔ ہونہہ!“

شاویز کا منہ مومن کی اتنی باتیں سنانے پر کھلا رہ گیا تھا جیسے کسی نے گدی پر رکھ کے چپڑ ہوا اور دادا چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نیلا بڑے مدبرانہ انداز میں سر دھن رے تھے۔ شاہ نگاہ پڑی تو اس کے کھلے منہ سے سلاکس کا ملخو واہیات ہمسائے کی طرح جھانک رہا تھا۔ دادا کو فت سے اسے ٹوکا۔

”اپنا منہ بند کر بیٹا۔ تیرا ادھ کھایا دیکھ کر کھایا یا ہر نکل آئے گا۔ چل شاوا۔ اب یہ چائے سڑکیاں لگا اور نکل لے۔ شام کو آ کر اپنی چارلس کی ”اترن“ لے جانا اور دادے کو سلا میرا، شہدے کو کبھی باہر نکال کر ہوا بھی لگوادیا کر لگ جانی ہے اُسے۔“

شاویز فافٹ مگ خالی کر کے یوں اُردو دوازے کی طرف لپکا جیسے دشمنوں کے مورچے گھس آیا ہو۔ ایک بات تو طے تھی کہ وہ کیا۔ دادا پوتے کے آگے کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ جوانی اور بزدلی سبھی جیسے ختم تھی ان دونوں پر۔

اندر کمرے میں مومن ٹائی کی ٹاٹ بانہ کے بعد، جیل کی خالی ڈبی میں انگلی رگڑ رگڑ کر باا نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسب معمول اس کے بالکل درمیان سے بال چوچ کی صورت کھڑے تھے، جنہیں بٹھانے کے لیے وہ تھوک سمیٹتے استعمال کر چکا تھا۔ اب جب جیل بھی ختم دیا مارے غصے کے اسے نیچے پھینکا اور نچلے ہوئے کنارہ دانتوں میں دبایا، ایک آنکھ بند کی، پھلائے اور رکھ کے پاؤں سے جیل کی ڈبی کا لیا۔ ڈبی الہڑتار کی طرح لڑھکتی دادا کے قدموں ڈھیر ہوئی۔ دادا نے باسی اخبار کے نیچے جھانکا، ڈبی اٹھائی، اسے اچھے سے جانچا اور بھرتے ہوئے تباہی پر رکھ دیا۔

”اچھی بھلی ڈبی ہے۔ پانی ڈال کر بیتی ر

گھس گیا تھا نہانے۔ جانتا تھا کہ شاویز پانچ منٹ سے بھی پہلے پہنچ جائے گا اور باہر مکن میں دادا کے ساتھ بیٹھا اس کے سلاکس چائے میں ڈبو ڈبو کے کھا چکا ہوگا اور واقعی وہ جس گھڑی سر کو تو لیے سے خشک کرتا باہر آیا، شاویز آخری سلاکس کو دہرا کیے منہ میں ڈالتا بڑے انہماک سے دادا کی داستان سن رہا تھا جو وہ ہر دفعہ صرف اسی کو سناتے تھے، جس میں دادا کے کمالات آسمان کو چھوتے تھے اور شاویز پر فرض ہوتا کہ وہ ہر دوسرے فقرے پر ”واہ“ ضرور کہے ورنہ دادا ایک ہاتھ گدی پر جماتے اور اس کے منہ سے ”آہ“ نکل جاتی۔

”لے آئے ہو پینٹ کوٹ؟“ مومن نے ہاتھ بڑھا کر مینگر چھٹا اور واپس اندر کمرے کی طرف بڑھنے لگا جب شاویز بھرے منہ سے گویا ہوا۔

”ذرا احتیاط سے پہننا۔ ابھی یہ سوٹ میں نے مزید چار پانچ موقعوں پر برتنا ہے۔ پچھلے انٹرویو میں لڑ بیٹھے تھے اور میری نئی ٹور شرٹ کے بٹن شہید کروا آئے تھے۔ بس اس دفعہ لڑنے لگو تو پہلے کپڑے اتار کر سائیڈ پر رکھ لینا۔“

”ہمم..... ٹھیک کہہ رہا ہے شاویز! لیکن تم جا نگیا پہن کر جاننا بھولنا مومن۔“

دادا نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ ایک لمحے کو شاویز بھی شپٹا گیا اور ان کے چہرے سے ان کے تاثرات کا اندازہ لگانے لگا کہ آیا طنز تھا، طیش تھا یا ہمدردی۔

”حد کرتے ہیں آپ بھی دادا!“ مومن سچ میں خفت سے لال ہوا تھا، پھر شاویز کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”اور تمہاری جان نہ نکلے اپنے اس لنڈے کے سوٹ کے لیے۔ تین جگہ تو چھید محبت بھائی کے ویسے میں ہی دیکھ لیے تھے میں نے، پھر بھی وہی ”پھٹا پرلتا“ سوٹ منگوالیا تھا۔ مت بھول کہ میرے اسائنمنٹس کی بدولت تیرا سٹریز پار لگنا ہے، جن میں کم از کم چھید نہیں ہوتا۔ سمجھا۔ بھوکے چوں..... ایک

دادا دوبارہ اخبار کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے تھے اور اندر مومن اپنے بالوں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ یہ تماشے ”فردوس محل“ میں آئے روز کا معمول تھے۔ جہاں صرف یہ دادا دوتا بستے تھے۔

☆☆☆

وہ سڑک پر تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے دھیان میں گم چلتی چلی جا رہی تھی۔ دماغ میں بہت سی سوچیں اور مسائل گھم گھما تھے۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے جس قسم کے حالات دیکھ لیے تھے اور ان پر قابو پانا سیکھ لیا تھا، اسے لگتا تھا جیسے وہ ان تمام مسائل کی ماں ہے، انہیں سنبھال کر بڑا ہوتا دیکھتی ہے اور پھر ان کے ساتھ اولاد کی سی انیسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دشواری اس سے دور ہوئی تھی، اسے کتنے دن اپنا آپ خالی لگا کرتا۔ وہ ان سے چھٹکارا بھی چاہتی اور ان کو سینے سے لگائے رکھنے کی بھی عادت۔ سی ہو چلی تھی۔

”ماحور! ماحور! رکو۔ کہاں بھاگی جا رہی ہو۔ رکا جاؤ یا ر!“

رائہ دور سے آوازیں دیتی اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔ پڑوس والی خالہ بی کی بہو تھی۔ دیوار سے دیوار ملی تھی اس لیے ماحور سے بہت گہری دوستی تھی، حالانکہ اسے پیار کے آئے ابھی آٹھ ماہ سے کچھ کم ہی ہوئے تھے لیکن بلا کی ذہین اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔ ماحور کے گھریلو حالات سے کلی واقفیت تھی۔ گاہے بگاہے غیر محسوس طریقے سے کام آتی تھی۔ خالہ بی کو اعتراض ہوتا تھا مگر رائہ سب کو ہینڈل کرنا جانتی تھی۔ اس کی بولڈنریس اور کانفیڈنریس مثبت تھا۔ وہ نہ کسی کی دل آزاری کا سبب بنتی تھی نہ کسی کو اجازت دیتی تھی کہ کوئی اسے گزند پہنچائے۔ میاں کی سرچڑھی ہونے کے باوجود اس نے کبھی اس بات کا فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ جتنی پیاری شکل تھی اسی قدر دل بھی اجلا تھا۔ ماحور کے گھر کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ کچھ چھپانا بھی چاہتی تب بھی

کچھ دیر پہلے اس نے بالونی سے ماحور کو غلت اور غصے میں گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ جھٹ پکڑا، سیاہ چشمہ لگایا اور خالہ بی سے ان کی دوا والی پرچی اور بجلی کا بل لے کر اس کے پیچھے نکل گئی۔ پھولتے سانس اور سرخ ہوئی رنگت کے ساتھ وہ ماحور تک پہنچی۔ اپنے گلاسز بالوں میں لٹکائے ماحور کے بازو پر مارا اور تیوریاں ڈالتے ہو

بولی۔ ”دکھتی بے ہودہ ہو۔ بولا بھی تھا کہ صبح وقت بھی نکلو مجھے بتا دینا۔ ساتھ ہی چلیں گے۔“ بھی مارکیٹ کے چھوٹے موٹے کام ہیں، واپس امی کی طرف سے بھی چکر لگا لوں گی۔ مگر نہ ماحور بی بی تو کھوڑے پر سوار رہتی ہیں ہر وقت۔“ وہ تیز تیز بولتی بغور ماحور کے اترے چہرے جائزہ لے رہی تھی۔ دونوں ٹہلکتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ ذرا قافلے سے ماحور کو ٹیکسی پکڑنی تھی۔ سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ ٹکان زدہ آواز بولی۔

”جانتی تو ہوں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے کی آوازیں تم لوگوں تک نہ پہنچیں۔ بابا سے لڑ کر ہوں۔ باہر دنیا سے لڑنے کے لیے۔“

”چھوڑ دو مائی۔ کیوں دل جلاتی ہو۔ کوئی بات تو نہیں ہوئی۔ اس طرح گھر کے رونے پلو۔ باندھ کر نکلو گی تو بھی بھی فوکس نہیں کر پاؤ گی۔“ رائہ نے حسب عادت ساری ٹینشن کوچہ میں مسلا تھا۔ ماحور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں سے وقتی طور پر ہی سہی بہل جاتی تھی۔ اپنی آنکھ زور سے میچ کر کھولتے ہوئے اس نے اعصاب نارمل کرنے کی سعی کی تھی۔ رائہ کی اپنی ہی کہانیاں شروع تھیں۔ اس اثناء میں وہ ایک خالی ٹیکسی قریب پہنچ چکی تھیں۔ رائہ ٹیکسی والے سے بے کرنے کے لیے چند قدم آگے ہوئی۔ پیچھے ماحور ا طرح غیر حاضر دماغی سے کڑی سامنے لگے بل بوتے

وہ دہہ.....
وہ دونوں حیران پریشان سی اس کی ص
دیکھنے لگیں۔

”جننی اچھی شکل ہے اتنا ہی سڑا ہوا۔
رائے، ماحور کے کان میں بڑبڑائی۔ لیکن اس
نے نہ بات سن لی۔ جواب میں وہ لڑاکا عور
طرح بگڑتے ہوئے بولا۔

”کیوں جی۔ کیا سڑے ہوئے اچھی شکل
نہیں ہو سکتے؟ یا اچھی شکل والوں کے لیے لاز
مہ مزاج بھی اچھا رکھیں۔ ایک تو انٹرویو سے
دیر ہو رہی تھی اور پر سے آپ کا یہ بیک کسی بلا کر
میرے پیچھے لگ گیا۔“

”حد ہو گئی۔ بے مروتی کی بھی کوئی آخر
ہوتی ہے۔ ہم نے کب آپ سے استدعا کی
اس چور کے پیچھے بھاگیں۔ نہ بھاگتے۔ کوئی
اللہ کا بندہ مل ہی جاتا اس کا رخیر کے لیے۔“ برا
کی تو رائے میں بھی کسی تھی اور پھر وہ بھی غلط بات
”اوہ میڈم! آپ کو کس کا نے غجوبی نے
کہ میں آپ کا بیک لینے اس چور کے پیچھے بھا
میرے پاس اتنا قاتلو وقت ہوتا تو میں اپنی
کروانے پر صرف کرتا۔“ اس نے بے اختیار
اپنے سر پر وہاں پھیرا جہاں پر بالوں کی چو
ہوئی تھی۔ ”جس وقت وہ غصیٹ مجھ سے ٹکرایا
ٹائی پن میں اس منحوس بیک کا اسٹریپ پھنسر
اور میں بے چارہ اس کے ساتھ کھٹکتا چلا گیا۔
اطلاعا عرض ہے کہ میں پرانے پھڑے میں بٹ
ہوں نہ ہی میری روح ایسی کوئی نیک پرویز
ہونہ! یہاں زندگی کے جھیلے ختم نہیں ہوتے
چلی ہیں دنیا سے ہمدردی کی امید لے کر۔ فول
وہ استہزاء رائے انداز میں کہتا رائے کو خواہ
لگا۔ زہر تو وہ ماحور کو بھی لگ رہا تھا، جس کا وہ
آتا تو اس ہینڈسم کے چھکے چھوٹ جاتے لیک
اس کا بیک اسی کے ہاتھ میں تھا۔ ایسے جاہل
اخلاق انسان کا کیا بھر سا جواب میں بیک تو

وہ سورے جارہی تھی نہ اچھا نہ ایک اچھا سون
غفلت کا فائدہ اٹھا کر اس کا بیک چھین کر سیدھے میں
دوڑا۔ ماحور کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔
رائے کے متوجہ ہونے تک وہ کچھ فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔
دونوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی لیکن مقابلہ کیسے
کر سکتی تھیں۔ ماحور کی آنکھوں سے آنسو چھلک
گئے۔ اس کا موبائل، والٹ، گھر کی چابیاں اور سب
سے قیمتی چیز، اس کے ڈاکومنٹس۔ سب ہی کچھ اس
کے بیک میں تھا۔ اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔
رائے اس کا ہاتھ تھامے حتی الوسع تیز دوڑنے کی کوشش
کر رہی تھی۔ آنسوؤں کی دھند میں اس نے دیکھا کہ
وہ اچکا کسی سوئٹ بولڈ ہینڈسم لڑکے سے ٹکرایا تھا اور پھر
وہ لڑکا اس چور کے پیچھے انہی قدموں پر پلٹ کے
بھاگا تھا۔

اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کسی کا بیک
چھین کر بھاگا ہے کیونکہ اپنے پیچھے وہ مسلسل
”پکڑو۔ چور..... چور.....“ کی آواز سن رہا تھا۔
اس لڑکے نے برابر بھاگتے ہوئے اچکے لوگردن سے
دبوچا اور پیچ کر نیچے گر ادیا۔ وہ خود بھی اس کے اوپر
گرا تھا۔ چور نے جب دیکھا کہ اب وہ گھیر لیا گیا ہے
تو بیک اس لڑکے کے سینے پر مارتا، اسے دھکا دیتا اٹھ
کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ ہینڈسم اب اپنے کپڑے
جھاڑتا، ماحور کا بیک تھامے واپس پلٹا تھا۔ اتنے میں
وہ دونوں بھی بری طرح ہانپتی اس تک پہنچیں۔

”اف..... بہت بہت شکریہ۔ آپ کا بہت
احسان ہے ہم پر۔ یقین کیجیے آج کے دن کی یہ آپ
کی سب سے بڑی نیکی ہوگی۔“

رائے کا اپنا ہی انداز تھا۔ وہ ہینڈسم حیرت سے
اسے دیکھے گیا۔ اس کے ساتھ کھڑی لڑکی مسلسل نیر
بہا رہی تھی۔ اس نے کوفت سے اسے دیکھتے ہوئے
کہا۔

”یہ پکڑیں اپنا بیک اور اب کے کس کر
پکڑیں۔ میرے طرح کا لوکا پشادو بارہ نہیں ملے گا
جس کے گلے مفت میں یہ مصیبت آپڑی۔

چلا جاتا۔ رائے نے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے ہوئے کچکچاتے دانتوں کے ساتھ اس سر پھرے سے عرض کی۔

”مسٹر! اب اگر آپ اپنے بیوی سے ہوئی پٹائی کا غصہ نکال چکے ہوں تو یہ بیک میری سہیلی کو واپس کر دیجیے۔“

”اواو..... اول تو میرا نام مسٹر نہیں۔ دوم میری کوئی بیوی نہیں۔ سوم مجھے کوئی مارنے والا پیدا ہوا نہیں۔ چہارم۔“

”یہ بیک تمہارا نہیں۔“ ماحور نے فوراً اس کی بات کاٹ کر جملہ مکمل کیا اور آنکھیں دکھائی ہوئی بولی۔ ”میرا بیک واپس کرو لنگے ورنہ ایسا گھما کے دوں گی کہ سر کے سارے بال نوے کے زاویے پر کھڑے ہو جائیں گے۔ سمجھے۔“

اور بالوں کا طعنہ تو جسے سوکھی گھاس کو آگ لگا گیا۔ اس لڑکے نے ایک جھٹکے سے بیک تقریباً ماحور کے منہ پر اچھالا اور لمبے سانس لیتے ہوئے دوبار اپنے پنجوں کے بل اونچا ہوا، ہاتھ پینٹ کی پاکٹس میں پھنسائے اور غرا کر ان دونوں کو باری باری دیکھتا ہوا بولا۔

”مومن۔ مومن ترا ب نام ہے میرا اور مومن اپنے دوستوں کو تو معاف کر دیتا ہے، دشمنوں کو کبھی نہیں اور میرا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو میرے بالوں پر ”ہاتھ“ ڈالے۔ سنبھالو اپنے خالی ٹین کے ڈبے جیسے بیک کو جس میں پڑے والٹ میں دس دس کے چار نوٹ بھی دفات پانے والے تھے۔ ہونہ۔ بات کرنی ہیں میرے بالوں کی۔“ بھرپور اسٹائل سے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ ان دونوں کو حیران پریشان کرتا ایڑیوں کے بل گھوما اور بے نیازی سے چلتا ہوا واپس ہولیا۔

سب سے پہلے ماحور کو ہوش آیا۔ سڑک پر پڑا چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اس کا نشانہ لیتے ہوئے پوری طاقت صرف کر کے دے مارا۔

تو نے میرا بیک دیکھنے کی۔ چور، اچکے، آٹھ کیرے۔ واپس آ.....“

پتھر اسے نہیں لگا تھا اور ماحور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے چلتی گاڑی کے آگے دھکیل دے۔ مارے خفت اور شرمندگی کے اس کی رنگت سرخ چلی تھی۔ رائے نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے ہاتھ دھر اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”بس کرو مامی! مت غصہ کرو۔ وہ جا چکا۔ چھوڑو تم دل بردانہ کرو۔ ویسے بھی تمہیں انٹرویو۔ لیے پہنچنا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ چلو جلا کرو۔“

رائے اس کی دلی کیفیت سمجھتی تھی۔ مومن ترا جاتے ہوئے اس کی عزت نفس پر ضرب لگا گیا تھا بڑی کاری تھی۔ وہ آنسو پتی رائے کے ساتھ اس روکی ہوئی ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔

”دن کا آغاز ہی اچھا نہیں، انجام سے امید۔“ اس نے یاسیت سے دل میں سوچتے ہوئے سیٹ سے فیک کر آنکھیں موند لیں جب کہ رائے تاہ سے اس کے غلامی پوٹوں کو دیکھتے سوچ رہی تھی۔

”کتنا اچھا ہو گیا جو میں مامی کے ساتھ آ ورنہ ٹیکسی کا کرایہ کہاں سے نکالتی اور انٹرویو کے جہاں جانا ہے وہاں تک پیدل جانا ناممکن تھا۔“ وہ ماحور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ٹیکسی باہر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

یہ ایک بڑی فرم کی بے حد اونچی بلڈنگ تھی جس کی بلندی اس قدر متاثر کن تھی کہ اندر جا۔ ہوئے ہتھیلیاں سمجھتی تھیں۔ بلڈنگ کے گہرے شیشے دھوپ کی روشنی میں مزید گہرے گہرے اُ رہے تھے۔ رائے نے ماحور کو ڈراپ کیا۔ گرم چ سے اسے نیک تھمناؤں سے نواز کر وہ ٹیکسی لے اوجھل ہو گئی۔ چند لمحے ماحور نے وہیں کھڑ کھڑے گردن اونچی کیے فرم کی بلڈنگ کا جائزہ ل

اسوں میں رسد اور سرت ایک سا تھا۔ اور سے لینے لگی۔ اپنے بیک سے ڈاکو منٹس کی فائل نکال کر ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے ایک لمحے کو اپنا اعتماد دکھوتا محسوس ہوا۔ اس وقت اسے شدت سے اپنے کپڑوں کی رفلک کا احساس ہو رہا تھا۔ بابا سے لڑنے کے بعد اکثر ایسے ہی وہ سدھ بدھ کھوجاتی تھی۔ آج بھی جیسے حلیے میں تھی، مارے غصے کے نکل آئی اور اب پچھتا رہی تھی۔ زندگی جن جن کے مشکلیں ڈھونڈ کے لاتی تھی اور انہیں ماحور مثل کی راہوں میں بچھاتی۔ پائیت ہمیشہ سے اس کی سٹی ساسھی رہی تھی۔ ایک تھکن زدہ سانس خارج کرنے کے بعد اس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”ایکسکیوز می! انٹرویو کہاں ہو رہے ہیں؟ دراصل میں اسی لیے آئی ہوں۔ یہ..... یہ میری فائل.....“

وہ ارد گرد کے ماحول سے مرعوب ہو چکی تھی اسی لیے تھوڑی بوکھلا رہی تھی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر کھڑی طرح دار اور ویل ڈریسڈ لڑکی سے پوچھتے ہوئے ماحور ہونفوں کی طرح فائل اسی کو دکھانے لگی۔

”تھرڈ فلور، رائٹ سائڈ، فرسٹ روم۔“
”تھینکس۔“

نپاتلا سا جواب اس ریسپشنسٹ کی طرف سے آیا جس نے ایک نگاہ غلط بھی ماحور پر ڈالی گوارا نہیں کی تھی۔ پروفیشنل انداز میں کہتی وہ مستقل لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف متوجہ تھی۔ شاید وہ انٹرویو کے لیے آنے والے بہت سے امیدواروں کو یہی جواب دے دے کر عاجز آئی بیٹھی تھی۔

”پھاڑی بکری۔ اکثر دیکھو ذرا۔ سیدھے منہ بات کرنے کی نیز نہیں۔ بھلا اور بیٹھی کس لیے ہوئی ہو یہاں۔ ہونہ۔“

جی جی میں اسے کوئی اور گھورتی ماحور بیک کندھے پر درست کرنی بیڑھیوں کی جانب بڑھی۔
”ہم..... لفٹ سے چلنا چاہیے۔ آگے ہی کس

سردیور ہو رہی ہے اور اس پیرسیاں پہ۔ حالت مزید خراب ہو جائے گی۔“ نچلا ہونہ والے دانتوں میں دبائے اس نے بیڑھیوں نظروں سے جائزہ لیا اور لفٹ کی طرف بڑھائے۔ ابھی وہ لفٹ کے اندر داخل ہو کر دروازے میں کسی نے اپنا پاؤں پھنسا کر ا ہونے سے روکا اور تیزی سے اندر آیا۔ لفٹ پڑی تو دونوں کی نظر ایک دوسرے پر پڑی۔
”تم.....“ دونوں کے منہ سے بیک نکلا۔

”تم اور یہاں؟“ ماحور نے نخوت سے کیا۔

”کیوں جی۔ آپ کے دادا یہاں کے ہیں جو میں اور یہاں نہیں ہو سکتا۔“ جواب میں مرچیں چباتا ہوا بولا۔

”تم تو مجھے کسی کالی بلی کی بھکتی روح۔“ صبح سے دوسری دفعہ راستہ کاٹ رہے ہو۔۔۔ برباد ہوتا نظر آ رہا ہے مجھے تمہاری وجہ سے سے وہ سامنے دیکھتی بولے جارہی تھی۔ چہرہ پھر تہمتانے لگا۔

”میں کالی بلی کی روح ہوں۔ اچھا واقف تو لگتا تھا میں انسانی مخلوق ہوں۔ مجھے نیند ہے۔ میں کھانا پیتا بھی ہوں۔ سو بھی جاتا لوگوں کے بیگز بھی چوروں سے چھڑاتا ہوں بہترین انٹرویو دینے کے بعد جاب بھی ہتھیا۔ کامیاب ہو جاتا ہوں۔ واللہ.....“

وہ اتنی معصومیت سے بول رہا تھا کہ سمجھنا دشوار ہوا کہ آیا مذاق کر رہا ہے یا سنجیدہ۔
”تمہیں یہ خوش فہمی کیونکر ہے کہ یہ جا۔ کوئی ملے گی؟“ وہ مشکوک نظروں سے اسے ہونے بولی۔
”کہیں سفارشیں تو نہیں ہوتی؟“

”ہا ہا ہا..... کیٹس سی۔“ وہ اعلادد لا پرواہی سے کندھے اچکا کر بولتا اسے زہرا سے پہلے کہ ماحور اسے کوئی جواب دیتی لفٹ

وہ بد میز آدمی اگلے ہی پہلے باہر نکل کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ بھی مرے مرے قدموں سے باہر آگئی۔ اس کا دل پریشان سا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگنے لگا جیسے میکیشن ہو چکا ہے۔ یہ سب محض خاندہ ہی ہے جو ہونے جارہی ہے۔ اس نے مجھے دل سے ایک بار پھر اپنی فائل کو چیک کیا اور انٹرویو روم کی جانب بڑھ گئی۔ اندر اتنے امیدوار جمع تھے جتنے لنگر بننے پر فقیر ہوتے ہیں۔ سب کو ایک نظر دیکھتی وہ ایک کونے پر بڑی خالی جھیر پر بیٹھ گئی۔ ان تمام امیدواروں نے بھی اسے دیکھ کر کچھ اچھے تاثرات چہرے پر نہیں سجائے تھے، انٹرویو کے لیے ایک اور نمونہ دیکھ کر سب کی شکلیں ایسی ہو گئی تھیں جیسے پھٹی دودو دار ڈھیں نکلوا کے آئے ہوں۔ سوائے اس کمینے کے جو اس کے بالکل سامنے والی سیٹ پر اکڑ کر بیٹھا ایک بازو ساتھ والی سیٹ کی بیک پر پھیلائے اسے کسی پان شاپ پر کھڑے لوہر کی طرح دیکھ رہا تھا۔ ماحور کا جی چاہا کہ اپنا جوتا تارے اور گھما کے ایسا مارے کہ چوٹ تو منہ پر پڑے لیکن سر کے تمام بال خود درجھاڑیوں کی طرح پکھر جائیں۔

مومن تراب بھی سامنے بیٹھا دماغ کی ٹیپ میں ملتے جلتے خیالات کی کیسٹ چلائے بیٹھا تھا۔

”سوچ مومن بیٹا سوچ۔ یہ مرینہ خان کا لیٹ ڈرٹن شکل سے کافی باصلاحیت لگتا ہے۔ اگر یہ انٹرویو کے لیے اندر چلی گئی تو سمجھ اس کی جاب پکی۔ ورنہ باقی سب کی تو شکلوں پر گاؤ دی لکھا ہے۔ ان کی طرف سے فکر نہیں۔ جو ایک آدھ ”تڑ“ میں دکھائی بھی دے رہے ہیں، ان کو میں آرام سے لالی پاپ دے دوں گا۔ مگر اس کا کچھ سوچ بیٹا۔ کوئی سائنس لڑا مومن۔“

”کیسے گھور گھور کے دیکھ رہا ہے خبیث۔ شکل سے ہی چول لگتا ہے۔ لسی کا گلاس مانتے والوں جیسا منہ ہے اس کا۔ بس ایک دفعہ انٹرویو کے لیے کال کر لیں، پھر تو یہ جاب پکی اپنی۔ میرا سی دی دھاک بٹھانے کے لیے کافی ہے۔“ ماحور کن انکھیوں سے

مومن کے جوتے کا سول دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا اور جوتے کے نیچے چمکی ہوئی تھی۔

”کاش میں یہ چوٹم اس کے ہونٹوں پر سکتی۔“

ایک دفعہ پھر تخریبی سوچ اس کے دماغ سرسرائی۔

”بیٹا بھلا۔ اچھی بھلی شکل کی ہو۔ مڑ چلو..... کافی اچھی بھلی ہو۔ تو آرام سے کسی نیک بندے سے شادی کر کے گھر بساؤ۔ یہاں کیوں ہو ہمارا حق مارنے۔ نوکری کرنی ہی ہے تو کسی میں استانی لگ جاؤ، اور جھیز بٹاؤ۔ پر نہ جی، ا مردانہ جیکٹ کی طرح نوکری بھی مردانہ ہی چاہیے مومن نے دل میں اسے بہترین مشوروں نوازتے ہوئے ایک اچھی نگاہ اس کی بلیک لیا جیکٹ پر ڈالی۔

دونوں کے خفیہ مراسلاتی پیغامات نہ ج کب تک جاری رہتے کہ اچانک چپڑا سی نے دروازہ کھول کر سراندر گھسید اور تنہی لہجے میں ہوا۔

”سر سالک کی گاڑی پارکنگ میں پہنچ رہی ہے۔ آپ سب لوگ سیدھے ہو کر بیٹھ جائیں کسی بھی وقت اور پہنچنے والے ہیں۔“

سب میں گھٹلی سی مچ گئی۔ لڑکیاں اپنے سے دستی آئینے نکال کر شکلیں دیکھنے لگیں۔ ایک نے لب اسٹک کے شیڈز کو ذرا گہرا کیا۔ لڑکوں نے اپنے بانوں میں ہاتھ پھیر کر ان کو سیٹ کیا۔ سر روم سے گزر کے اپنے آفس میں جانا تھا جہاں وہ تمام امیدواروں کے انٹرویوز لیتے۔

ایسے میں دو نفوس تھے جن کے وجود میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔ محض دماغ تیزی سے کا رہے تھے۔

”کاش کچھ ایسا ہو کہ میری باری جلد آ جا۔ ورنہ ان چوبیس امیدواروں کے ہوتے کہیں ایسا

سے تو رہی۔

اسی کمرے کے ایک طرف کارز میں چڑھ کر دھڑکیاں مار رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اس کارز میں اپنے پیچھے اسے مسلسل مومن تراب کے کلمات سنائی دیتے رہے، لیکن اس کا غصہ کم نہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس واہیات آدمی نے جان بوجھ کر کیا ہے۔

چند منٹ گئے اسے فریش ہونے میں۔ وقت وہ باہر نکلی، گیم ایک بار پھر پلٹ چکی تھی۔ مومن تراب کو اس نے ہاتھوں میں ڈھکے کاغذات کا پلندہ اٹھائے آفس کے اندر جاتے اور اس سے آگے ایک بہترین قد کا ٹھکے کے سوا مرد کی پشت دکھائی دی تھی اسے۔ وہ اچنبھے سے کھڑی رہ گئی۔ وہ کمینہ اندر کیسے چلا گیا، یہ سوا کے دل میں لمحے کے ہزاروں حصے میں ہی پیدا تھا مگر خاموشی سے مردہ قدموں سے چلتی اپنی آہٹیں۔ سب ہی امیدوار آپس میں کھسک پھسک رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی دو سبھی لڑکیاں بھی جلتے کٹے انداز میں ”مومن تراب“ روٹا روڑی تھیں۔

”اف..... کتنا خراش ہے یہ لڑکا چالاکی اور مہارت سے اندر گیا ہے۔ میں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا، مہر سالک کے پی۔ آگے اس نے اپنی ٹانگ کی تھی۔ وہ بے چارہ۔ مل گرا اور ہاتھ میں تھامے سب کے سب جھوٹ کر بکھر گئے۔ اوپر سے غریب کی اتنے شیشوں والی عینک بھی گری، شیشہ الگ ٹوٹا۔ اندھوں کی طرح واپس نیچے اپنی گاڑی میں اسپیئر گلاسز لینے گیا ہے اور یہ جالاک لڑکا اپنی بیٹی دکھاتا سب پیپرز اکٹھے کرنا سراسر لالچہ دغا کے طور پر آفس میں جا گھسا۔ اب دیکھ! کانبرہم سب سے بعد میں تھا اور انٹرویو ہوگا سے پہلے۔“

”مجھے تو لگتا ہے سلیکشن ہو چکی ہے۔ ۱۱

کہ سب لی باری ہی نہ آسکے اور صاحب بہادر لوسکی ارجنٹ میٹنگ کے لیے کال آجائے۔“ ماحور کے اپنے ہی خدشے تھے۔

”جلدی کر۔ جلدی کر مومن! صرف یہ لڑکی پنگ جائے۔ باقی سب کی وکٹ میں اڑالوں گا۔“ مومن تراب دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر انگلیاں ایک دوسرے میں پوسٹ کیے، شہادت کی انگلیاں پستول کی نال کی طرح کھڑی کیے، ان پر اپنی پیشانی ٹکائے منہ سے مسلسل ”ڈھڑ۔ ڈھڑ۔“ کی آواز نکال رہا تھا۔ بھیجے کو ڈیوٹی پر لگا رکھا تھا کہ وہ جلدی سے کوئی آئیڈیا سوچے اور پھر ایک دم۔ بالکل ایسے جیسے چپکے سے دیرانے میں بہار آئے یا بڈھے کے منہ پر نکھار آئے یا پھر گنجے کے سر پر بال آئے۔ مومن تراب کے دماغ کی بتی چلی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔ وہ سیدھا ہوا۔ کوٹ کی فرنٹ باکٹ سے ایک پین نکالا اور کھڑے ہو کر ارد گرد سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”اینی ون ہیز انک پلیز۔ اینی ون۔ کسی کے پاس انک ہوگی؟“

سب نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے انکور کیا۔ بھلا یہاں کون سی ایسی کی دوات لے کر گھوم رہا ہوتا۔ مومن تراب کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ وہ چلتا ہوا چند قدم آگے ہوا اور پین کا کیپ ہٹا کر اسے زور سے جھٹکا۔ کالی سیاہی کے کئی چھینٹے ماحور کے اوپر گرے۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔ نہایت ہی غضب ناک ہو کر اس نے مومن کو دیکھا جو پریشانی سے بھرپور تاثرات لیے اس سے معذرت کر رہا تھا۔ ماحور اسے کچا چبا جاتی تھیں ابھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوتا۔ گھٹیا، کمینہ خبیث۔ جتنی گالیاں وہ اسے دے سکتی تھی، دل میں دے ڈالیں۔ قریب ہی کسی لڑکی نے اسے فوراً واش روم جانے کا مشورہ دیا کیونکہ اس کے چہرے پر بھی چند چھینٹے بہا کر دکھا رہے تھے۔ اسے بھی یہی بہتر لگا کہ سر کے آنے سے پہلے ہو آئے۔ اب اس حالت میں وہ اندر آفس میں جانے

پاس یقیناً سفارش ہے جیسی تو اتنا اور کافینڈنٹ ہے۔ خواہ خواہ میں اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔ میں نے تو کل اسپیشلی جا کر فیشل لیا۔ مینی کیور اور پیڈی کیور بھی کروا ڈالا۔ ہونہ، سب بے کار گیا۔“ دوسری لڑکی نے بھی دل جلی ہونے کا ثبوت دیا۔ ماحور نے کن اکھیوں سے اس کے پیروں کی طرف دیکھا جہاں ہر ناخن پر الگ الگ رنگ کی نیل پالش لگی زہر لگ رہی تھی۔

”ہتا نہیں لڑکیاں اپنی شخصیت کے حساب سے فیشن کیوں نہیں کرتیں۔ جو چیز انہیں ذرا نہ چھتی ہو وہی کرنا پسند کرتی ہیں۔“ یہ سراسر ماحور کی ذاتی رائے تھی۔ لیکن چاہتی تھی کہ سب لڑکیوں تک پہنچے۔ اس لڑکی کے پیروں سے دھیان ہٹا تو فوراً اندر گھسے مومن تراب کی طرف چلا گیا۔

”کیا واقعی یہ سفارش کے تحت آیا ہے؟ پھر تو سراسر دھاندلی ہے باقی سب کے ساتھ۔ میں اس بد میز انسان سے زیادہ قابل ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ پی اے کے کرنے کا ڈرامہ بھی جان بوجھ کر چایا گیا ہے تاکہ اسی بہانے مومن تراب اندر جاسکے اور کچھ دیر بعد باہر آ کر اعلان کر دیا جائے کہ سلیکشن ہو چکا، آپ لوگ پلیز جاسکتے ہیں۔ لو بھلا بتاؤ۔ ہم یہاں خنے بیچنے بیٹھے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ہر گز نہیں۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہر شے ہنس نہیں کر دے۔ کتنا وقت برباد ہوا ج سے اور یہاں آ کر ہتا چل رہا ہے کہ میرٹ پر نہیں سفارش پر نوکری دی جا رہی ہے۔ وہ جھکے سے کھڑی ہوئی۔ ایک طائرانہ نگاہ سب امیدواروں کے اکتائے ہوئے چہروں پر ڈالی اور تن قن کرنی اندر کی جانب بڑھی۔ باہر کھڑے چڑیا نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی قابل کے ساتھ اسے پرے دھکیل دیا۔ آفس کا دروازہ کھلنے پر جو پہلی نسوانی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ بڑے خوش گوار انداز میں مومن تراب کو سراہ رہی تھی۔

”ہم..... امپر یو۔ آئی ونڈر کہ آپ جیسا قابل نوجوان اے۔ کیو بلڈرز کے پاس اپنے قیمتی

آٹھ ماہ کیوں برباد کر کے آیا ہے۔ مجھے نہیں لگا وہاں آپ کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہوا ہوگا۔“ انفیکٹ۔ میں نے اسی لیے وہ جاب چھوٹی تھی کہ.....

”تاکہ یہاں آ کر کسی مستحق اور اہل کینڈیڈیٹ کا حق مار سکوں، اپنی سفارش کے بولتے پر۔ رائٹ؟“

ماحور نے مومن تراب کی بات پوری ہونے دی تھی اور اندر داخل ہو کر فوراً اس کی اص کھول دی تھی۔ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی اور وہ اپنی بھڑاس نکالنے آئی تھی۔ بڑے سے گلاس ٹیبل کی مخالف سمت بیٹھے اس کمپنی کے مالک پاشا نے بھرپور دلچسپی سے اس کی بارے صرف سنی بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی رینگ مومن تراب کے بالکل ساتھ والی چیز پر بیٹھی اسٹائلس اور خوب صورت لڑکی لیپ ٹاپ کھو بیٹھی تھی، اس نے ناگواری سے اسے دیکھا اور آفس سے نکالنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھی کہ مالک پاشا نے اسے ہاتھ کے اشارے روک دیا اور نرمی کے ساتھ ماحور سے مخاطب ہوا۔

”دیکھیں مس۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ پلیز بیٹھیے اور اپنی باری کا انتظار کیجیے۔ سفارش نہیں، میرٹ چلتا ہے اور رہ گئی بات مومن کی تو یقین کیجیے کہ یہ شخص اتفاق ہے کہ میرے جاننے والے نکل آئے ہیں۔ ان کے بابا اور میرے قادر نمبرز اور اچھے فرینڈز رہے ہیں۔“

”اچھا..... جی۔“ ماحور نے اچھا کو خوب کر اگلا۔ ”اچھا بہانہ ہے۔ پھر تو ہو سکتا ہے کہ امی اور آپ کی امی بھی دو پٹا بدل سہیلیاں رہ ہوں تو کیا میں اپنی جاب اپنی سمجھوں۔ ہو بولے؟“

ان سب کی بولتی بند کروا کے وہ کہہ رہی تھی مالک پاشا واقعی لاجواب سا اس کا چہرہ دیکھنے

اور مومن کا بس چلا تو اس لڑکی کو مٹی بنا کے دیوار پر چپکا دیتا۔ کس قدر شاطر تھی، نہ جانے کیسے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس جاب کے لیے سالک پاشا واقعی اسے رکھ لے گا، پرانے حوالے کام آگئے تھے۔ کچھ ایسے ہی جلے کئے تاثرات اس لڑکی کے چہرے پر بھی تھے جو مومن تراب کے ساتھ والی چیز پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اسے کیہ تو زنگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”اس معاشرے کا یہی تو المیہ ہے سر کہ یہاں چور بازاری عروج پر ہے۔ کوئی اونچی کرسی پر بیٹھ کر بے ایمانی کر رہا ہے تو کوئی اس کرسی تک پہنچنے کے لیے اوروں کی ٹانگیں کھینچتا ہے۔ گدھے کے سر پر تاج پہنانے سے اگر آپ کی کہنی کو ”چار گدھے“ لگ جاتے ہیں تو میں دعا کروں گی کہ اللہ آپ کی کہنی کو ایسے لوگوں سے بھر دے۔ چلتی ہوں۔ یہ وائے گدھے۔“

اپنی بات کے اختتام پر اس نے طنز سے بھرپور نظریں مومن پر گاڑے رکھیں۔ جسے اس وقت مجبوری شرافت کے جامے میں رکھے ہوئے تھی، وگرنہ وہ بدولتائی میں تو اس کا ٹائی نہیں تھا۔ سالک پاشا نے ریو الونگ چیز پر ہولے ہولے کھومتے، بند ٹٹھی ہونٹوں پر جمائے بمشکل ہنسی کا گلا کھوٹا۔ اتنا تو وہ جان ہی گیا تھا کہ اس لڑکی نے ”گدھا“ کسے کہا ہے۔

اپنی بھڑاس نکال لینے کے بعد ماحور نے دو دفعہ زور زور سے اپنا پاؤں دوڑن فلور پر مارا، گردن اکڑاتے ہوئے مڑی اور آفس سے باہر چلی گئی۔

باہر بیٹھے سب ہی امیدواروں کو اس نے مومن تراب کی سیکلکشن کے بارے میں بتا کر ہلچل مچادی۔ وہ سب کہنے بھکنے لگے، زیادہ تر نے مایوس ہو کر ماحور کے ساتھ ہی لفٹ کا رخ کیا۔ اب بھلا مزید بیٹھنے کا کیا فائدہ تھا۔

بلڈنگ سے باہر آ کر ماحور نے ایک نظر سر اٹھا کر اس شاندار عمارت کو دیکھا۔ دل میں مایوسی اترتی چلی گئی۔ دو ماہ سے واجب الادا بجلی کے بل اور اسکول

کا لجز کی پینڈنگ فیسیں۔ سب ہی کچھ ذہن گردش کرنے لگا۔ جاب مل جانی تو کم از کم وہ تنخواہ آس میں کسی سے قرض تولے ہی سکتی تھی نا۔ اسے اپنی عزت نفس کی قربانی دیتے ہوئے فائوڈ ریٹورنٹ کے مالک سے ہی منیش کرنی تھیں ایک نمبر کا خزانہ آدی تھا۔ اس نے بیک میں گھسا کر اپنے والٹ کے اندر موجود چالیس روپے دیکھا اور بھرائی آنکھوں سے پیدل ہی ریٹورنٹ رخ کیا۔ آج کا دن واقعی مشکل ترین ثابت ہوا

☆☆☆

سارے دن کی مشقت۔ کسٹمرز کی مارا مارا ہونے والے واقعات نے اس کے اعصاب کو رکھ دیا تھا۔ وہ اس قدر تھک چکی تھی کہ اس اتنی ہمت نہیں تھی کہ جا کر یونیفارم تبدیل کرے۔ واپسی کا قصد کرے۔ ابھی تو اس نے سامی دورا سے واپسی کے کرائے کے لیے ادھار پیسے! ورنہ اس میں پیدل گھر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ کا آف ہو چکا تھا اور اب اسے ریٹورنٹ کے سے کچھ قرض بھی طلب کرنا تھا جو کہ خود ایک مشکل امر تھا۔ ایک تو مختار انصاری کھڑوس، دوسرا ایلان کا نظر باز انسان تھا۔ اس کی مجبوری جاب وگرنہ اسے اس کی منخوس نظریں گوار نہیں۔ وہ جلدی سے کپڑے تبدیل کرے۔

انصاری کے آفس کی جانب بڑھی۔ ٹاک کر۔ پہلے اس نے باہر کھڑے کھڑے جملے ترتیب اور اسی بے دھیانی میں لفظوں کی بنت کرتے ہاتھ دروازے کی ٹاب پر پڑا اور وہ کھٹکا چلا گیا گر لڑا شاف کی سپر وائر نو شاہ، مختار انصاری تقریباً اوپر گری شاید اس کے کوٹ کا بٹن ٹانگ تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی رنگت کے ساتھ ایک سائیڈ پر کھڑی ہوئی بوکھلاہٹ میں بار بار اپنے بال ٹھیک کر رہی ماحور کی نظر سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ اس کی مختار انصاری کا رویہ بے جھجک تھا، یوں چا

شرمندگی نہ ہو۔ یا یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کتنی بار اور کن کن کے ساتھ اس حال میں کس کس کو دکھائی دیا ہو۔

ماحور پورے اعتماد سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بس اس کے ہاتھ کی پکڑ اپنے بیک کے اسٹریپ پر لاشعوری طور پر پخت ہو گئی تھی۔
”آئیے ماحور بی بی! بولیے۔ کوئی کام ہے کیا؟“

مختار انصاری نے چہرے پر کینٹی سی مسکراہٹ سجا کر اس سے پوچھا۔ نظریں ماحور کے سر پے کو گھیرے میں لے چلی تھیں۔ وہ دل میں دو گالیاں دیتی ٹیبل کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ نوشابہ اس دوران خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔

”مجھے کچھ ایڈوائس رُم کی ضرورت ہے۔ تنخواہ میں سے کٹوائی جاؤں گی۔“

”ہم.....“ مختار انصاری نے سوچ میں پڑنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے یوں ہنکارا بھرا جیسے اس نے نوشابہ سے ان کے تعلقات کی نوعیت پوچھ لی ہو۔

”بڑا آیا فلاسفر۔ گینڈے کا میرا بھائی۔ ایسے پوز کر رہا ہے جیسے یہاں درس دے رہا تھا۔“ وہ حسب عادت دل میں حسب پسند بولی۔ مختار انصاری نے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے آنکھوں کو مسلا اور بولا۔

”ایسا ہے ماحور کہ کام تمہیں بھی پتا ہے کچھ مندا جا رہا ہے۔ ایسے میں ادھار، ایڈوائس وغیرہ جیسے سلسلے میرے لیے چلانے بہت مشکل ہیں۔ ہاں۔ ایک صورت ہے کہ میں تمہیں پیسے دیتا ہوں اور تم کچھ اور ٹائم لگاؤ، کچھ میرے آفس کی دیکھ بھال کر دیا کرنا۔ میرے کمپیوٹر پر بیٹھ کر ڈاؤنٹاپ ڈیٹ کر دیا کرنا۔ اسی میں تمہارے پیسے پورے ہو جائیں گے۔ بولو۔ کیا کہتی ہو؟“

وہ اپنی بٹن جیسی گول گول آنکھیں گھماتے اس

سے اس کی بجائے داسے اندر میں چو پھر ماحور نے صرف چند سیکنڈز لیے تھے سوچنے کا پھر اس کا جواب ہاں میں تھا۔ گھر کی حالت اس سامنے تھی۔ کھائے بغیر گزارہ تھا لیکن بجلی بچہ نہیں تھا۔ بل جمع کروانا ہر حال میں ضروری تھا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے جن وقت وہ ٹائم لگا کر گھر پہنچی، اس میں آگنی سکے نہیں کھانے کی۔ میز پر پڑے جوئے برتن اٹھا کر میں ہی رکھ ڈالے۔ کھانا یقیناً سیف نے بنا اس کی غیر موجودگی میں وہ ہر کام کر لیتا تھا۔ برتن دھونے کا۔ لہذا ماحور جتنی بھی تھکی ہوئی، لازماً سارا کچن سمیٹ کر سوتی تھی۔ مگر آج تو سارا جسم دہائیاں دے رہا تھا۔ سر دنگ کا ڈکھڑے کھڑے ٹانگیں اگر ٹسل ہوئی تھیں تو کچھ بیٹھے بیٹھے کمر جواب دے گئی تھی۔

”پتا نہیں اس کی مشقت کے دن کب ختم گے۔ پتا نہیں کب اس گھر کے حالات ٹھیک گئے۔ ہوں گے بھی یا نہیں۔ اگر آج وہ نوکری ا۔ جاتی تو بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔“ بستر پر کمر بھی اسے اس نوکری کے ہاتھ سے جانے کا کھائے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی مومن ترا کینٹی پٹی والا چہرہ بھی تصور میں ابھرا تو بے اس نے دانت کچکچائے اور پھر مومن تراب چباتے چباتے جانے کب وہ نیند کی آغوش میں گئی۔ اگلا سویرا اپنے دامن میں ابھی مزید غ لیے اس کا منظر تھا۔

☆☆☆

اسے جاب مل گئی تھی اور یہ کوئی معمولی نہیں تھی کیونکہ اسے سو فیصد اور دادا کو دو سو فیصد تھا کہ وہ کوئی کام ڈھنگ کا نہیں کر سکتا، جاب پھر بڑا اکمال ہے۔ اسے دو دن بعد جوائن کرنا تو یہ دو دن وہ مکمل فیش کرنا چاہتا تھا۔

اس کا انٹرویو بہترین رہا تھا کیونکہ ایک پوری چالاکی اور مہارت سے سب سے پہلے آ

کے اندر جا کر دھال بھالے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ سالک پاشا کے قادر اور اس کے بابا کسی زمانے میں دوست رہ چکے تھے مگر یہ خاصی برائی بات تھی، ضروری نہیں تھا کہ کسی کو یاد بھی ہوئی۔ مگر مومن کو اس فرم میں انٹرویو دینے جانے سے پہلے ہی پتا تھا کہ اس کے اوزر عادل پاشا اس کے بابا کے دوست رہ چکے ہیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ ذکر ضرور کرے گا، کام بن گیا تو ٹھیک ورنہ قابلیت کے بل پر نوکری حاصل کر کے رہے گا۔ وہی ہوا، جس وقت وہ بڑی چالاکی سے اندر جانے میں کامیاب ہوا، اس نے ساتھ ہی سالک پاشا کو پہچاننے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور عادل پاشا اور اپنے بابا کی دوستی کا حوالہ دیا۔ سالک پاشا بھی فوراً پہچان گیا اور بہت اچھے طریقے سے اس سے ملا مگر نوکری پھر بھی اسے قابلیت کی بنیاد پر ہی ملی تھی۔ اس کا سی دی بہترین تھا اور دوسرا یا حور نے اس کی راہ ہموار کرنے میں مزید مدد کر دی تھی۔ وہ اس کے آفس کے اندر جانے پر اتنا ہاتھ پیر ہو گئی تھی کہ خود تو انٹرویو کو لات مار کر نکلی ہی تھی، باہر بیٹھے بیشتر امیدواروں کو تاؤ دلا کر واپس جانے پر مجبور کر گئی تھی اور جو رہ گئے تھے ان میں سے بلاشبہ مومن تراب بہترین چو اُس تھا۔ سلیکٹ تو وہ اسی وقت کر لیا گیا تھا لیکن باقاعدہ اپوائنٹ منٹ لیٹر اسے آج گھر پر موصول ہوا تھا۔

وہ دادا کے ساتھ مل کر کپڑے دھلوا رہا تھا۔ صبح سویرے اسے گرم بستر سے بچھنچ نکال کر باہر صحن کی ٹھنھری سردی میں کپڑے دھلوانے کے لیے دادا نے شادیز سے اس کے بچھنے کا ٹیڈی بیر منگوایا تھا۔ حیران پریشان سا شادیز جب ٹیڈی بیر لے کر پہنچا تو دادا نے اس کے استفسار پر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ مومن کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر دبے پیر اس کے بستر کے قریب آئے اور ایک سائیڈ سے لحاف اٹھا کر وہ ٹیڈی بیر اندر گھسایا اور اپنی چٹری کی مدد سے آہستہ کے ساتھ اسے اوپر کو دھکیلا، یہاں

تک روہ سون لی باہوں میں آ گیا۔ دریاں پٹرنے مومن کے سوتے حواس بیدار کیے اور پھر: بل نہیں گزرے ہوں گے کہ زوردار چیخ مارتا مو بدکتا ہوا لحاف سے یوں اچھل کر باہر آیا جیسے اٹھنڈے پانی کے حوض میں پھینک دیا گیا ہو۔ سا۔ کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے دادا کو اور سا کھڑے شادیز کے خرگوش جیسے بڑے دانتوں کو دیکھ کر اس نے پہلے تیکھے چوتھوں کے ساتھ دونوں باری باری گھورا اور پھر ذرا سا جھک کر احتیاط ساتھ لحاف کو ایک کنارے سے ہٹایا مبادا وہ نرم نمخلیں جانور جو اس کی بانہوں نے محسوس کیا چھلانگ لگاتا اس کے اوپر نہ آجائے۔ تھوڑا تھوڑا کے ایک جھٹکے سے اس نے لحاف الٹ دیا۔ اندر ا نو مولود بچے جتنا ٹیڈی بیر پڑا اس کی ”مردانگی“ منہ چڑھا رہا تھا۔

”یہ..... یہ کیا مذاق ہے دادا؟ حد ہو گئی دی! یہ بھلا اٹھانے کا کون سا طریقہ ہوا۔ آپ مجھے د ہی اٹھاتے تو کیا میں نہ اٹھتا۔“

”اٹھتا۔ ٹھنڈے بھر بعد۔“ دادا کی طرف سے سا جواب آیا۔

”تو اٹھ تو جاتا نا۔ لیکن آپ کے اس نا سے میرے دنیا سے اٹھ جانے کے چانسز ہو تھے۔ تم سے، مجھے یوں لگا جیسے میرے پہلو: میرے پہلو میں۔ اف۔..... اب کیا بتاؤں۔ ج دیں۔“ وہ بالوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھنساتا د سے بیڈ پر بیٹھا۔

”نہیں۔ نہیں۔ تم بتاؤ۔ بتاؤ گے نہیں کیسے چلے گا کہ تم کچھ بتانا چاہتے ہو۔ لیکن فی میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں ہفتوں سے کپڑے نہیں دھلے اور اب نہ میرے پاس اور نہ تمہا پاس، ایک بھی گرم کپڑا صاف حالت میں ا میں موجود ہے۔ لہذا باہر صحن میں چلو اور مشین کپڑے دھو چلو شامش۔ تب تک میں گرم گرم بناتا ہوں۔ دونوں دادا پوتا چائے پاپوں کا

بغلوں میں دبا اور پن میں دادا کے ہاں جہاں چولہے کی فرحت بخش حرارت پھیلا گلوں میں چائے انڈیل چکے تھے اور اب کوپونی میں ڈال کر ساس پن کے پینڈے کر اس میں سے چائے کشید کر رہے تھے۔ کے رہ گیا اور چڑ کر بولا۔

”دادا! خبردار جو آپ نے یہ پتی میرے میں نچوڑی۔ سخت ابھن ہوتی ہے مجھے ا سے۔ میں نہیں پیوں گا ورنہ۔ ہاں۔“

”ظاہر ہے۔ تیرے باپ نے چلتی تھی نا جو اتنے خڑے ہیں۔ میں کم از کم یہ بھی ضائع نہیں کر سکتا۔“

”تو نہ کریں نا۔ اپنے مگ میں نچوڑ مجھے کیوں دیتے ہیں۔ مجھے کوفت ہوتی ہے“

”ابے او کو فٹے۔ چائے میں پاپا کھاؤ اور باہر واشنگ مشین کو درشن کر کپڑے ہر حال میں دھلنے ہی ہیں۔“ دادا تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ مومن کے تھے۔ اتنا سن کر بھی اس کا منہ لٹک گیا۔ اصرار ہوئے اس نے دوسرے چائے میں ڈبو، ڈبو۔ اور بقیہ ایک گھونٹ میں پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کپڑے دھونا کون سا آسان کام تھا جب دادا سر پر بیٹھ کر دھوا میں۔ ایسے ملو، رگڑو۔ مشین کو ایک چکر اور دو۔ میرے تو ہاتھ ملنا، مشین میں مت ڈالنا۔ ایسے میں مومن کو سب ہی یاد آ جاتیں۔ وہ بلا ٹکان بڑبڑاتا دھوتا جاتا۔ دادا سکون سے ہاسی اخبار منہ کیے اس کی سنے جاتے، جیسے ابھی سن رہے۔

”میں کہتا ہوں کہ آخر اتنی محنت نے ایم بی آئی ٹی کی ڈگری لی تھی، کیا وہ اس مشین کو پھیرے دوں۔ ریلین اور سفید کپڑے الگ کرنا سیکھوں۔، فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ کاروں پر برش رگڑوں۔ میل کتنا ڈالنا۔“

کپڑے دھونے میں اور میں دھوپ سینے میں۔ چلو جلدی سے باہر آؤ۔ ورنہ اب دوبارہ میں گلی سے کوئی کتا اٹھا کر تم پر چھوڑوں گا۔“

دادا چھڑی سے اسے وارن کرتے، زور زور سے اسے ٹپکتے باہر نکل گئے تھے۔ مومن نے ٹیڈی بیئر پکڑا اور پیچ کر دانت نکالتے شاویز کے منہ پر دے مارا۔

”ہمیشہ ایسی منحوس اشیاء تیری ہی بغل سے نکلتی ہیں۔ تجھے کیڑے پڑیں گے۔ دیکھ لینا۔ تیری جس لڑکی سے شادی ہوئی، اس کی دائرگی موندھ ہوگی۔ اور وہ تجھے پوکی امی اور تو اسے پو کے پاپا بلایا کرو گے۔ میری ہائے لگے گی تجھے شاویز۔ اس کڑکتی سردی میں، تو نے میرے بستر میں یہ ٹھیلے سے لیا رینگھ کھسویا ہے۔ میرا وقت آنے دے، میں تجھے اصلی رینگھ کے درشن کرواؤں گا کہینے۔“

ٹیڈی بیئر کو سینے سے چپکائے ہونق سا شاویز، مومن کے زمانہ کو سننے یوں سن رہا تھا جیسے لوگ پی ٹی وی کی خبریں سنا کرتے ہیں۔ ٹیڈی بیئر کو سہلاتے ہوئے وہ بھولپن کے کامیاب تاثرات چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے کیا کہتے ہو۔ تمہارے دادا کو انکار کرنے کا مطلب ہے، جینے سے انکار کرنا اور میں اس بھری جوانی میں جبکہ میرے آگے پیچھے لڑکیاں اولوں کی صورت تڑا تڑبستی ہیں اپنی جان پر ظلم نہیں کر سکتا۔ سمجھے۔“

”تم نے واقعی آج تک خود کو آئینے میں نہیں دیکھا پیارے؟“ مومن نے مصنوعی حیرت سے شاویز سے سوال کیا۔ ”دیکھ لیا کر گھونچو۔ اوقات یاد رہتی ہے۔ چل اب پتی گلی سے نکل لے اور شام کو تیار رہنا، جم چلنا ہے۔ چل نکل اب۔“

شاویز اسے کڑے تیوروں سے گھورتا بڑبڑاتا چلا گیا اور وہ جی کڑا کر کے یاہر صحن میں چلا آیا، جہاں سردی یوں اکڑ کے پھر رہی تھی جیسے اس کے نکاح میں

باب رحوں اور دادا اب۔ اب باں ہے وہ ہر
نے کو نیلو نیل کر دیں۔ میں کہے دے رہا ہوں، مجھ
سے نہیں ہوتے اب یہ زمانہ کام۔“
”تم مردانہ سمجھ کر، کر لیا کرو کیونکہ مردانہ
پڑے دھو تے ہو۔“ دادا نے اخبار کے پیچھے سے
جواب دیا۔

”ہونہ۔ بھلا سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ دھوتا تو
پڑے ہی ہوں نا۔ اب یہی دیکھیں۔ یہ.....“ اس
نے ہاتھ میں تھامی ہلکے نیلے رنگ کی بیڈیٹ لہرائی۔
اس بیڈیٹ کو میں تب سے دیکھ رہا ہوں جب سے
خود ابھی ”شیٹ“ بچھا کر سوتا تھا، لیکن بحال ہے جو
پ نے اسے اللہ واسطے کسی کو دیا ہو۔ یہ شخص آج
ہی ہمارے گھر ہے۔ اب تو اس کی حالت کسی
انگورہ بیڑ جیسی ہو چکی ہے، جسے ایک بار لگا دینے
کے بعد اتارنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس پر سونے
سے مجھے پتہ نکل آتی ہے دادا۔ میرے جسم پر
نٹوں کی طرح چھتی ہے یہ۔“

”بک بک بند کرو۔ سردیوں میں پتہ نہیں
لتی۔ اچھی بھلی بیڈیٹ ہے۔ تمہاری دادی نے اس
مانے میں ساڑھے تین سو کی خریدی تھی۔ اب لینے
آؤ تو تین ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔ اور تم کدھر
لی لیڈی ڈیا نا ہو جو تمہارے جسم کو ریشم چاہیے۔“ دادا
نے ٹھنڈے لہجے میں اسے دھو کر رکھ دیا۔ اخبار ہنوز
برے کے آگے تھا۔

”بس میں نے کہہ دیا۔“ مومن نے شرباب
لی آواز کے ساتھ ہاتھ میں پکڑی بیڈیٹ پانی کے
ب میں پھینکی اور بولا۔ ”اس گھر کو عورت کی ضرورت
ہے۔“

”ارے۔ دادا قربان تجھ پر میرے پوتے۔
مجھے یہ بات کہتے شرم آتی تھی، آخر کو مشرقی دادا ہوں
۔ اب تجھے یہ نادر خیال آئی گیا ہے تو میں کیوں نا
یری خوشی پوری کروں گا۔ رکھ بیٹا رکھ۔ تو جس پر
تھہر کے گا اسے تیری دادی بتلاؤں گا۔ تو بس دادی
اپنی پسند کی۔“ دادا اخبار پرے پھینکتے یوں جوش

میں اے نیسے اس سون اسے پیچھے پیچھے دوں
سامنے لا کھڑی کرے گا۔ مومن انہیں کینہ تو ز نظروں
سے بالکل اسی انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے دادا عام طور
پر اسے دیکھا کرتے تھے۔

”کیا کہنے آپ کے دادا۔ آپ نے تو میری
آنکھوں کے سوتے پھوڑ ڈالے۔ بندہ پوچھے کہ اپنے
لپے دادی ہی ڈھونڈتی ہے تو گھر والی نہ ڈھونڈ لوں۔
میں اب اس عمر میں سوتلی دادی کا دکھ نہیں اٹھا سکتا۔
نہ جانے کیسے کیسے ظلم کے پہاڑ توڑے مجھ پر۔ آپ
کی تو آنکھوں پر ظاہر ہے خماری کی پٹی بندھ جائے
گی، میں مسکین کدھر جاؤں گا۔ نا بابا نا۔ آپ
کنوارے ہی بھلے۔“

”کینہ۔ ٹھہر دلا نہ ہو تو۔ میں نے ساری عمر اس
آس میں گزاری کہ کب میرا پوتا جوان ہو اور اپنی
دادی خود چن کر لائے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم میری
آنکھوں کے خواب نوچ ڈالو گے۔“ دادا کے ایڈیشنل
بیان پر ایک سنجیدہ نظریہ مومن نے ان کے چہرے پر
ڈالنے کی کوشش کی مگر دادا اخبار کی آڑ سے ہی بولے
تھے۔

”جیسے مجھے دادی کی ضرورت نہیں۔ ویسے تو
آپ کو جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو
گھر کے کام کرنے والی عورت کی بات کی تھی۔ آپ
اپنے دل کے پھپھو لے پھوڑنے لگے۔ ہی ہی ہی۔
بات مکمل کر کے مومن مضحکہ خیز انداز میں ہنسا تو دادا
کا ہاتھ پاؤں میں پہنے سلیپر کی طرف گیا۔ اس سے
پہلے کہ کھینچ کر سلیپر مارتے اور دل ٹھنڈا کرتے، گیٹ
پر تیل ہوئی تھی۔ مومن سرف سے لتھڑے ہاتھوں
سمیت گیٹ تک گیا تھا اور واپسی پر گھوڑے کی طرز
ہنہاتا آیا تھا۔

”نئس۔ لئس۔ مل گئی۔ مجھے ملنی ہی تھی۔ بھلا
مومن تراب کے آگے کس کی دال گل سکتی ہے۔ اثر
آل اباؤٹ ٹئس۔“ مومن خوشی سے قہقہے لگاتا، دادا
کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھا اور اپنا اپوائنٹ منٹ
لیٹران کی آنکھوں کے آگے لہراتے ہوئے بولا۔

سرف کا جمال وہیں ایک لوے پر سزا
قسمت کو دور رہا تھا۔

☆☆☆

وہ سب نہایت خاموشی سے ناش
تھے۔ سبھی کے انداز بچھے بچھے سے تھے۔
ہاتھ میں چائے کا گپ پکڑے، دوسرے
ز وہان کا سر سہلا رہی تھی، جبکہ سوچتی نظر پر
میز کے عین وسط میں پوسٹ تھیں۔ سیف
بھی اسے مسلسل ٹوٹ کر رہے تھے۔ وہ
اگر بتانا چاہتی تو خود سے ہی بتا دیتی ورنہ
سچ لے، وہ بھاپ تک نہ نکالتی۔ لیکن وہ
کے بھائی تھے، پوچھے بغیر وہ بھی نہیں
ریان نے کہنی مار کر سیف کو ابتدا کرنے کا
”ایسا! کیا بات ہے؟“ کل سے ار
کیوں ہو؟ کیا جاب نہیں ملی، اس لیے؟“
چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ و
لے کر اس پر ملائی لگا رہا تھا۔

”ہم..... نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں
بار نہیں مانتی۔ یہ نہ سہی اور سہی۔ نوکر پو
ٹھوڑی تا ہے اس ملک میں۔ ہر روز آ
ہیں۔ ہاں بس انہیں حاصل کرنے کے لیے
پاس ٹکڑی سفارش یا پھر ٹانگ کھینچنے کا
اس کے تصور میں ایک بار پھر مومن ترار
اندر ٹپک کڑواہٹ سی بھر گئی۔ ایک عرصہ
اسے سچ ہوئے۔ اب تو وہ سب عادی ہوئے۔
”اچھا چلیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ
بل جمع کروائیں یا اسکول کالج کی فیسیں
پنہ یہ بات پوچھتے ہوئے کسی مجرم کی طرز
تھی۔“ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کل
جنت کو بھی اسکول کی طرف سے لاسہ
ہے۔“

”تم بل جمع کرواؤ۔ آج میں
بندوبست کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہر
سب ہو جائے گا۔“

اب آپ جھ سے مزید یہ زمانے کام نہیں
کروا سکتے۔ کیوں کہ مجھے۔ یعنی کہ مومن تراب کو
ایک بہترین فرم میں بہترین نوکری مل گئی ہے۔ اب
میں بابو بن کر اپنے آرام دہ آفس میں بیٹھا کروں گا۔
ترتی میرے قدم چومے گی اور میں اسے بار بار کہوں
گا۔ ذرا زور سے چوم اور زور سے۔“ وہ آنکھیں میچے
یوں بولا جیسے ترتی نہ ہوئی۔ وہ ہو گئی۔ آہو!

دادا نے اپنا چشمہ اتارا۔ مومن کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر ذرا سا آگے ہوئے۔ اس کے گرم
اونی سویٹر کا دامن پکڑ کر اسے کھینچا اور چشمے کے شیشے
صاف کرتے ہوئے بولے۔

”پوتے۔ تم بھلے سے فرم کے مالک بھی بن
جاؤ نا، پکڑے تو میں تم ہی سے دھواؤں گا۔ کیونکہ جو
مزا تمہاری ”دھلائی“ میں ہے وہ کسی اور کی دھلائی
میں کہاں۔“ ان کا انداز سراسر چٹانے والا تھا اور
مومن چٹ بھی گیا۔ اس نے ایک ابرو اچکاتے
ہوئے دادا کو گھورا اور چبا چبا کے بولا۔

”انفیکٹ آپ کو ایک پوتے کی نہیں ایک
چھوٹے کی ضرورت ہے دادا۔ جسے آپ جب چاہیں
آواز دیں اور حکم بجالانے کے لیے دوڑاتے رہیں۔
”چھوٹے! آئیو ذرا گیٹ کھولیو۔ چھوٹے ذرا چھت
سے کپڑے تو اتار لائیو۔ چھوٹے۔ چھوٹے۔
چھوٹے..... بس میں نے بھی کہہ دیا۔ آج ہی شادیز
کی کام والی ماسی سے کہیں کہ ہمارے گھر کی بھی
صفائی اور کپڑوں کی دھلائی کر جایا کرے۔ بس کہہ
دیا اب۔ جو خرچا ہوگا، میں اٹھانے کو تیار ہوں۔“ اس
کی گردن میں آتا اکڑاؤ دادا کو اتار لانے کے لیے
بہت تھا۔ اب کے انہوں نے لحاظ نہیں کیا بلکہ سلپر
اتار کر بیچ میں اس کی گلدی پر برسا دیا۔ مومن بے
چارہ آنکھیں میچے ہونے والے خرچے کا حساب
لگاتے ہوئے یک دم بلبل کر رہ گیا۔ اس کے بعد پوتا
آگے آگے اور دادا پیچھے پیچھے۔ سارے میں مومن
کی۔ ”او کوئی بچاؤ“ اور دادا کی ”کر خرچا اب“ کی
آوازیں گونج رہی تھیں۔ جبکہ کپڑوں کا ڈھیر اور

شامت یعنی ہے۔ ماحور اس کی حرکت پر ہکا بکارہ کئی
- زوہان کے انداز میں جارحانہ پن نمایاں تھا۔
سیف اور ریان بھی اس کے رویے پر حیرت زدہ
تھے۔ صرف جنت بھی جو سکون سے ناشتا کر رہی تھی
جیسے یہاں موجود ہی نہیں یا پھر یہاں کچھ ہوا ہی
نہیں۔

”تم تینوں بھی اٹھو۔ جاؤ اس کے پیچھے۔
ادھر ادھر نہ نکل جائے کہیں۔ اٹھو جنت۔ دیر ہو رہی
ہے۔“ جنت اپنا سلاک ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑی
ہوئی۔

”آج مجھے زونی کے اسکول چکر لگانا ہی پڑے
گا۔ کوئی سیریس بات نہ ہو۔“ ماحور نے دونوں
ہاتھوں میں سر لیتے ہوئے کہا۔ سیف نے قدرے
تاسف سے اسے دیکھا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا
تھا۔ چھوٹی سی عمر میں کتنی آزمائشوں میں مبتلا تھی اس
کی بڑی بہن۔ اس بات کا اسے بخوبی احساس تھا۔
وہ تینوں خاموشی سے اپنے بیگز پکڑے باہر نکل گئے۔
ماحور کتنی ہی دیر سر ٹیبل پر گراے بیٹھی رہی۔ پھر
ایک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی جب عقل مغل کے ہوش
میں آنے کی علامت ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ انہوں
نے گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ اس سے پہلے کہ
برداشت جواب دے جانی، ماحور نے فائف برتن سیٹ
اور چیکٹ پہن کر سر کو اسٹارف سے لپٹا اور چایاں ہاتھ
میں مضبوطی سے پکڑے گھر سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

”دیکھیے پرنسپل صاحب۔ آپ اس سارے
معاملے کو یک طرفہ دیکھ رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی
کہ زوہان بے قصور ہے لیکن آپ دوسرے بچے سے
بھی تو باز پرس کریں نا آخر اس نے زوہان کو گالی
کیوں دی۔“ ماحور کچھ پریشان اور کچھ نادم سی پرنسپل
صاحب کو زوہان کی صفائی دیتے ہوئے بولی۔ وہ
ریسٹورنٹ سے کچھ دیر کا آف لے کر زوہان کے
اسکول آئی تھی۔ یہاں پہنچنے سے پہلے وہ رائے کو ساتھ
لیتا نہیں بھولی تھی، نہ جانے کیوں اس کا ساتھ اسے

ایک لمبی خاموشی ان سب کے درمیان چند
کو چھایا سی گئی۔ جسے عقل مغل کی بڑبڑاہٹ نے
رات ڈھائی بجے گھر آئے تھے اور آتے ساتھ
لاؤنج کے فرش پر دھڑام سے گر کر بے سدھ
گئے تھے۔ اس حالت میں ان کو کوئی گاڑی بھی
تتی گزر جاتی تو کبھی ہوش میں نہ آتے، نہ جانے
کر کیسے آجاتے تھے۔ ماحور انہیں دیکھ کر اکثر یہی
کرتی کہ کاش! یہ کبھی گھر نہ آئیں۔

اس کی زندگی کو اس سچ پر پہنچانے والی دوی تو
نیاں تھیں۔ ایک اس کا باپ اور دوسری۔ دوسری
ہے بارے میں سوچ کر ہی اس کی رگوں میں خون
پڑتا۔ اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے شور
نا شروع کر دیا۔

”اٹھو، اٹھو تم لوگ۔ نکلو۔ مت اتنی دیر کیا کرو۔
زوہان تمہارے اسکول سے کل پھر مجھے کال آئی
ہے۔ پرنسپل نے بلایا ہے۔ کیا کیا ہے اب تم نے؟
گھر پر ہی بتا دو تو بہتر ہے ورنہ وہاں مجھے شرمندگی
پانی پڑی تو اسکول سے جوتے لگانی آؤں گی اور
سر تک لا کر بھی بس نہیں کروں گی۔ اس لیے مجھے
اکرتوت کے بارے میں ابھی آگاہ کر دو۔ بولو۔“

سب کی نظریں زوہان پر جم گئیں۔ گھبرا تو وہ
لے ہی گیا تھا اب مزید حواس باختہ ہو گیا اور اسی
س باہلی میں وہ بولا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا اپنا۔ کچھ بھی نہیں۔
مجھ سے لڑتے ہیں۔ مجھ پر جھوٹے الزام لگاتے
سب کے سب۔“

”کون زونی۔ کون لگاتا ہے جھوٹے الزام اور
کون لڑتا ہے۔ بتاؤ مجھے۔ کس کی بات کر رہے ہو؟“
ور نے پریشانی سے زوہان کا چہرہ جانچتے ہوئے
ال کہا۔ جو اب وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ سب کی
لوک نظریں ابھی بھی اسی پر جمی تھیں۔ اس نے
رک نکلتے ہوئے سب کو باری باری دیکھا اور اور
جھٹکے سے اٹھا۔ اپنا بیگ کھینچا اور یوں باہر نکلتا
گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ دوپل بھی مزید ٹھہرا تو اس کی

کے جی ڈیوز وقت پر ٹھہر ہوتے ہیں۔ پینڈنگ نہیں رہتے۔ ہونہ۔“ پرنسپل نے اصل کھول نکال باہر کی تھی کہ کمال ہی کے اذیت سے آنکھیں میچ لیں اور رائے کے ساتھ اس کی سمت دیکھا تھا۔ اسے تھے اس سارے فتنے کی اصل تک پہنچنے زوہان اور جنت کی فیسز ادا نہیں ہو سکر صاحب نے بچوں کے چھوٹے سے جھگڑا بنا کر اصل ایٹو پر بات کرنا تھی۔ لیکن بہت عامیانہ طریقہ اپنایا تھا۔ پرنس کو اذیل کر کے فیسز وصول کرنا کہاں کی رائے کے مارے پیش کے نتھنے پھڑکنے نے اپنا لیدر بیک زوردار آواز کے ساتھ ٹیبل پر مارا اور اپنی لمبی انگلی پرنسپل کی ہاتھ کرتے ہوئے ان سے بولی۔

”آئے تو ہم یہاں زوہان اور جنت کلیر کرنے تھے، لیکن اس بہانے یہ بھی کہ آپ بچوں کے ساتھ تعصب برتتے ہیں پہلا فقرہ سن کر جو پرنسپل کی باجھیں دوسرے کے ساتھ ہی واپس ٹھکانے پر ہکلا سے گئے۔

”ار..... ارے نہیں۔ نہ..... نہیں نہیں۔ زوہان بہت اٹلی جٹ ہے، بس کچھ زیادہ ہاتھ ہو گیا۔ چلیں جانے دیں لوں گا سارے معاملے کو۔ آپ پلیز ایڈمز جا کر ڈیوز کلیر کیجیے، تب تک میں آپ منگواتا ہوں۔“ ماحور پرنسپل کی گرجٹ جیم پرکا بگاڑ گئی۔ حیران پریشان تو وہ رائے کی تھی۔ بھلا اس کے پاس کہاں تھے فیس۔ بھی تین ماہ کی اکٹھی فیس۔

وہ مسلسل رائے کو متوجہ کرنے کی کوشش مگر وہ میڈم تو جیسے یہاں کسی اور کے ساتھ جو اس کی طرف دھیان ہی نہیں دے تیوریاں چڑھائے وہ پرنسپل سے بولی۔

نعویت دیتا تھا۔ پرنسپل صاحب کے پاس زوہان لی شکایتوں کا انبار تھا۔ زوہان ایسا ہے۔ زوہان ویسا ہے۔ ماحور کو یہ معاملہ ذاتی ناپسندیدگی کا لگ رہا تھا کیونکہ اس کی برائیاں گنوانے میں پرنسپل صاحب کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ زوہان کی اپنے ایک کلاس فیلو سے لڑائی ہو گئی تھی۔ وہ بچہ خاصی ویل آف فیلو سے تھا۔ بقول پرنسپل، زوہان نے نہ صرف اس بچے کو مارا پیٹا بلکہ اس کی بکس بھی بھاڑ دیں۔ وہ ماحور کو یہ سب بتاتے ہوئے اس اسکول کے پرنسپل کم اور اس بچے کے گارجین زیادہ لگ رہے تھے۔

”دیکھیں مس ماحور! زوہان کا آئے روز کسی تا کسی سے جھگڑا رہتا ہے۔ وہ اتنا جھگڑالو ہے کہ اسے اگر کوئی لڑنے کے لیے میسر نہ ہو تو اسکول کی پچھلی گراؤنڈ میں جا کر خود سے لڑتا ہے۔ درختوں پر چھڑیاں برساتا ہے۔ چننا چلاتا ہے۔ شرجیل کے ساتھ بھی جھگڑے کی ابتدا ہی نے کی۔ ورنہ وہ بچہ بڑا بھلامانس ہے۔“

”اچھا.....“ رائے اس بات پر چٹ کر بولی۔ وہ کب سے خاموشی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے اور کہنی کو کرسی کی ہتھکڑی پر ٹکائے، شہادت کی انگلی کو ہونٹوں پر جمائے آنکھیں سکیڑے پرنسپل کو دیکھ رہی تھی۔ اتنا ہی بھلامانس ہے تو آپ ہی کے منہ سے نکلا کہ اس بچے نے زوہان کو ”غلطی“ سے گالی دے دی تھی۔ اب اگر وہ بچہ غلطی سے گالی دے سکتا ہے تو زوہان بھی غلطی سے اسے پیچ مار سکتا ہے پرنسپل صاحب۔“ ماحور نے ٹیبل کے نیچے سے پاؤں مار کر رائے کو خاموش رہنے کا الٹی میٹم دیا۔ مگر مقابل رائے تھی۔ فوراً اس کی پہنچ سے پیر کو دور کیا اور گردن اکڑا کر پوچھ پڑتال کے لیے سیدھی پوچھی۔ پرنسپل پہلے ہی بل گھائے ہوئے تھا۔ مزید جی سے گویا ہوا۔

”دیکھیں مس۔ ہمارے اسکول کی ریپوٹیشن کا سوال ہے۔ شرجیل اس اسکول کے ٹرینیٹ میں سے ایک کا پوتا ہے۔ وہ کوئی معمولی گھرانے کا بچہ نہیں۔ ہمارا اسکول اس سے کس بنیاد پر باز پرس کرے۔ اس

”تمہیں پتا ہے مانی۔ تم جتنی خوب صورت ہو اتنی ہی سڑی ہوئی ہو۔ اپنا خون جلا جلا کر تم ڈرگین کی طرح آگ اگلنے لگی ہو۔ ہا ہا ہا.....“ وہ بھرپور ہنسی مگر ماحور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ کھلی۔ رائے نے اپنا بیک دھپ کی آواز کے ساتھ اس کے پہلو میں کھینچ کر مارا اور دھونس سے بولی۔

”اب کیا جان لوگی میری۔ بس بھی کرو۔ میں اگر مر گئی تو دن رات مجھے یاد کر کے رویا کرو گی تم۔ ہاں نہیں تو۔“

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا رائے۔ میں کس طرح اتنی بڑی رقم کا قرض اتار دوں گی۔ تمہیں زونی اور جنت کی فیس پے کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتا چاہیے تھا۔“

”اچھا جی۔ تو تم کیا کر لیتیں۔ ہیں جی؟“ رائے نے ابرو اچکاتے ہوئے تھکے لہجے میں پوچھا۔

”ظاہر ہے، تمہیں منع کر دیتی اور کیا۔“

”اچھا۔ تو پھر وہ پرنسپل کا بچہ دونوں کو ایکسپیل کر دیتا اسکول سے۔ وہ ٹھیک تھا؟“

”نہیں۔ نہیں۔ اس کی نوبت نہیں آتی۔ میں چند دن تک رن اریج کر رہی تھی۔ ہو جاتا کچھ نہ کچھ۔“

”او..... ہاں جی آپ کے تو اشارہ ابرو پر نوٹوں کی قطار ہاتھ باندھے چلی آتی نا اور کورٹس بجا لاتے ہوئے عرض کرتی۔ بولیں ماحور بی بی، ہمیں کس کی جیب میں جانا ہے۔ اتنی ہی تو تمہاری پی آر ہے۔ ہیں جی۔“

”کچھ بھی کرتی رائے۔ لیکن تمہارا احسان لیتے مجھے واقعی شرم آرہی ہے۔ پہلے ہی کیا کم کرتی ہو تم ہمارے لیے۔ جانے انجانے کتنے ہی تو مقروض ہیں ہم تمہارے۔ اب یہ نیا بار۔“ تاسف اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔ رائے نے اس کے قریب کھسک کے بڑی محبت سے اسے ساتھ لگایا اور اسے دھیماسا جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

”ایسا مت سوچا کرو مانی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں۔ مگر جب سے میں بیاہ کر تمہارے ہمسائے

”آپ اپنی کافی اپنے پاس رکھیے۔ کچھ دیر آپ کو ضرورت پڑنے والی ہے۔ ہم ذرا ایڈمنسٹریٹو فارغ ہو لیں، اس کے بعد ان شاء اللہ میرا اسٹیپ آپ کے اسکول کے ہیڈ آفس کال کرنے ہوگا۔ میں آپ کی کمپلیٹ لازمی کروں گی۔ کس طرح آپ نے ہمارے بچوں کو اور ان کے گھر والوں پر وقت ڈیوڈ کلیر نہ ہونے پر ڈی گریڈ کیا ہے۔ اور جج کے بعد۔“ رائے اپنی کرسی سے ایک جھٹکے سے ٹری ہوئی اور ٹیبل پر ہتھیلیاں جماتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ نے ہمارے بچوں کو ان کے کسی اس فیو لیا فیکٹی کے سامنے نچا دکھانے کی کوشش کی یقین جانیے بس دو دن۔ دو دن میں آپ کا اسکول کروادوں گی۔ اس علاقے کا ایس ایس پی میرا دوست ہے۔ بس اتنا تعارف کافی رہے گا پرنسپل صاحب۔“ رائے نے سکتے میں آئی ماحور کا بازو تھاما اور آفس سے باہر نکلتی چلی گئی۔ پیچھے پرنسپل صاحب یستانی کے عالم میں ادھ کھلا منہ لیے بیٹھے رہ گئے۔

☆☆☆

ٹیکسی میں اس قدر خاموشی تھی کہ اسے اب صبر ہونے لگی تھی۔ وہ تو چپ بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ کوئی نہ ملتا تو خود سے ہی چار باتیں کر لیتی تھی۔ پہلو پہلو بدلے جا رہی تھی مگر ماحور نے رخ بدل کرنا نہ دیا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک میں اللہ جانے کون سی دنیا دریافت کرنے کے کروں میں تھی۔ عارض لال بھوکا ہوئے اس کے درونی خلفشار کا پتا دے رہے تھے۔ نتھنے بڑے غم سے پھڑک رہے تھے اور ماتھے پر پڑے بل بے سارے غصے کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کو ی آگئی جسے اس نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہنسی تو ماحور نے پلٹ کر اسے شکوہ کنناں نظروں سے دیکھا۔ پلکوں پر ہلکی سی نمی بے اختیار اتر آئی۔ رائے نے طویل سانس بھری اور اسے دھیمے سے مخاطب کیا۔ ٹیکسی میں نہ بیٹھی ہوتی تو اپنے مخصوص لیوم میں بی بات کرتی۔

سارے چوسے و سرے چوسے دیے۔
 مٹھائی بھی دیکھنے کے بہانے کتنی ہی کھا بیٹھے۔
 پوتے کی شکل دیکھی تو وہاں تو بہار آئی بیٹی تھی۔
 انہوں نے آنکھیں سکڑ کر مومن کو متوجہ کرنے کے
 لیے دودھ فرش پر چھڑی ماری اور لہجے کو سرسری سا
 رکھتے ہوئے بولے۔

”ہاں تو میاں۔ یہ سب بھلا کس لیے اٹھا
 لائے ہو۔ کچھ بتانا پسند کرو گے؟“

”ارے پیارے دادا۔ آم کھائیں نا اور بس
 آم ہی کھائیں۔“

اس نے لہک کر جواب دیا۔
 ”کیوں گھٹلیاں تو چوسے گا؟ نا مجھے بس یہ بتا
 دے کہ میرا ولیمہ تھا جو اتنا پھل اور مٹھائی کھا اٹھا
 لایا۔“

”دادا آپ کو ہر وقت اپنے ولیمے کی ہی چاہ
 کیوں چڑھی رہتی ہے۔ میرے ولیمے کا بھی ذکر حیر
 کیا کریں۔ گھر میں رونق ہوگی۔“

”رونق تو میرے ولیمے پر زیادہ ہو سکتی ہے
 کیوں کہ پورے شہر کے بابوں نے حسرت کے
 مارے بس یہ دیکھنے کے لیے شرکت کرنی ہے کہ میرا
 بیٹا اس عمر میں ہوا کیسے اور اس کے محرکات کیا تھے اور
 آیا وہ بھی ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ ان کا بھی
 چٹ ولیمہ اور پٹ ولیمہ ہو جائے۔ کیوں کہ جھپٹے کی
 عمر میں ولیمے کا لفظ ہی کشتے کا کام کرتا ہے۔ مجھے
 پوتے۔“

پوتا تو کیا خاک سمجھتا، اس کا تو دادا کے نادر
 خیالات پر ہی دل و دماغ اش اش کر اٹھا۔ اس نے
 تین چار بار آنکھوں کو ملا۔ بھنویں اچکا کر تھوک نگلا اور
 رسان سے بولا۔

”آپ بھی بات پیدائش پر ہی سے شروع
 کرتے ہیں اور ولیمے پر دم لیتے ہیں۔ اب یہ سب
 ٹھکانے لگوا میں۔ نوکری ملنے کی خوشی میں لایا ہوں۔
 سو چا محلے داروں کو بھی شریک کروں۔ آپ سب میں
 تقسیم کروادیں۔“

دودھ دن اور اے ۵۴ بے ہوا سے دی و
 چھوڑتے۔ اسے بھی زبردستی آفس جوائن کروایا
 بلکہ انہیں بے کار بیٹھنا پسند نہیں۔ اب اس سے
 سیارے نہیں ہوتے اس لیے ڈھونڈ رہی ہے کسی
 غنٹ ور کر کو۔ مجھے بلا رہی تھی لیکن عاقب نے
 مت نہیں دی۔ میں نے تمہارا نام لے دیا۔ اب
 نہیں دیں بجے تک اس جگہ پہنچنا ہے۔ پیکیج بھی
 ہے۔ باقی سمجھو کہ یہ نوکری کچی۔ اوکے۔“
 ماحور رنگ سی بیٹھی اس مہربان کو دیکھ رہی تھی جو
 کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے
 ہی حد تک جاتی تھی۔ قدرت ہر ایک کو زندگی میں
 نقص اور بے مثل لوگوں سے ضرور نوازتی ہے جن
 سہارے راستے کی کھٹائیاں، آسانیاں میں بدل
 ہیں۔ یہ کہنا عبث ہے کہ ہمیں کوئی ملا نہیں، بلکہ
 ی پر بھروسہ نہ کر کے خود کو تنہا کر دیتے ہیں۔

رائہ، ماحور کی آنکھوں میں اترے پانی سے
 باوجود کہ بے نیاز سیل فون پر مصروف تھی جبکہ
 نے تشکر سے اس کے صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے
 رخ کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی زندگی کی اور
 لیا تھا۔

☆☆☆

صحن میں ڈھیر ساری مٹھائی اور پھلوں کے
 بڑے پڑے تھے۔ دادا ہر چیز کا باریک بینی سے
 دیکھ لے رہے تھے۔ قریبی کرسی پر مومن پاؤں
 لائے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، گوٹ اتار کر
 نگوں پر ڈالے نیم دراز سا آنکھیں موندے بیٹھا
 ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آج نوکری کا
 دن تھا۔ صبح آٹھ بجے سے شام چار تک کی ٹائمنگ
 س۔ سارا دن کام سمجھتے اور پوری بلڈنگ کے ہر
 کے ہر سیکشن کا تفصیلی جائزہ اور باقی ورکرز کے
 تھ تعارف میں نکل گیا تھا۔ اس کا موڈ بہت فریش
 واپسی پر وہ پھل اور مٹھائیاں لیتا آیا۔ ارادہ تھا
 کہ نوکری ملنے کی خوشی میں محلے میں بڑا دے گا۔ دادا
 البتہ اتنی فضول خرچی ہرگز، ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

محکم میں ہی بیٹھا لیتا اور پھلوں کے ٹھیلے یہیں کھڑے کروا کے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کراتا۔ کہ آؤ اور میرے پوتے کی عقل پروٹے پاؤ۔ جسے پہلی تنخواہ نہیں ملی ابھی لیکن تنخواہ کے برابر رقم جھوک آیا ہے یہ سب خریدنے میں۔ اتنا تو عقل مند ہے نا بھار۔“ محل سے بولتے بولتے دادا کو جوش آیا اور بات مکمل کرتے ہی چھڑی مومن کے گھٹنے پر دے ماری۔ وہ ڈھیلا ہو کر بیٹھا تھا۔ لگا چار سو چالیس روٹ کا کرنٹ سارے جسم میں سرایت کر گیا ہے۔ سیدھا ہو کر گھٹنے کو سہلاتے ہوئے وہ جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

”کیا دادا! کبھی محلے میں ہم نے کچھ نہیں بھیجا۔ اللہ بخشے جب تک امی زندہ تھیں، ہر دوسرے دن کچھ نہ کچھ بنا کے بھجوانی تھیں دائیں بائیں اور بدلے میں ہمیں بھی آجاتا تھا تو منہ کا ذائقہ بدل جاتا تھا۔ لیکن امی کے بعد تو آپ نے عید، شہرات پر بھی کبھی محلے میں کچھ نہیں بھجویا۔ اس لیے یہ سب لایا یوں کہ اسے تقسیم کریں۔ تقسیم کرنے سے رزق بڑھتا ہے۔ کم نہیں ہوتا دادا۔“

”تیری تقریر اگر ختم ہوگئی ہو تو اٹھ اور اندر کچن سے پلیٹیں پکڑ کر لا۔ دادا ہوں میں تیرا۔ میری امی نہ بن۔ سمجھا۔ چل اب اٹھ۔ اس سے پہلے کہ میرا ارادہ بدل جائے۔“

مومن ٹافٹ اٹھا اور جھٹ سے کچن سے پانچ سات پلیٹیں پکڑ لایا۔ دادا پلیٹوں کی تعداد دیکھ کر ایک بار پھر جڑبڑ ہو گئے۔ داڑھی کھجاتے ہوئے بولے۔

”کیا محلے کے قبرستان میں بھی بھجوانی ہے مشائی؟“

”کیوں۔ کیا دادی نے رس گلوں کا کھلوایا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ ایک پھلوں کا ٹوکرا اور ایک مشائی کا ڈبا، دادی کی قبر پر رکھ آتا ہوں۔ اوپر آپ کے نام کی چٹ لگا کر آؤں گا۔ تاکہ دادی شکر یہ ادا کرنے کمرنگ تو آسکیں۔“

وہ بھی ان کا پوتا تھا۔ ان ہی کی طرح بات سے

سے اسے دیکھا اور پلیٹیں اس کے ہاتھ تپائی پر رکھیں۔ ان میں پھل اور مٹھا کی خود کلامی کے انداز میں بولے۔

”ہم..... یہ ایک پلیٹ تو ہوگئی کی۔ لیکن اس کے دادا کو شوگر ہے۔ ا پھر ک جائے گا۔ نہ جی نامفت میں میرے خلاف کٹ جانی اور بڑا بھائی! کھی کا کنسٹر بن چکے ہیں پھول کر۔ آؤ بن کر لگتی ہے۔ باقی رہ گیا شادیز۔ تو آ رہے، جب بھی یہاں آتا ہے، مندیوں سامنے رکھو، کھا پی جاتا ہے۔ ایسے ڈلیاں رکھ دوں گا۔“

لوحی ایک پلیٹ تو خالی ہو کر سا مومن اچنبھے سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

”یہ دائیں طرف کی عطیہ بہن دیتے ہیں۔“ انہوں نے اگلی پلیٹ پکڑ کر مومن کچھ ریلیکس ہوا۔

”ارے..... یاد آیا۔ نہ جی۔ ہ عطیہ خاتون کا تو تیری دادی سے بڑا ز رہتا تھا۔ تیری دادی کے مرنے سے چا دیوار پر چڑھ کر لڑی تھی یہ۔ اور جواب نے اگل دان کھینچ مارا تھا۔ وہ اس عورت تک واپس نہیں کیا۔ اس کی بھی پلیٹ رکھا ہے۔“

مومن نے بے بس ہو کر اگلی پلیٹ رکھ دی تھی اور کمر کرسی سے ٹیک کر دادا دیکھنے لگا۔

”یہ جو ذوالفقار صاحب ہیں نا۔ تو رہنے ہی دے۔ یا تو پلیٹ واپس نہیں جاتے ہیں مزید مانگنے اور سامنے والے نا ہیہ جیو۔ یا نہیں پچھلے جمعے پر بار کے گھر سے۔ مجال ہے ایک بوٹی بھی نکلی مومن نظر چرا گیا کیونکہ بریانی

اس نے اس سے چھ ناپا سنا، وہ اور یہی سنا تھا۔ صرف ایک کپ کافی پی بھی اور سر تھا کہ درد سے پٹھا جا رہا تھا۔ تمام اسٹاف کوچ اور ڈنر ملتا تھا۔ وہ بھی گھبراہٹ کھا لیتی اور اکثر چیکے سے ریپ کر کے گھر لے جاتی۔ ایک ایک نوائے کی برگر کی عیاشی اس کے بہن بھائیوں کو بہت پسند تھی۔

زرش نے اسے تاسف سے دیکھا اور ڈپٹ کو بولی۔

”عقل کو ہاتھ مارو ماحور۔ خالی پیٹ کافی پی پی کر آنتوں میں زخم ہو جائیں گے۔ آدھا ہی کھا لو۔ اس کے بعد میں تمہیں کافی لا دیتی ہوں۔“

”ہونہ۔ یہاں رگ رگ زخمی ہے، تمہیں آنتوں کی بڑی ہے۔ اتنی ہمدردی نہ کیا کرو مجھ سے۔ مجھے بھالے کی طرح لگتی ہے۔“ ماحور آنکھیں مسلتے ہوئے بے رحم لہجے میں بولی۔

”ماحور! ہم پر تب تک کوئی ترس نہیں کھاتا جب تک کہ ہماری ذات سے خود ترسی یا خود اذیتی جیسے جذبات عیاں نہ ہونے لگیں۔ اگر چاہتی ہو کہ تم سے کوئی ہمدردی نہ کرے تو خود پر ترس کھانا ختم کرو اور خود کو اذیت دینا بھی، لوگوں کو جیسا نظر آتا ہے وہ دیا ہی رہی ایکٹ کرتے ہیں پاگل۔ لو اب تھوڑا سا کھاؤ۔ اس کے بعد تمہیں مختار صاحب کا آفس ورک بھی دیکھنا ہے۔ میں ذرا ایک منٹ میں آئی۔“

یہ زرش کیا کہہ گئی تھی اس سے۔ کتنے الگ انداز میں آئینہ دکھایا تھا اسے۔ وہ سن سی بیٹھی سوچتی رہ گئی۔ ہاں۔ وہ ہمیشہ خود کو سب سے زیادہ قابل رحم لگی تھی۔ جس طرح کے حالات سے وہ چھوٹی سی عمر سے گزر رہی تھی، ایسا سوچنے میں حق بجانب تھی۔ لیکن کیا ملا تھا آخر اسے اپنے لیے روتے روتے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہوتا تو وہی تھا ہمیشہ جو اس کے گمانوں سے پرے منہ چھپائے بیٹھا ہوتا تو کیوں وہ اس خول میں بند ہے؟

اس نے ایک ٹھنڈی اور افسردہ سانس بھر کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا اور دل ہی دل میں خود

بویاں اسی سے بیت پر سرے سرے ہی ہرپ س۔ اب چپ رہنے میں ہی، بھلا تھا، دادا کو بتاتا ہوں نے انتقام اسی کو چک مار لیتا تھا۔

”اب رہ گئے تیری دادی کے پچھلے۔ تو یہ جو نرم سے کیے ہیں نا وہ جن کر اٹھا اور اس پلیٹ میں تیری دادی کے بھائی کے منہ میں دانت، وہ آرام سے کھالے گا۔ سخت پھل بھیجا تو تالو رہا تھا میں آجائے گا غریب کے۔ نا جانے کیا کتنے میں لگے گا پھر۔“ دادا نے ناک میں انگلی رتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہا۔ مومن چڑ کر اہوا اور غصے میں بولا۔

”دادا۔ آپ ایسا کریں کہ یہ سب اٹھا کر کچن ہی رکھ لیں۔ آپ سمجھیں، ”ہم“ نے ”ہمیں“ بھیجا ہے۔ پورا مہینہ کھائیں گے۔ بس۔ اب۔“

”یہ کی باتم نے پیار محبت والی بات۔ شاباش ہونہار پوتا۔ چل میرا شیر۔ اب اٹھا میرے ساتھ کچھ اور کچن میں لے کر چل۔ چل۔“

دادا جوش سے کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن مومن بات کا الٹا اثر دیکھ کر غصے میں ”واک ان“ کر لینی باہر سے اندر کمرے میں چلا گیا۔ دادا نے جاتا دیکھ کر ہاتھ جھٹکا اور اکیلے ہی بڑے موڈ سارا پھل اور مٹھائی اٹھا کر کچن میں رکھنے کیونکہ دادا چڑی جائے پر دمڑی نہ جائے کے لیے پر چلنے والے باعمل انسان تھے اور یہ بات ان تراب سے بڑھ کر کون جانتا تھا۔

☆☆☆

”پلیز زرش میں آج کچھ نہیں کھاؤں گی۔ ہاں سکے تو ایک کپ کافی کا مزید مل جائے تو شاید سر درد میں افاقہ ہو۔“

وہ تیزی سے کام نمٹا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں کی شفٹ آف ہونے والی تھی۔ اس کی ساتھی زرش اس کے اور اپنے برگر لیے پیج کی جانب آئی۔ ماحور کو بھی وہیں پہنچ لائی۔ وہ جانتی تھی کہ

”زیر لواندا زہ ہیں ہے تاکہ میں یہی اذیتوں کا دریا پاٹ کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ کاش میں اسے اپنی زندگی کے فلیش بیک میں لے جاسکتی۔ تو شاید جو چلا میں نے خود اذیتی کا پہن رکھا ہے اس میں ترس کا ایک پوندہ خود اپنے ہاتھ سے لگائی۔“

اس نے سر جھٹک کر خود کو ماضی کی اڑتی راکھ میں گم ہونے سے روکا اور جلدی سے برگروپ کر کے بیک میں ڈالا۔ ٹائم دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج اسے سرخٹار کو ساری آڈٹ رپورٹ مکمل کر کے دینا تھی۔

اگلے ڈیڑھ گھنٹے تک اسے کمپیوٹر اسکرین سے نظر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ دماغی حور بہت ڈسٹرب ہونے کے باوجود اس کی انگلیاں کھٹاکھٹ کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اسے احساس تک نہ ہوا کہ اس کے پیچھے موجود آفس کا دروازہ انتہائی آہستگی سے لاٹک رہا تھا اور پھر اگلے چند لمحوں میں اسے اپنی گردن کی پشت پر خفیف سانس محسوس ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی۔ اس کی خوف سے پھٹی ہوئی آنکھیں اسکرین پر جمی تھیں۔ بس ذرا گہرا ہوا۔ دباؤ بڑھا تو اس کی تمام حسیات خوف کے اثر سے نکل کر بیدار ہو گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو کر مڑی۔ پشت پر کھڑا جیم جیم وجود اس کی راہ میں مکمل طور پر حائل تھا۔

”آپ..... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

بے ساختہ پوچھتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھتا چلا جا رہا ہے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے تیزی سے میز کا کونا تھما۔ مگر آنے والے کا اپنی طرف بڑھتا ہاتھ دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی۔

☆☆☆

اس نے فائل بند کر کے کھڑی پر ٹائم دیکھا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ یعنی وہ کافی دیر کام کرتا رہا تھا۔ اس نے انگوٹھوں کی پوروں سے آنکھوں کو

تھوڑا نہ ڈھنڈیا بج جاتی تھی۔ اس کے وال سے چڑا سی اسے دیکھتا فوراً اندر آ چہرے پر بے زاری اور اکتاہٹ اس وقت کہ اسے ہنسی آگئی۔

”لو بھئی۔ اب تم سب کچھ لاک راستہ ناپو۔ سوری! میری وجہ سے تمہیں ا کرنا پڑا۔“ اس نے چڑا سی کو ہمدردی ہوئے کہا تو وہ بھی مروت بھجائے ہوئے ”نہیں سر۔ انتظار کیا۔ ہمارا آپ بس اپنی ٹیبل کے دروازہ وغیرہ لاک کر رہے ہیں۔“

”ہاں وہ میں نے کر دیے ہیں۔ تم آفس لاک کرو اور گاڑو کو بتا چاہو تو میں تمہیں گاڑی پر ڈراپ کر دوں۔“

”ن..... نہیں سر۔ آپ کی مہربانی اندر سے ہوتا ہوا دس منٹ میں گھر پہنچ جاؤ گیوں میں گاڑی نہیں جا پائے گی۔“

آفر پر عاجزی سے بولا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر۔ کل ملیں حافظ۔“

وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر تیز تیز چلا آفس کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ باجنگلی کاراج تھا۔ ہلکی ہلکی دھندلانی شرور گاڑی کا لاک کھول کر اس میں بیٹھ کر اسے دونوں ہاتھ رگڑے اور اشارت کر کے آ نے گاڑی کے شیشے سے اپنے آفس کی کھڑکی کو دیکھا۔ اس کے آفس کی لائٹ تھیں۔ وہ تسلی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اسیٹ میں گاڑی نہیں چلا رہا تھا۔ دوسرے وہ شیشل سیل پر گھر رابطہ کرنے کے کی کو تھا۔ جب ہی ایک موٹر کاٹتے ہوئے کوئی سے اس کی گاڑی کے سامنے آیا اور ایک بریک لگے۔ کوئی لڑکی اس کی گاڑی کے ایک آدھ فٹ کے فاصلے پر منہ کے بل

ہو تو مجھے بتاؤ میں چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن پلیز ذرا جلدی کرو، میں بہت لیٹ ہو چکا ہوں۔ ہیلو.....“ کوئی جنبش نہ پا کر وہ جھنجھلا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کرتا، اس لڑکی میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ہولے سے اپنا سر بجدے کی حالت سے اٹھایا اور رخ پھیر کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر اس ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔

”تم.....“ لڑکی کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ جس قدر بھی حیران ہوتا کم تھا۔

☆☆☆

اپنے پیچھے مختار انصاری کا مکروہ۔ چہرہ دیکھ کر وہ پوری جان سے کانپ گئی تھی لیکن بڑی سرعت سے اس نے خود کو سنبالنے کی کوشش کی، وہ اپنا خوف عیاں نہیں ہونے دیتا جا ہتی تھی۔ ایک مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر وہ تھوک نکل کر گلا تر کرتے ہوئے بولی۔

”سر آپ کی تمام فائلز اور ڈیٹا میں نے اپ ڈیٹ کر دیا ہے۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔“

اس نے کہتے ہوئے سائڈ سے نکلنا چاہا تو مختار انصاری اس کے آگے آگیا۔ اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا تو ایک کمینی سی مسکراہٹ اس پر اچھالتے وہ مزید پھیل کر کھڑا ہوا۔

”سر پلیز۔ راستہ دیجیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”پہلے جو راستہ میرے دل تک آتا ہے، اس پر قدم رکھو۔ باقی تمام راستے کھل جائیں گے۔“ وہ چھچھور پن کی انتہا کرتے ہوئے معنی خیزی سے بولا۔ ماحور نے خود کو مکمل خطرے میں گھرا محسوس کیا لیکن ہمت دکھاتے ہوئے بولی۔

”میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ اپنے گھر کے راستے کے علاوہ دیگر راستے دیکھتی پھروں۔ اس کام

یہ سب اتنی اچانک ہوا تھا کہ اس کی اپنی ریڑھ ہڈی میں گودا سرسرا کر رہ گیا تھا۔ ایک بل کو اس کا چاہا کہ لڑکی گاڑی سے ہٹ نہیں ہوئی سوچ کر فٹافٹ سائڈ سے نکل جائے اور وہ ایسا کرنے ہی تھا جب اس نے کسی آدمی کو بھاگ کر اس لڑکی کی آتے دیکھا۔ نیم اندھیرے میں بھی اس آدمی جارحانہ انداز اسے صاف محسوس ہوا۔ اب بات نکل جانے والی نہیں تھی۔ اسے اس لڑکی کی مدد کرنی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی اس لڑکی تک پہنچتا، ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولتا باہر نکلا۔ وہ لڑکی پر سڑک پر اوندھے منہ بجدے کی حالت میں گری پڑی تھی۔ اسے فوری طور پر راہ سوچھی اور وہ سرعت سے اس لڑکی کی طرف بڑھا۔

”ارے تم..... تم یہاں کیسے؟ کیا ہوا ہے میں؟ اور تمہارا فون کیوں آف جا رہا ہے۔ وہاں سر پر سب نے پریشان ہو کر مجھے نہیں ڈھونڈنے کیلئے بھیجا ہے۔ حد ہو گئی دیے۔“ وہ اتنے نکل سے بولتا ہوا سامنے آیا کہ پیچھا کرنے والا بھی جہاں کا تھاں تھم گیا تھا۔ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ وہ ضرور لڑکی کا کوئی رشتے دار ہے۔ وہ آدمی دو قدم پیچھے ہوا اور پلٹ کر بھاگنے ہی والا تھا جب وہ لڑکی کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے غصیلے رات لیے اس آدمی کی طرف بڑھا۔

”اوئے رک۔ کون ہے تو اور کیوں پیچھا کر رہا۔ ٹھہر ذرا، ابھی پولیس بلاتا ہوں۔“ وہ آدمی یوں گامی جیسے اسے پاکستان کی پولیس کی انفیشنیسی پر پورا دوسا ہوا۔ اس نے پیچھے سے ایک ہانک مزید لگائی۔

”ابے رک۔ تیری تو.....“

جب اسے تسلی ہوئی کہ وہ آدمی جا چکا ہے تو وہ اس لڑکی کے پاس آیا جو ابھی تک اسی پوزیشن میں گری پڑی تھی۔ اسے کوفت نے گھیرا۔ پہلے ہی اتنا تھو گیا کہ اوپر سے یہ انجانی مصیبت۔

”اے ہیلو۔ بات سنو۔ اٹھو۔ وہ آدمی چلا گیا

ہا ہا ہا..... ارے م لو ضرور یوں پہ ہاتھ رکھنا بھی جانتی ہو اور تمہیں پتا ہے کہ میں کمزوریاں ہاتھ میں لیتا جانتا ہوں۔ مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ ہا ہا ہا۔“ اس کے قہقہے میں درندگی کی لپک تھی۔ ماحور کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناءٹ دوڑ گئی۔ اس کی برداشت بس اتنی ہی تھی۔

”سالے۔ بے غیرت۔ تو نے کمزوریاں ہاتھ میں لینے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے یا ڈیلی و سجز پر ہے۔“ زبان کی کڑواہٹ تو اس کے پاس حالات کا واحد تحفہ تھی جو محفوظ بھی ”اب شرافت سے آگے سے ہٹ، ورنہ ایسا گھونسا ماروں گی کہ ساری عمر کے لیے۔“ آگے جو ماحور نے بولا، اس نے مختار انصاری کو ایک لمحے کے لیے بوکھلا دیا۔ وہ چڑیا سی لڑکی سے ایسی بازاری تڑی کی امید نہیں کر رہا تھا۔

اگلے بل وہ اپنی شیطانی جون میں پلٹ چکا تھا اور ایک ہاتھ ماحور کے کندھے پر رکھ کر دباؤ ڈالتا کہ وہ اپنے پیچھے پڑی کرسی پر بیٹھ جائے۔ لیکن ماحور نے اس کی کوسنا کام بناتے ہوئے پورا زور لگا کر ایسا ہونے سے روکا۔ اس صورت میں وہ اس خبیث انسان کے ٹکٹے میں ہوتی۔ صرف ایک بل لیا اس نے سوچنے میں اور پوری طاقت صرف کر کے اس نے اپنا سر مختار انصاری کے چہرے پر دے مارا۔ سر اس کے ہونٹوں اور ناک پر لگا۔ فوری طور پر خون بہنا شروع ہو گیا۔ دونوں ہاتھ رکھے وہ آنکھیں میچ منہ پکڑے دہرا ہوا تھا اور اسی لمحے کا فائدہ ماحور نے اٹھایا۔ ٹھیک اس کے چہرے کا نشانہ لے کر اس نے اپنا گھٹنا ایک بار اوڑھیں دے مارا۔ مختار انصاری کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ ڈکرا کر رہ گیا۔

ماحور نے جلدی سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کا لاک نہیں کھل رہا تھا۔ بار بار گھمانے پر بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے سر اسیمہ ہو کر دروازہ پھینٹا شروع کر دیا۔ مگر شاید دروازے کو باہر سے بھی ملی جھگت سے بند کیا گیا تھا۔ اسی اثنا میں

تھا۔ اس نے ایک جست لگائی اسے قہقہے لیے مگر اس کے حواس چوکس تھے، وہ فوراً گئی۔ تقدیر میں اس کا بچنا لکھا تھا اسی۔ ریسٹورنٹ کی چھلی طرف بنی ایک تاریک گلی کی طرف کھلنے والے دروازے پر دروازہ اس نے نونشا بہ کو استعمال کر۔ کبھی کبھار گارڈ بھی یہاں سے آتا جاتا اس دروازے کی طرف لپکی مگر مختار کے بیک کا اسٹریپ آگیا اور اس نے اسی کو ماحور کو کھینچا۔ وہ بری طرح لڑکھرائی۔ قہقہے جاتی مگر اس نے گھٹنوں کے بل نیم جھکے کے بالوں کو پکڑ کر خود کو بچایا۔ یہ اتفاق ہاتھ اپنے بچاؤ کے لیے اس کے بالوں مگر پھرے سائڈ جیسے مختار انصاری کو وحشت لیے یہ آخری وار تھا۔ اس نے چمکھڑتے کو آواز لگائی۔

ماحور کی ٹانگیں کاٹنے لگیں۔ یہ چ اس کی عزت بچا سکتے تھے۔ ایک بار گارڈ اس کا ٹکٹا محال تھا۔ وہ مختار سے چند فٹ پر بھی اور اس کے دائیں طرف کمپیوٹر ٹیبل نے اللہ کا نام لیتے ہوئے پورے حواس کمپیوٹر ٹیبل کو ایک جانب سے تھا اور اسے زوردار آواز آئی اور سارا سسٹم، ٹیبل سمیت اور مختار کے بیچ پڑا منہ چڑا رہا تھا۔

”تیری موت آج میرے ہی ہاتھوں نے مختار کو لگا کر ہے، اور مختار تجھے زمین میں گا۔“ وہ گالیاں بکاتا پاگل ہو رہا تھا۔ اسے ضرور لگتا ان سب کے پیچھے سے ماحور تک اور اسی اثنا میں ماحور پچھلے دروازے کو کھولا اسے پار کر گئی۔ نیم اندھیری گلی میں سر پہ اسے یہ وہم ستار ہا تھا کہ کہیں گارڈ اسے دبو مگر وہ اس کے پیچھے آیا ضرور لیکن تب تک پر نکل آئی تھی۔ اسے اپنے پیچھے کسی کے

ذرا جلدی کرو، میں بہت لیٹ ہو چکا ہوں۔
ہیلو.....!"

ماحور کے دل میں تشکر کے جذبات ٹھانٹیں
مارتے باہر آنے کو بے تاب تھے۔ وہ نہایت عاجزی
واکساری سے سڑک سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے
محسن کی طرف چہرہ موڑا۔ اگلا بیل "محسن" اور خود
اس کو حیرت آمیز منظر سے دوچار کر گیا تھا۔

"تم....." وہ چیخا۔
"اور یہاں بھی تم۔" جواباً وہ بھی اسی کے
انداز میں چلا کر بولی۔

"مجھے تمہارے پاگل ہونے پر شبہ تھا، آج
یقین ہو گیا۔ کیا کرنی پھر رہی ہو تم آدمی رات کو گھر
سے باہر۔ شرم آتی ہے؟" مومن تراب کمر پر دونوں
ہاتھ ٹکا کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ جب بھی آ جاتی ہے تو اسے عزت
سے صوفے پر بٹھاتی ہوں، ٹی وی لگا کر دیتی ہوں
اور خود بیٹا شرم کے گھر سے کام پر نکل آتی ہوں۔
سمجھو! کہ اور کچھ۔ بولو تو اگلی بار جب آئے تو تمہارا
ایڈریس دے دوں، ذرا تم بھی پہلی اور آخری بار
درشن کر لو۔"

وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے، اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالتی سرد لہجے میں بولی تو ایک لمحے کو وہ چپ
سا ہو گیا۔ مگر اگلے ہی بل وہ واپس جون میں تھا۔
"زیادہ چڑچڑ نہ کرو۔ باتیں بتانی تمہیں کتنی
آتی ہیں، یہ میں انٹرویو والے دن ہی اندازہ کر چکا
تھا۔ اب شرافت سے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے تمہارے
ساتھ اور یہاں کیسے پہنچیں۔"

ماحور نے تاسف زدہ سانس بھر کر اسے مختصراً
ساری بات بتا دی۔ وہ افسوس سے اس کا مکان سے
اٹا چہرہ دیکھ کر نظر چرا گیا۔ ایک ہاتھ پاکٹ میں ڈال
کر چابی ٹولی اور اسے ڈپٹ کے بولا۔

"رات بہت ہو چکی ہے ماحور بی بی۔ باقی کی
بات گاڑی میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہے، یہ نہ ہو کہ وہ

دیکھ کر اس کے حواس اب جواب دیتے جا
تھے۔ اسے فوری طور پر کسی کی مدد کی ضرورت
پر یہاں وہ چھٹی چلاتی بھی تو بے کار تھا کیونکہ یہ
گھر نکل ایریا تھا۔ بڑی بڑی آفس بلڈنگز اور پلازا
جو اس وقت تک بند ہو چکے تھے، ریش نہیں تھا۔
کا اور اس کا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا اور اس
آنکھوں سے مارے بے بسی کے آنسو نکل پڑے
۔ عین اسی وقت جب اسے لگ رہا تھا کہ وہ اب
بھی بل بے دم ہو کر گر پڑے گی اور گاڑی اس پر
پالے گا، وہ کسی چلتی گاڑی کے سامنے آ کر سڑک
ٹٹی تھی۔ گاڑی نے اسے ہٹ نہیں کیا تھا لیکن پھر
وہ سڑک پر یوں سر رکھے پڑی تھی جیسے ٹکرا کے
سی ہو۔ کچھ ہی لمحوں میں اس نے گاڑی سے نکل
سی کو اپنے قریب کھڑے یہ کہتے سنا۔

"آج تمہاری خیر نہیں۔ کہاں تھیں تم اور یہ کیا
ہے تمہیں؟ تمہارا فون کیوں آف جا رہا ہے۔
س گھر پر سب نے پریشان ہو کر مجھے تمہیں
بٹھانے کے لیے بھیجا ہے۔ حد ہو گئی دیے۔"

سجدہ ریزی کی حالت میں ہی اس نے ڈیلے
ماگھما کر اپنے پاس سے آتی اس آواز کو پہچاننے کی
کوشش کی کیونکہ اسے لگا کہ گاڑی والا شاید کسی
مے مخاطب ہے۔ مگر وہ اس کے قریب آ کر پہلے
دوں کے بل بیٹھا تھا پھر اٹھا اور گاڑی کی طرف پلٹا۔
اس سے باز پرس کی آواز ماحور کے کانوں میں پڑی۔
اس نے گاڑی کو واپس بھاگتے ہوئے سنا تو شکر کا
یل سانس اس کے سینے سے خارج ہوا۔ آج چھٹی
ی آفت سے وہ بچ نکل گئی تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ
یہی سجدے کی حالت میں پڑی رہے۔ یہ گاڑی والا
بشتہ بن کے آیا تھا اس کے لیے۔ اور اب وہ محتاط
رموں سے چلتا ہوا واپس اس کے پاس آ کر کھڑا ہوا
رگلا کھنکراتے ہوئے بولا۔

"اے۔ ہیلو! بات سنو۔ اٹھو اور۔ وہ آدمی
لا گیا ہے۔ اب تم بھی گھر جاؤ۔ اگر کہیں آس پاس

ایک سے نہیں لڑ سکتا، چار سے کیا بھڑوں گا۔ مجھے پٹنے کا شوق نہیں۔ چلو بیٹھو اب۔“

ماحور نے حیرت سے اس اونچے چوڑے مرد کو دیکھا جس کے بازوؤں کے مسلز اس کی کسرت کا پتا دیتے تھے۔ چوڑی چھانی اور کاندھوں کے ابھار اس کی جسمانی طاقت کا احساس دلاتے تھے۔ اور وہ کہہ رہا تھا کہ بے چارہ ایک سے بھی نہیں لڑ سکتا۔ جج.....

”اب چلو بھی کہ یہیں مرنے کی وصیت کر رکھی ہے۔“ وہ دوبارہ تھیکے لہجے میں بولا تو ماحور چونکتے ہوئے فوراً گاڑی کی طرف بڑھی۔ اس پاگل کا کیا بھروسہ تھا۔ منہ پھٹ سا آدمی تھا۔ میٹر کھوم جاتا تو یہیں چھوڑ جاتا اور موقع کی نزاکت کا خیال کرتے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ساتھ جانے پر مجبور تھی۔

اس سے ایڈریس پوچھنے کے بعد گاڑی اشارت کر کے اس نے فل اسپید پر چھوڑ دی تھی۔ ماحور کو صاف لگا کہ بس یہاں سے نکلنے کی جلدی ہے۔ ”ہونہہ! بزدل مکینہ۔ شکل ٹام کروڑ جیسی اور حرکیں شکتی کپور والی۔“ چچھورا!“ پر سکون ہوتے ہی وہ حسب عادت دل میں بھڑاس نکالنے کا کام شروع کر چکی تھی۔ گاڑی اس امر بے سے کچھ دور نکل آئی تو پرانا غصہ بھی عود کر آیا۔ ایک تفصیلی نگاہ ساتھ بیٹھے مومن پر اور اس کے چلیے پر ڈالنے کے بعد گاڑی کا اندر سے جائزہ لیا۔ حسرت آمیز سانس خارج کرنے کے بعد اس نے باقاعدہ اسے کینہ تو ز نظروں سے گھور کر کہا۔

”ہمم..... تو تمہاری تو بڑی موجیں ہو گئیں اس نوکری سے۔ دو ماہ کے اندر اندر گاڑی بھی لے لی۔ ویسے چالاک تم غضب کے نکلے۔ سب کو ناک آؤٹ کروا کے آج خود مزے کر رہے ہو۔ اگر تم نے اسی دن چالاک نہ دکھائی ہوتی تا تو تمہاری جگہ میں ہوتی اور اس گاڑی کو بھی میں چلا رہی ہوتی۔ ویسے میں ریڈ میں لیتی۔“ وہ بے نیازی سے گردن اٹھا کر اپنی پسند ایسے بتا رہی تھی جیسے شوروم اس کے ابا جی کا ذاتی ہو۔ مومن نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا، انداز

”داں“ لیکن پتا نہیں کیوں چپ رہتا یوں ہی خامسی سے سرک گئے پھر انگلیاں بجاتے ہوئے بولا۔

”نم کچھ بھی کہو۔ یہ جاب میری سو مجھے مل گئی۔ ہاں۔ جہاں تک اس گاڑی ہے تو چلو تمہیں سچ بتا کر تمہارا“ کلچر ہوں کہ یہ میری نہیں ہے نہ ہی میری تنخواہ ایک ڈیڑھ ماہ میں ہی میں ایسی لکڑی سکوں۔ یہ سر سالک کی ہے۔ آج آفس بچپن کا دوست ان سے ملنے آیا تھا اور زبردستی لہجے کے لیے لے گیا۔ سر کو پتا تو آفس نہیں آسکیں گے لہذا جاتے ہوئے کی چابی دے گئے ممکن ہوا تو ان کے گھر

دول ورنہ اپنے گھر لے جاؤں کیونکہ ان بھی چھٹی پر ہے اور کل صبح آفس لے آئے تمہیں ہماری تیسری ملاقات میں اتنا انداز چکا ہو گا کہ میں فطرتاً ایسا نہیں کہ ایویں پیسا پھروں، اس لیے گاڑی گھر لے کے جا رہا ہوں اتنی سی اسٹوری تھی۔ لیکن وہ کیا ہے تاکہ ج

بہنوں کے لیے خوش خبری

آج ہی تشریف لائیں اور

30% فیصد ڈسکاؤنٹ

حاصل کریں ہماری شاپ پر موج

تمام کتب کی میل جاری ہے

یہ دعایت صرف کراچی کی بہنوں کے لیے

شاپ کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 216361

وقت غصہ چرتی ہو، وہ گھاس ذرا کم ہی چرتی ہے۔
یوں! ٹھیک کہا تا میں نے؟“ اتنی تفصیل سے بتا
نے کی تک تو نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں اپنی طبیعت
کے برخلاف خاصی تشفی کرائی تھی اس نے ماحور کی۔
اباؤہ غمت زدہ ہو کر منہ پھیر گئی۔

”کیا سوچتا ہوگا کہ میں اتنی حاسد ہوں۔ کہ
ایک جاب ہاتھ سے کیا نکل گئی، برداشت ہی نہیں کر
رہی۔“ وہ دل ہی دل میں خود کو لتاڑتی بات بدلنے
کے لیے موضوع سوچنے لگی۔ مگر اس سے پہلے ہی
مومن نے اس سے پوچھا۔

”تمہیں ایسی کچھ کیا مجبوری ہے جو تم اتنی لیٹ
اٹ جاب کرتی ہو۔ کیا تمہارے فادر تمہیں اجازت
دے دیتے ہیں؟“ وہ اس کی دھتھی رگ چھیڑ گیا۔
ماحور کے چہرے کا رنگ تیزی سے تبدیل ہوا۔ اس
کے ابرو بھنج گئے۔ اذیت سے آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

”میرے فادر کو اس بات کا ہوش ہی نہیں ہوتا
کہ ان کی جوان بیٹی گھر چلانے کے لیے کہاں کہاں
ھلکے کھاتی ہے۔ اگر وہ اس قابل ہوتے تو میں آج
کسی اجنبی کو اپنے لیٹ ٹائٹ گھر سے باہر رہنے کے
لیے جواز نہ دے رہی ہوتی۔“

مومن اس کا جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس
نے تو ویسے ہی ایک بات پوچھی تھی۔ مگر اسے کیا پتا تھا
کہ انجانے میں وہ اس کی کمزوری پر ہاتھ رکھ رہا
ہے۔ اس نے فوراً اپنی سٹھلی میں کچھ کہنے کی کوشش
کی مگر ماحور نے اس کا ہاتھ بھانپ کر اسے ٹوک
دیا۔

”آپ شرمندہ نہ ہوں مسٹر مومن! کوئی بھی
فخص مجھے اس حال میں پائے گا، جس میں آج آپ
نے مجھے بچایا تو وہ دل میں میرے بارے میں شکوک
و شبہات کا شکار ضرور ہوگا۔ خیر۔ آپ کو بتانی چلوں
کہ میں اپنے گھر کی واحد لقیل ہوں۔ مجھ سے
چھوٹے تین بھائی اور ایک بہن ہے جو سب ابھی

بڑھتے ہیں۔ میرے بھائی چھوٹی مولی ٹیوشنزر لڑکے
یا گروہی سٹورز براہ راست ایلیز میں جاب کر کے اپنا
جیب خرچ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر انفلکٹ
گھر کا سارا سیٹ اپ میری جاب کے آسرے پر
چلتا ہے۔ اگر مجھے یہ جاب مل جاتی۔“ اس کا اشارہ
مومن کی جاب کی طرف تھا۔ ”تو مجھے ادھر ادھر خوار
ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن آپ کی بات بھی
درست کہ یہ جاب آپ کی قسمت میں تھی۔“ وہ سر
جھکائے اپنا بیگ ٹٹوتے ہوئے یوں بات کر رہی تھی
جیسے اسے کسی اور کی داستان امیر حمزہ سنا رہی ہو۔
بیگ سے گھر کی چابیاں برآمد کر کے اس نے سر اٹھایا
اور مومن کو سرسری سا مسکرا کر دیکھا۔

”بس، بس یہیں سے لیفٹ لے لیں پلینز۔
اس سے آگے راؤنڈ اباؤٹ ہے، وہیں اتار دیں۔
میں پیدل گھر چلی جاؤں گی، واکنگ ڈسٹنس پر
ہے۔“ اس نے محتاط انداز میں اپنے گھر کا آدھا
ادھورا پتا سمجھایا۔ مومن نے بھی اصرار کرنا مناسب
نہیں سمجھا کہ گھر کے گیٹ تک اسے اتارتا۔ راؤنڈ
اباؤٹ پر پہنچ کر ماحور نے گاڑی رکوا دی تھی، اترنے
سے پہلے پلٹ کر خوش دلی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور
اسے نوکری کی مبارک باد بھی دی۔ مومن جواب میں
بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر چلی گئی مگر
وہ تب تک وہیں کھڑا رہا جب تک آنکھوں کو وہ
دکھائی دیتی رہی۔۔ ویسے بھی اس کے اندر ایک
عجیب طرح کا احساس کروٹ لے رہا تھا۔ شرمندہ
کا، انسوس کا یا پھر کچھ اور۔ وہ اندازہ نہیں کر پایا۔ و
شاید مزید یہیں کچھ وقت بتا دیتا مگر دادا کی کال نے
اس کا ارتکاز توڑ دیا اور اس نے مزید ویر کرنا مناسب
نہ سمجھا اور ایک طویل سانس بھر کر گاڑی واپسی کے
راستے پر ڈال دی تھی۔ باہر پھیلی رات اسے جو حاصل
لگی۔ بالکل اپنے دل کی طرح۔“

☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ریحانہ ادیب

آئینہ دل

”آئینہ دل! صبح کے دس بج رہے ہیں، آج
کی تاریخ میں ناشتہ مل جائے گا یا صبر شکر کر کے بیٹھی
رہوں۔“ دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا گیا تو
اتوار کا دن ہی ہوتا تھا جس میں فجر کی نماز پڑھ



کا کہہ کر کمرے میں تیار ہونے چلا جاتا تو آنکھ کی نلکا
اک بار پھر وال کلاک کی سمت اٹھ جاتی۔
”ہاں بھئی سمیٹ لو دسترخوان میرا تو ہو گیا۔
عارفہ احسان عظیم کرنی اک ہاتھ میں چائے کا کپ
پکڑتے اور دوسرے سے گھٹنا دیالی ہائے وا۔
کرتے اٹھتیں تو آنکھ شکر ادا کرنی دسترخوان سمیٹ
میں دیر نہ لگانی۔

”نادر کا ناشتا ڈھک کے رکھ دینا۔ اٹھنے یہ عز
گرم کر کے دے دے گی۔“ عارفہ اک بار پھر چپٹیل
سر چنگ کرتی بے تابی سے نوبتے کا انتظار کرتی نظر
آئیں کہ کب نوبتیں اور ان کا من پسند سرکس شروع
ہو۔ ان کے حکم کرنے یہ آنکھ سر ہلا کر چکن کی راہ
کہ یہ فریضہ بھی وہ بن گئے انجام دیتی تھی کہ عارفہ
عزیز کو زحمت نہ ہو۔ نادر اس کا اکلوتا دیور اور عارفہ
منہ چڑھا بیٹا تھا۔ جس کے سونے جاگنے کے اگا
اوقات کا رتھے۔ کچن جلدی جلدی سمیٹ کر دن۔
لیے بنائی ہانڈی کو دم سے اتار کر وہ تیار ہو۔
کمرے میں بھاگتی تھی کہ نوبتے میں کچھ ہی منہ
رہتے تھے۔

وہ بینک میں جاب کرتی تھی۔ مشارب اک
پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا۔ مشارب اسے ڈرا
کرنے کے بعد اپنے آفس چلا جاتا تھا۔ واپسی
مشارب کے ساتھ ہوتی تھی۔ شام کو لوٹ کر آ۔
کے بعد کچن میں اپنے اور مشارب کے لیے چا۔
بنانے جاتی تو دن بھر کے برتن سنک میں پڑے
آتے۔ جب تک چائے بنی الٹا ہوا کچن وہ پھر
سیدھا کرتی نظر آتی۔ دن کا کھانا وہ بنا کر جاتی
اور چائے بننے کے بعد مشارب کو اس کا کپ تھا
اپنا کپ کچن میں ہی رکھے وہ رات کے کھانے
تیاری میں جت جاتی تھی۔

کبھی بھی تو مشارب جھنجھلا جاتا کہ وہ اس
ساتھ چائے تک نہیں پی سکتی تھی اور وہ پیار سے

دوبارہ سو جاتی تھی۔ در نہ تو روز بھر کے بعد سے مختلف
امور کو انجام دیتے آفس کا وقت ہو جاتا تھا۔ جلدی
جلدی ناشتا کر کے اور سب کو کروا کر وہ جھوٹے برتن
بھی تیزی سے دھو کر ریک میں خشک ہونے کو رکھ
دیتی تھی۔ اگر جھوٹے سے بھی کسی دن سنک میں اک
چائے کا کپ بھی چھوٹ جاتا تو شام کو آفس سے
واپسی یہ عارفہ پیگم طعنہ مارنے لگتی تھیں۔ اس کی پوری
کوشش ہوتی تھی کہ وہ اک برتن بھی چھوڑ نہ
جائے، لیکن سب کے خڑے اتنے ہوتے تھے کہ ناشتا
کرتے کرتے بھی خاصا ٹائم لگا دیتے تھے۔

”ذرا گرم چائے تو ڈالو، ٹھنڈی ہو گئی تھی
چائے پیتے ہوئے، مزا نہیں آیا ناشتے میں۔“ آخری
گھونٹ بھر کہ عارفہ کپ دوبارہ اس کے سامنے بڑھا
دیتیں اور وہ جو سارے جھوٹے برتن اٹھا چکی ہوتی اور
اب ان کے ناشتے کے برتنوں کے انتظار میں
دسترخوان سمیٹ نہیں پائی۔ تھر ماس سے گرم
چائے ان کے کپ میں اینڈ پلٹی دزدیدہ نظروں سے
دیوار پہنچی گھڑی گودیکھنے لگتی تھی۔ جس کی سوئیاں
تیزی سے نو کا سفر طے کرنی نظر آتی تھیں، لیکن
عارفہ یا ان کی بیٹی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ عارفہ
چائے کی چسکی لیتے ریوٹ سے چیمبل بدل بدل کر
بریکنگ نیوز سے فیض یاب ہوتی انٹرنیٹ منٹ چیمبل پہ
آ کر رک جاتی تھیں۔

”عزیز مجھے یاد دلانا مارنک شود کھنا ہے مجھے۔ کل
کا شو تو بہت اچھا تھا۔ کل مہندی ہوئی ہے۔ آج
بارات ہے گھینگی۔ ہائے کتنی غریب بچی ہے، بھلا
ہو چیمبل والوں کا جو اس غریب کی شادی کروا رہے
ہیں۔“

”جلدی آؤ آنکھ، ورنہ میں بھی لیٹ
ہو جاؤں گا۔“ مشارب اس کی مشکل اس کے چہرے
سے بھانپ جاتا۔ ماں اور بہن کو تو ان کی بے پروا
طبیعت پہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے ہی جلدی کرنے

رات ن چائے کی سب و سیا پر پہن میں برسوں سے
 اٹھتے اکثر ٹھنڈی ہی ہو جاتی تھی اور جب وہ تھکی
 ہماری کمرے میں آتی تو مشارب کو بھی اس کی حالت
 دیکھ کر ترس آنے لگتا۔ سارے گلے شکوے بھلا کر وہ
 اس کی دلجوئی کرتا اور وہ اسی میں ہی خوش ہو جاتی
 تھی۔

☆☆☆

آج اتوار تھا۔ جس کے باعث اس کی آنکھ
 زیادہ سے کھلی۔ اس نے اٹھ کر چمن کی راہ لینا چاہی
 تھی، مگر مشارب نے ڈپٹ کر دوبارہ سونے کا حکم دیا
 کہ اک دن تھوڑا لیٹ ناشتا بنے گا تو آفت نہیں
 آجائے گی۔ مشارب کا حکم مان کر وہ لیٹ گئی تھی
 لیکن جانے کیسے آنکھ لگ گئی تھی اور اب آفت تو
 نہیں آئی تھی عارفہ بیگم زور، زور سے دروازہ
 دھڑ دھڑانے ضرور آگئی تھیں۔ وہ بڑبڑا کر اٹھی تھی۔
 دروازہ کھولتے ہی اسے عارفہ کی غصیلی صورت نظر
 آئی تھی۔ ساتھ ہی طنزیہ لب و لہجہ۔

”جی میں بس آرہی ہوں، دو منٹ میں۔“ وہ
 جلدی سے کہہ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔
 ”بڑی مہربانی۔“ عارفہ جملہ پھینکتی چلی گئی
 تھیں۔ ”اماں! بھوک لگ رہی ہے۔“ عزیز بسکٹ
 کترتی عارفہ کو دیکھتے ہی دہائی دینے لگی۔

”مبر کر..... اٹھا کر آئی ہوں مہارانی کو، کچھ
 زیادہ خمرے ہو رہے ہیں۔ پر پرزے نکال رہی ہے
 اپنے۔“

”وہ تو نکالے گی، آخر پڑھی لکھی، کمانے والی
 بہو ہے آپ کی..... بھائی کو بھی سارے جگ میں یہ
 ہی ملی تھی۔ پتا تو ہے پڑھی لکھی، کمانے والی لڑکی کے
 کتنے خمرے ہوتے ہیں۔ آٹھ ماہ ہو گئے بھائی کی
 شادی کو، بھابھی بیگم آج تک ہمارے پاس زیادہ دیر
 بیٹھنا گوارا نہیں کرتیں۔“ عزیز بھی شروع ہو گئی تھی۔

”ارے بیٹھے گی کی، سارا دن تو آؤں میں
 ہوتی ہے، پھر آ کر کھانا بناتی ہے، ٹائم ہی کہاں ہوتا

منہ سے نکل لیا۔ تعریبی جملوں پہ جبر کا منہ بھی
 ”سب کی بھابھی گھر کے کام کاج کر
 لیکن چھوٹی نند کو بہنوں کی طرح پیار بھی کر
 اک ہماری بھابھی ہیں، مزاج ہی نہیں ملتے
 ذہنیت کے حساب سے عظیم شکایت کر رہی
 شکایت کرتے وہ پھول گئی تھی کہ اوروں
 بھابھی کا ہاتھ بھی بیٹائی ہیں۔ اس کی طرح سا،
 پلنگ نہیں توڑتیں۔ دوستی کرنے کے لیے آ
 پاس وقت نہیں تھا تو اس نے کون سا اپنا سمجھ کر
 خیال کیا تھا۔

”کم گو بھی نہیں ہے کہ جب اسے گھر
 کے بچ ہوتی ہے تو خوب سنتی بولتی ہے۔ جس
 سامنے ہی منہ سجا کر رکھتی ہے۔ ٹھیک ہے آ
 آنے سے اک فائدہ ہوا ہے کہ ہمارے گھر
 اخراجات بڑے اچھے سے چلتے لگے۔ ورنہ
 مشارب کی تنخواہ سے تو دال روٹی ہی پوری
 تھی۔ اب تو خیر سے مرغی، مچھلی کے مزہ
 کر رہے ہیں۔“ عارفہ کو بھی بچ نظر آ رہا تھا۔ و
 آنکھ کی خوبیوں سے قائل ہونے کے باوجود آ
 اہمیت دینے کو تیار نہیں تھیں۔

”آنکھ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ جب تک ناش
 کی آنتیں قل پڑھ لیں گی۔ ایسا کرو ناشتا نہ بنا
 مشارب سے کہو، بخشنے کے ہوٹل سے حلوہ پوری
 آئے۔“ آنکھ چمن کو جاتی نظر آئی تو کہیں
 باتیں نہ سن لے اس خیال سے عزیز کا ہاتھ دبا کر
 خاموش رہنے کا سگنل دے کر عارفہ نے آ
 مخاطب کیا۔

”جی بہتر!“ اس حکم شاعی کو ساعت فر
 آنکھ نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ ان کی زبا
 چٹکارہ چاہے تھا اور انہوں نے آنکھ کے کندہ
 بندوق رکھ دی تھی۔

”مشارب!“ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ حشکر
 نیند پوری کرنے کے لیے اسے بھی اک ہی در

سین عارفہ کا حتم تھا سوسیل لازم سی۔ تھوڑا سمسار ل
مشارب اٹھ ہی گیا تھا۔ اس نے عارفہ کا پیغام
پہنچایا۔

”اماں سے کہو، نادر سے منگوا لیں۔“

”انہوں نے آپ کو کہا ہے۔“ وہ دھیسے سے
کہہ گئی تو مشارب بھی اٹھ کر فریش ہونے چلا گیا۔

”اک دن سونے کو ملتا ہے، مگر اس گھر میں وہ
بھی نصیب نہیں۔ نادر دو بجے سے پہلے نہیں اٹھتا،
لیکن اماں کو بھی میری اک دن کی نیند خراب کرنی
تھی۔ اب مہینے کے آخر میں حلوہ پوری کی
فرمائش..... میرے پاس تو یہ ڈیڑھ سو سی پڑے
ہیں۔ پیٹرول کے لیے رکھے ہوئے تھے۔“ مشارب
بہت جھنجھلا کر اپنے والٹ میں موجود پیسے نکال کر دیکھ
رہا تھا۔

”زیادہ دیر سونا صحت کے لیے اچھا نہیں ہے
جناب! آج ہم ساتھ ناشتا کریں گے اور تھوڑی
باتیں بھی کر لیں گے، روز تو آفس بھاگنے کی جلدی
ہوتی ہے دونوں کو..... جائیں لے آئیں حلوہ
پوری۔“ بجائے اس کے کہ وہ اس کی سوچ کے
دھاگے کو انگی پھلیٹ کر اس کے گھر والوں کو اس کے
سامنے ادھیڑ کر رکھ دیتی، اسے شانت کرنے کو سمجھ
داری سے بات بنا کر اپنے پرس سے پانچ سو کا نوٹ
نکال کر اس کے والٹ میں رکھ گئی۔

”مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا آئکہ جب تم گھر
کے اخراجات کے لیے اپنے پیسے دیتی ہو۔ جب تم
نے جب جاری رکھنے کی بات کی تو میں نے بھی
اجازت دے دی کہ میں قابلیت کو دبانے والوں میں
سے نہیں، لیکن مجھے احساس ہے تم گھر اور آفس میں
کس قدر تھک جاتی ہو۔“

”یہ صرف آپ کا ہی تو گھر نہیں مشارب، میرا
بھی تو ہے اور اپنے گھر میں پیسے خرچ کرنے یہ کیسا
انسوس..... ہاں تھکن تو ہو جاتی ہے، لیکن جب آپ
اس تھکن کا احساس کرتے ہیں تو میری ساری تھکن

”چھوڑ دو جواب..... ہمیں ملکان دیکھ
انسوس ہوتا ہے۔ کتنی بار اماں سے کہا غبر کو گھر کے
سکھائیں، لیکن.....“ مشارب کو سب نظر آتا تھا۔
اس کی طرف داری کر کے بھی دیکھ چکا تھا۔ عار
غبر، نادر اپنے نام کے ایک تھے، الٹا منہ بجا کر
مان جاتے تھے۔ تب سے آئکہ نے اسے سختی۔
طرف داری سے منع کیا تھا۔

”چھوڑ دوں گی، تھوڑی سی سیونگ ہو جا۔
پھر چھوڑ دوں گی، تاکہ ہمیں کوئی پریشانی نہ ہو۔“
اسے بہلانے لگی تھی۔

”مشارب! حلوہ پوری زیادہ لانا، تمہارا
بہنیں بھی آ رہی ہیں۔“ وہ نکلنے لگا تو چیخے سے عار
بیگم نے آواز دی۔

”اماں! آج تو آئکہ کو اسنے میکے جانا
ڈیڑھ ماہ بعد۔ آپ عظمیٰ اور انجم کو اگلے ہفتے آ۔
کہہ دیتیں۔“ مشارب کو سن کر اچھا نہ لگا۔ رات
اس نے بتایا تھا کہ وہ آئکہ کو اس کے میکے
جائے گا اور اب عارفہ کا پیغام اس کا منہ بگاڑ
آئکہ بھی دہلیز پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔

”اب بچیاں آنا چاہ رہی ہیں تو کیا کہہ کر
کر دیتی کہ بھیجی بھابھی میکے جا رہی ہے مت آؤ۔
تمہاری بیوی کو جانا سے تو لے جاؤ۔ کس نے
ہے۔ کھانا دانا پکا کر چلی جائے اپنی ماں کے
ویسے بھی کون سا میری بیٹیوں کے ساتھ ہستی!
ہے۔“ عارفہ برا مان کر کہہ گئیں۔

”نہیں اماں! میں اگلے ہفتے چلی جاؤں گا
کوئی بات نہیں مشارب۔“ مشارب نے کچھ کہ
ارادہ کیا تو آئکہ نے لجاجت سے اشارہ کر
ہوئے کہا۔ وہ چپ کر کے چلا گیا تو آئکہ نے
کچن کی راہ لی کہ جائے تو بیٹا تھا۔

”کتنی ہوشیار ہیں بھابھی، خود کچھ نہیں کہتے
بھائی کو وکیل بنا کر گھڑا کر دیتی ہیں۔“ غبر کا منہ
ہوا۔

ہوتی ہیں۔ لھاٹ لھاٹ کا پانی پینے والی سب جانتی ہیں کہ کس کو کیسے قابو میں کرنا ہے۔ سب بتا ہے انہیں۔ پڑھی لکھی لڑکیاں ایسی ہی ہوشیار ہوتی ہیں۔ خود اچھی بنی رہتی ہیں۔“ عارفہ نے جل کے کہا۔ سیدھے سادھے بیٹے کا بیوی کی طرف داری میں منہ کھولنا انہیں گراں گزرا تھا۔

جب تک مشارب حلوہ پوری لے کر آیا تب تک دونوں بہنیں اپنے چار، چار بچوں کے ساتھ آگئی تھیں۔ دو کمروں اور اک اسٹور میں جگہ تنگ پڑنے لگی۔ نادر تو بچوں کی آواز سے اسٹور کا دروازہ بند کر گیا کہ اس تک ان کی آواز نہ آئے۔ لیکن جب پسینے میں شرابور مشارب نے حلوہ پوری کا شراب پچن کی دہلیز پر کھڑی آنکھ کو تھمایا تو شراب شیف پر رکھتے وہ پانی کا گلاس اسے تھما گئی۔

”اتنی لمبی لائن، چیخ چیخ کے مٹا چھل گیا۔ چھٹی کے دن جیسے آدمی دنیا حلوہ پوری لینے پہنچ جاتی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ میں ناشتا نکالتی ہوں۔ آپ بہنوں سے مل لیں تب تک۔“ وہ اچھی بہو اور بھابھی کا رول بہت اچھے سے نبھاتی تھی کہ اس کی فطرت اچھی تھی۔

”پہلے منہ ہاتھ دھو کر چیخ کر لوں، عجیب سی اسمیل آرہی ہے۔“ مشارب اس کا اشارہ سمجھ کر اتفاق کرتے ہوئے کمرے میں چلا گیا تھا۔

”یہ مشارب کیوں کمرے میں ٹھس گیا۔ بہنیں آئی بیٹھی ہیں، اسے بہنوں کا حال پوچھنے کی بھی توفیق نہیں۔“ آنکھ بچوں کو سانڈ پر ہونے کا کہہ کر تھک گئی تھی۔ پیار سے پکڑ پکڑ کر سب کو دسترخوان سے دور کر رہی تھی، لیکن بچے ہیں کہ دسترخوان پہ اچھل کود کر رہے تھے۔ انہیں بمشکل قابو کر کے چیزیں رکھ رہی تھی۔ جب عارفہ نے ناگواری سے کہا۔

”رہنے دیں اماں، شادی کے بعد بھائی بدل گئے ہیں۔ ورنہ پہلے میرے بچوں پر جان چھڑکتے

ہیں۔“ سسئی منہ بسور کر کود میں بیٹھی جی کو بلا سینے سے لگا کر دکھی ڈائلاگ میں رنگ بھرنے لگی۔ ”ایسی بات نہیں ہے عظمیٰ آپ۔ وہ دھوپ ناشتا لے کر آئے ہیں تو پسینے سے بھگ گئے۔ چیخ کر کے آرہے ہیں۔“

”مشارب سے اک سال ہی بڑی، بہن۔ جلدی شادی ہوگئی تو چار بچے بھی ہو گئے۔ تو اخیر سے ماسٹرز کیا ہے۔ چار، پانچ ماہ میں سے چھوٹی ہوں گی اور پھر جب میں نہیں بھا بھی ہوں تو تم بھی میرا نام ہی لیا کرو۔ باجی، آپ میٹر رکھا ہے۔ عزت تو دل میں ہونی چاہیے۔“ لالچا بحث کر کے وہ کسی قسم کا ٹینشن نہیں چاہتی تھی، لیے بہتر کہہ کر سر ہلا گئی۔ گوکہ بات اس کی عمر پر آ تھی۔ درپردہ وہ اسے مشارب سے بڑا ظاہر کر رہی اور خود کو بھی چھوٹا۔ اگر اسے چھوٹا بن کر خوشی تھی بڑا پن دکھائی اور یوں اک محاذ کھلنے سے پہلے اس نے بند کر دیا تھا۔

عظمیٰ کو وہ ہمیشہ عری بڑی لگتی جب مشارب اک دن سر راہ آنکھ کو دیکھا اور اس کے گھر تک کر کے ماں، بہنوں کو رشتہ لے کر جانے کا کہہ آنکھ کے گھر سے آتے ہی سب نے بڑی سے، پڈ ہے، کہہ کر ریجیکٹ کرنا چاہا۔ وہ چوبیس سال کی مگر وہ سب ماننے کو تیار ہی نہ تھیں، لیکن مشارب پیچھے نہ ہٹا تو سب کو ہاں کرتے ہی بنی۔ اسی دن مشارب آ گیا اور بہنیں جو تھوڑی دیر پہلے گلہ کر رہی تھیں بھائی کے واری صدقے ہونے لگیں کہ اس گھر کا وہی اکلوتا کماؤ پوت تھا۔

حلوہ پوری کی خوشبو سے نادر بھی اٹھ کر آ اور بنا ہاتھ، منہ دھوئے حلوہ پوری نوش فرمانے ا جب تک آنکھ چائے بنا کر لائی تب تک سب ج ہو گیا۔

”ارے مشارب، تمہارے پاس پوری ترکاری ہے، منی کو دے دو اور مانگ رہی ہے۔

مشارب حسین نے اپنے حصے میں سے آنکھ کے لیے بچا کر ساندپہ رکھا ہوا تھا۔ وہ بھی عارفہ بیگم کی نظروں میں آ گیا۔ مشارب نے اک بے چاری سی نگاہ آنکھ پہ ڈالی۔

”اماں، آنکھ نے ذرا بھی نہیں چکھا۔“

”اے تو کیا ہو گیا..... اسے کل پھر لا دیتا.....“
 ”بہنیں کون سا روز، روز آتی ہیں۔“ عارفہ کو برا لگا تو آنکھ نے جھٹنا شتا اٹھا کر سامنے رکھ دیا۔

”کھانے میں آلو مٹر کی طاہری بنا لو۔ بچوں کو بہت پسند ہے۔“ وہ دسترخوان سمیٹ رہی تھی، جب عارفہ کا فرمان جاری ہوا۔ ”بھابھی بیف بھی ڈالیے گا، بوٹی کے بنا نوالہ نہیں اترتا حلق سے، میرے بچوں کا۔“ انجم کیوں کسی سے پیچھے رہتی۔ مشارب لب بھینچے بیٹھا رہا۔ جانے اس کی ماں، بہنیں فرمائش کرتے گیوں نہیں سوچتی تھیں کہ وہ لاکھوں نہیں کماتا اور جب اک بار پھر آنکھ نے سودا لانے کے لیے اپنے پرس میں سے پیسے نکال کر دیے تو مشارب کو غصہ آ گیا۔

”ہو جائے گی اچھی سیوینگ تمہاری۔“

☆☆☆

وہ سب سر جوڑے زمانے بھر کے قصے باتیں کر رہی تھیں۔ آنکھ پاشٹے کے برتن دھونے کے ساتھ طاہری بنا رہی تھی۔ مشارب کچھ دیر ماں، بہنوں کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

بچن کے سامنے سے گزرتے اس نے آنکھ کو اپنی خدمت پیش کی۔ اس نے مسکرا کر اسے آرام کرنے کو کہا۔ لیکن وہ پھر بھی اس سے بات کرنے کی غرض سے اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ مسالا جات کے ڈبلوں کی طرف بڑھتے تو اس سے پہلے مشارب اسے تھما دیتا۔

”ارے بھابھی، کیا زن مرید بنا دیا آپ نے میرے بھائی کو، اگر آپ کو ہمارے لیے ایک وقت کا

کو آواز دے بیٹیں۔ بھائی سے کام کروانے کی ضرورت تھی۔“
 ”عظمیٰ بچن میں راکنڈ لگانے آئی تو یہ منظر کر بولنا نہ بھولی۔“

”میں کام نہیں کر رہا آپا۔ کھڑا کر رہا ہوں۔ اور پھر بیوی کی مدد کرنے پر کیسی شرم“
 ”اوہو! بھئی معاف کر دو، تمہیں تو برا ہو گیا۔ لیکن ایسا پہلی بار دیکھا تو کہہ دیا۔ ہمارے باپ، دادا کب بیوی کے پیچھے بچن میں گھسے، تھے اور بات کرنے کی بھی تم نے خوب کہی۔ ماہ ہو گئے شادی کو تم لوگوں کی باتیں ہی ختم ہوئیں کہ کسی آئے گئے کا ہی لحاظ کر لو۔“
 ”عظمیٰ کہتی چلی گئی تھی۔ مشارب کے ماں لکیریں پڑنے لگیں۔“

”پلیز مشارب، آپ ٹھنڈے ہو جائیں بڑی ہیں۔ کہہ گئیں اپنی سمجھ کے مطابق۔ آسمجھ دار ہیں نا۔ نظر انداز کر دیں اور جا کر آرام میں کام ختم کر کے آتی ہوں۔ آپ کے پاس آنکھ نے اسے چٹا کرنا چاہا کہ مبادا کوئی اور لے، نیا تماشا نہ کھڑا کر دے۔“

”ساری دنیا منہ پھٹ ہے۔ جو جی میں ہے بدل لٹاؤ سے کہہ جاتے ہیں۔ اک میں نے نے ہی ٹھیکالے رکھا ہے چپ رہنے کا۔ عزت کا۔“

مشارب بچن سے چلا گیا تھا۔ آنکھ افسوس ہوا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس کا خیا تھوڑی دیر سنانے کے لیے لیٹ جائے گی۔ کچھ کچھ بھی لگ رہی تھی۔ مگر دھوپ بھرے صبح مشارب کو چمک پھیریاں لگاتے دیکھ کر اسے تڑپ ہوئی۔ دونوں نندوں کے بچوں کو آرام سے۔ پر آڑے ترچھے سوتے دیکھ کر اسے مشارب پریشانی کی وجہ سمجھ آ گئی۔ کچھ بچے کارپٹ پر سو رہے تھے۔ بانی وہ سب تو دوسرے کمرے

ڈسلس کر رہی تھیں۔

”دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ بھئی کچھ بھی کہو یہ نوکری کرنے والی لڑکیاں ہونی بڑی شاطر اور بے حیا ہیں۔ میٹھی بنی رہتی ہیں۔ خود جواب نہیں دیتی مشارب کو آگے کر دیتی ہے۔“ وہ آنکھ کی درگزر والی فطرت کو چالو، ہوشیار کہہ رہی تھیں۔ نادر تھوڑی دیر ان کے ساتھ بٹھارہا تھا پھر اسٹور میں بند ہو کر گھٹت کو کال ملا کر پیکیج پورا کرنے لگا۔

”چلیں ہم چھت پر بیٹھ جاتے ہیں۔“

آنکھ اس کے پاس آ کر رسانیت سے کہہ رہی تھیں۔

”اتنی دھوپ میں چھت میں جا کر اپنے اور تمہارے کباب بنوانے کا کوئی شوق نہیں مجھے۔“ مشارب جلا ہوا تھا۔

”اوہو..... آپ چلیں تو۔“ آنکھ اسے زیر دستی لے آئی گو کہ شام میں ابھی تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی مگر چھت پر دھوپ بھری پڑی تھی۔ چٹائی کے ساتھ دو بڑی بڑی چادریں ساتھ لے آئی تھی۔ چٹائی بچھا کر اک چادر اس کے اوپر بچھا کر دوسری چادر کو منڈیروں پر پڑی کیلوں سے باندھتے دیکھ کر مشارب بھی اس کا ساتھ دینے کو ڈوری باندھنے لگا تھا۔ ان کا چھوٹا سا گھر تیار ہو گیا تھا۔ جس پر انہیں بعد میں سننے کو بھی ملا کہ فلمی سین چھت پر چل رہا ہے۔

”توہ! کیا فلمی سین چل رہا ہے چھت پر۔“

بھابھی، بھائی کے بازوؤں پر سر رکھے کھٹی ہوئی ہیں۔ غمزدہ پاؤں میڑھیوں سے سارا منظر دیکھ آئی تھی۔ اسے پتہ زمین کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جس کی پیش نے چٹائی کو بھی دھکا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان دونوں کی پشت جلنے لگی تھی۔ نکیہ نہ ہونے کے باعث مشارب نے اپنے سر کے پیچھے رکھے دوسرے بازو پر آنکھ کو زبردستی لٹالیا تھا کہ وہ تپتی چٹائی پر ہی سہی تھوڑی دیر کمر تو سیدھی کر لے۔ بچوں کی نیند خراب نہ ہو اس لیے وہ کمر ابدر ہو گئے تھے مگر

کہانی کو دوسرا رنگ دیا جا رہا تھا۔

”دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ شرم و حیا ڈگر لیتے بیچ ڈالی ہے۔ مرن جوتی نے..... ان ہی اداؤ پر تو مشارب اس کی مٹھی میں ہے۔ غمزہ تو اس کے آس پاس بھی نہ پھٹکتا۔“ عارفہ بیگم جلال میں آگئیں۔

”میں کب جانی ہوں ان کے پاس..... مگر ان کے سائے سے بھی دور، آپ کے پاس رہے ہوں ہر وقت۔“ غمزدہ سے ہامی بھری۔

”آپ نادر کی شادی کر سں اب..... مجھے آئے گی تو کچھ تو بہتر ہوگا اس گھر کے لیے... ہمارے مزاج کی ہے۔ کم سے کم سے ہنسی بولتی ہے۔ ادھر تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ بھابھی آگئی۔ آٹھ ماہ سے، لیکن گھر پر نظر آئے تب تا صبح کی رات کو مردوں کی طرح آتی ہے۔ بیچ کہوں تو بیچ بڑی شرم آتی ہے۔ جب ناصر مجھے یہ کہہ کر چڑا۔ ہیں۔“ انجمن نے اپنے میاں کا دکھڑا دیا۔

”ذلیل کروا کے رکھ دیا ہے مشارب۔ ہمیں۔ خود نوکری کروا رہا ہے بیوی سے پتا ہی نہیں چلتا۔ کہاں جاتی ہے اس کی منخواہ اور مفت میں بدنام ہو رہے ہیں کہ بیوی کمائی کھا رہے ہیں۔ برہمنی بات ہوئی کھایا، پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا یا۔ آنے۔ کرنی ہوں مشارب سے بات کہ بھئی یہ منظر یہاں نہیں چلنے کے.....“

☆☆☆

جب رات کو بہنیں کھاپی کر چلی گئیں مشارب کو بٹھا کر عارفہ نے جب اس منظر کا پس منہ جاننا چاہا تو مشارب کے کان کی لوہیں سرخ ہو گئیں۔ ”یہ رنگ ڈھنگ یہاں نہیں چلنے وا۔“ مشارب میاں۔ کوئی کرائے کا گھر ڈھونڈنا اور۔ جاؤ اپنی سلی کو دور..... پھر درختوں کے سائے میں لہرا کر گانے گاؤ ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے میں نے حمیدہ سے بات کر لی ہے۔ دو ماہ بعد نادر شادی کر رہی ہوں، گھر میں دو ہی تو کمرے ہیں

بیوی، نادر اسٹور میں پڑا رہتا ہے۔ اب بیوی کے آنے کے بعد وہ اسٹور میں تو نہیں پڑا رہے گا نا..... تمہارا دالا کمرہ اسے دوں گی..... چاہتی تو نادر اور نگہت کو ہی کرائے کے گھر میں بھیج دیتی۔ مگر کیا کروں کہ نگہت میری بہن کی بیٹی ہے۔ مجھے پتا ہے وہ کتنی سیدھی سادی ہے۔ تمہاری بیوی کی طرح مردوں کے بیچ کام کرنے والی دیدہ ہوئی عورت تو ہے نہیں۔ وہ تو معصوم ہے۔ اسے لوگوں کا کیا پتا..... اس لیے تم لوگ اپنا بندوبست کر لو۔“

عارفہ کے ایک دم فیصلے پر مشارب کچھ بوکھلا گیا۔ تب ہی ان کی قابل گرفت باتوں پر بھی کچھ نہ بول سکا۔

”گھر کا راشن اور بجلی، گیس کے بل بس ٹائم پر دے دینا مجھے اور مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ جاؤ خوش رہو، تم دونوں۔“

عارفہ کے شاہانہ انداز پر مشارب کے ماتھے پر لکیریں پڑنے لگیں۔

”اماں میری تنخواہ اتنی نہیں کہ میں یہاں کا راشن، گیس، بجلی کے بل اور اپنے گھر کا کرایہ اور باقی کے اخراجات اٹھاؤں۔“

”اور جو تمہاری بیوی کما رہی ہے۔ وہ کس کو بھرتی ہے؟“ عارفہ چمک کے بولیں۔

”اس کی کمائی ہے اس کا اختیار ہے وہ کہاں خرچ کرے۔ لیکن وہ اکثر اپنے پیسے گھر پر لگاتی ہے۔ غبر کے کالج کی فیس بھی اس نے دی تھی۔ جب آپ فیس نہ ملنے کا شور کر رہی تھیں شادی کے لیے جو کمیٹی ڈالی وہ بھی اسی کے پیسوں سے بھر رہا ہوں۔“

”بس کرو اپنی بیوی کی مدد سرائی۔ مجھے مت سناؤ۔ مجبوری ہے جو میں دو بہوؤں کو ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ نادر کی کوئی اچھی نوکری لگ گئی تو تم صرف اپنے اور اپنی بیوی کے خرچے اٹھانا۔ ہم یہ خرچ کر کے احسان نہ کرنا۔“

بیوی کی مہربانیاں گنوا تا مشارب انہیں بے حد

”اس وقت جب کہ اسے آپ لوگوں کی ضرورت تھی۔ آپ لوگ اسے خود سے دور کر پلان کر رہے ہیں۔“

نادر کی شادی کچھ عرصہ بعد میں تو ہو سکتی۔ جب تک وہ کسی اچھی نوکری پر نہیں لگ جاتا۔ پیسے جمع کر کے ہم چھت پر کمرے بنوا لیں گے۔ ساتھ رہیں گے۔“ مشارب نے دانائی سے کہا۔

”مجبوری ہے حیدرہ نہیں مانے گی۔ دو بنوا سکتے ہو کمرے تو بنوا لو۔ ورنہ کرائے ا ڈھونڈ لو۔“ عارفہ کے شاہانہ انداز پہ مشارب ا گیا۔

☆☆☆

”آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے۔“ اس کی پریشانی پر دل اسادیتی آنکھ خود بخود تھی۔ اس کے گھر خوش خبری آنے والی تھی۔ ج پیش نظر اس کی طبیعت گری گری رہنے لگی۔ نوکری چھوڑنے کا سوچ رہی تھی لیکن عارفہ اچانک فیصلے نے اس اپنی سوچ بدلنے پر مجبور۔ مشارب کو گھر والوں کی بے بسی جیسے لگی تھی۔ ادھر نادر کی شادی کی شہنائیاں بجنے لگی۔ ادھر وہ اپنا ساز و سامان بیچنے لگے۔ ایک بہو کو کے لیے دوسری بہو کا گھر اجاڑنا شاید ضروری تو ہو جو زیادہ بڑھی لکھی اور نوکری کر کے دو پیسے کے گھر کی کفالت میں خاموشی سے جیہ ڈالتی۔ پیسے کی نوکری سب کی جی حضور کر رہی تھی۔

آنکھ کی فیکلی نے جب ان کی پریشانی سب نے ہی گھر دیکھنا شروع کر دیا اور اتفاق آنکھ کے گھر سے نزدیک ہی مل گیا تو مش ڈھارس ہوئی ورنہ انجینی محلے میں آنکھ کو لے کر پھر وقت بے وقت ایمر جنسی کی صورت میں اب میں ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جانا پڑتا۔ نئے گھر میں جیسے تیسے سامان رکھ کر نادر کی شادی میں شرکت کر رہے تھے۔ اور آ

اسے چھڑ گئی۔

”دو کیوں، چار ہوں گے۔“ وہ اصرار کرنے لگا
 ”کوئی نہیں۔“ آٹکھ مسکرا کر چوہری اتا
 لگی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اس کا موڈ بدل گیا تو

☆☆☆

”اتنی عمر ہو گئی ہے لیکن آپ کو ذرا تین
 میرے کمرے کا دروازہ بجا کر میری نیند خراب کر
 آپ ارشاد فرما رہی ہیں کہ میں آپ اور آپ کی بیٹی
 لیے ناشتا بنا کر دوں۔ آپ کے با آپ کی بیٹی کے
 ٹوٹ گئے ہیں جو میری نیند خراب کی.....؟ اور اس
 فہمی میں مت رہیے گا کہ میں آپ لوگوں کو پکا،
 کھلاؤں کی..... اپنی ہڈ حرام بیٹی کو بھی کام کی
 ڈالے جو سارا دن نجانے کنٹوں سے چیٹنگ
 رہتی ہے اور آئندہ سے میرے کمرے کا دروازہ
 بجائیے گا۔ میں گہمت ہوں۔ آٹکھ نہیں۔“

شادی کو کئی روز ہو گئے تھے عارفہ کو صبح
 میں آٹکھ کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ چند دن تو غم
 انجم رک گئی تھیں تو الٹا سیدھا کچھ نہ کچھ ناشتے
 پرل ہی جاتا تھا لیکن رات بیٹیاں چلی گئیں تو
 نے عادتاً دروازہ بجا دیا۔ ان کا خیال تھا گہمت
 ناشتا بنائے گی کہ بڑی سکھ رہی (ان کے خیال
 لیکن گہمت نے دروازہ کھولتے ہی جس طرح کی
 استعمال کی اس پر عارفہ جہاں دنگ رہ گئیں وہ
 بھاگ کر اپنے سہل فون کو صاف کرنے لگی۔ دوا
 کی گئی باتیں۔ رشتہ بدلتے ہی رنگ بدل گیا تھا۔

”مجھے سکون نہیں ہے اماں..... ہر
 کھانے پینے کو مری رہتی ہے۔“ ادھر کھلے دروازے
 سے نادر کی بے زار شکل نظر آئی۔ بیوی کی باتوں
 فیض یاب ہو کر اس نے جملہ پھینکا تھا۔ اس
 حسب عادت بات کے اختتام میں اس کے منہ
 گالیاں ٹپکنے لگی تھیں۔ نیند خراب ہونے پر۔
 گہمت فاتحانہ انداز میں عارفہ کے چہرے
 دیکھ رہی تھی۔ عارفہ پلنگ پر آ کے ڈھکے گئی تھیں

حد خوش تھے۔ جب کہ اس کی شادی میں سب کے
 منہ ہی سیدھے نہیں ہو رہے تھے۔ ہمیشہ پیسوں کی کمی
 کا رونا روٹنے والی عارفہ بیگم چھوٹے بیٹے کی شادی
 میں ساری جمع پونجی لگائے بیٹھی تھیں کہ گہمت ان کی
 من پسند ہو گئی۔ غبر کے لیے رکھا سیٹ بھی نادر نے
 گہمت کے لیے بری میں رکھوا دیا تھا کہ نوکری ملتے ہی
 غبر کے لیے بنوادے گا اور عارفہ کو چھوٹے بیٹے کے
 خرچے اٹھانے سے فرصت نہیں تھی۔ آٹکھ سب دیکھ
 رہی تھی لیکن چپ تھی۔

”جانے ماں میں بچوں میں اتنا تضاد کیوں رکھتی
 ہیں اگر مجھے بچپن یاد نہ ہوتا تو شاید ابھی میں احساس
 کمتری میں بیٹھا ہوتا کہ میں سگا بیٹا نہیں۔ جانے
 رشتوں میں یہ ہر رنگ کیوں نظر آتا ہے۔“

شادی سے واپس آ کر مشارب پھیکے لہجے میں
 کہہ رہا تھا۔ اس کے دل کو ٹھیس لگی تھی۔ دور پرے
 کے مہمانوں کی طرح وہ شادی اینڈ کر رہے تھے کہ
 کوئی آٹکھ کو اہمیت دینے کو تیار ہی نہ تھا۔ بڑی بہو اور
 بڑی بھابھی کی حیثیت سے۔

حقیقتاً انسان اپنوں کے دوہرے رویوں سے
 ٹوٹ جاتا ہے۔ مشارب بھی دل گرفتہ ہو گیا۔
 ”اتنے سمجھ دار ہو کر بچوں جیسی باتیں سوچ
 رہے ہیں۔“ آٹکھ نے اس کے بال بکھیرتے اس کا
 دھیان بٹانا چاہا۔

واجبی شکل و صورت والی، مڈل فیل گہمت کی ناز
 برداری دیکھ کر اس کا دل بھی برا ہوا تھا۔
 ”آٹکھ! ہمارے جتنے بھی بچے ہوئے نا، ہم
 سب کے لیے ایک جیسا سوچیں گے۔ نہ کسی کے
 لیے کم، نہ کسی کے لیے زیادہ۔“

اس نا انصافی پر مشارب کا دل شاید زیادہ ہی
 دکھا تھا کہ اس کے اور نادر کے درمیان فرق رکھا تھا۔
 ”آپ بے فکر رہیں۔ ہم اپنے تمام بچوں میں
 مساوی سلوک رکھیں گے اور ”جتنے بھی“ سے کیا
 مطلب..... بس دو ہی بچے ہوں گے۔“

روٹی وہ دونوں سے معافی مانگنے لگیں۔

”میں نے آپ کو ہمیشہ اپنی ماں جتنی ع دی۔ میری تربیت ایسی نہیں کی کہ اپنی ماں سے بد کروں۔ مشارب سے جڑا ہر شخص میرے لیے ہے۔ ان کی خدمت، ان کا خیال رکھنا میرا فرض میرے والدین نے شعور کے لیے تعلیم دلوائی، شوق سے کوئی بھی شادی سے پہلے لیکن جب ان کے بعد مشارب کو قرضوں میں جکڑے دیکھا۔ ا گھر کی کفالت کرتے پایا تو ان کا ساتھ دینے آپ سب پر اپنا سمجھ کر خرچ کرتی ہوں۔ کہ سچ ہے۔ اکیلا انسان دنیا میں جنگل کی طرح ہے۔ فیکلی ہماری طاقت ہوتی ہے۔ مانی، داد، روپ میں بچے کو اک سائبان ملتا ہے۔ ہم آپ الگ ضرور ہیں لیکن میں چاہوں گی کہ میرے بچہ دادی کا پیار نصیب ہو۔“

”میں کم ظرف، نادان تھی جو میرے کو پتہ رہی۔ اچھا بیٹا اور اچھی بہو ہر کوئی نہیں بن سکتا صلاحیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔“ ان کے کہنے سے پہلے وہ ان کی حالت سب کچھ جان گئے تھے۔ ہر وقت بنی سنوری کے ساتھ ہی چپکلی سیل فون میں لگی غبرگت اور کے کپڑے دھو رہی تھی اور وہ دونوں کمرے میں کر رہے تھے۔ ہر وقت زبان سے گولے داغے عارفہ سوچ سوچ کے بول رہی تھیں۔

نادر اور گتھ کی بدتمیزیوں کی داستان مشارب ان سے بات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن نہیں چاہتی تھیں کہ وہ بڑا ہو کر ان بدتمیزیوں سے اعزنی کروائے جنہیں بات کرنے تک کی تمیز نہیں تھی۔ ”ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔“ کا کھانا پینا الگ کروں گی۔ بس تم دونوں لو واپس..... میں اور غبر اسٹور میں شفٹ ہو جاؤں گی جب پیسے ہوئے تو اوپر کمرہ ڈالو الیٹا۔ غبر کو ان سا زندگی یہاں رہے گی۔ گل کو اس کی شادی کرنی۔

قوت برداشت کا احساس ہوا تھا۔ انہیں اپنی ساری کوتاہیاں، غلطیاں یاد آ رہی تھیں۔ ہمیشہ نادر کو چھوٹا کہہ کر آرام دینے والی ماں کو آج وہ بیوی کا ہو کر گالیاں دے رہا تھا۔

مشارب کوئی بھی چیز لاتا تھا۔ تو آنکھ کو تھما کر سب کے لیے نکال لانے کو کہتا تھا اور وہ اس کے کہنے سے پہلے خوش دلی سے دسترخوان بچھا لیتی تھی اور نادر چیز لے کر کمرے میں محسوس جاتا تھا۔ اور تم یہ کہ گتھ کا چاٹ کھانے کو دل ہے۔ پکڑوں، سموسوں کی وقت بے وقت کی فرمائش پوری کرنے کے لیے پیسے بھی عارفہ سے ہی لیتا تھا۔

آنکھ جس کے پڑھے لکھے ہونے اور نوکری کرنے پر وہ اس کی کردار کشی کرتی رہی تھیں اس نے کبھی منہ کھول کر جواب نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

مشارب انہیں خرچے اور گیس بجلی کے بل دینے آیا تھا۔ چونکہ آفس سے واپسی میں آیا تھا تو آنکھ بھی ساتھ تھی۔ گھر کی دہلیز پر ہی آکر دونوں کو جھٹکا سالگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور پانی کی تیز دھار بہہ کر باہر روڈ تک سفر کر رہی تھی۔ دونوں سنبھل کر اندر آئے۔

صحن کا منظر بڑا عجیب و غریب تھا۔ کپڑوں کا ڈھیر گیلے صحن میں پڑا ہوا تھا۔ واشنگ مشین کے اندر میلا پانی پڑا ہوا تھا۔ مشین اپنا ٹائم پورا کر کے جانے کب سے بند ہو چکی تھی۔ مگر اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ پائپ کھل گیا تھا۔ جس کے باعث صحن پانی میں ڈوب کر چھوٹی سی جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آنکھ نے آگے بڑھ کر پائپ کا پانی بند کیا بلا ارادہ صحن سے چکن پر نظر پڑی تو گندا اسٹیا لکھن اور سنک پر پڑے گندے پرتوں کا ڈھیر دیکھ کر مشارب نے اسے اور اس نے مشارب کو دیکھا تھا۔

عارفہ اپنی پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ انہیں بخار تھا۔ غبر اسٹور سے گندے کپڑوں کا ڈھیر لیے نکلی تو ان دونوں کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ عارفہ

عارفہ اصرار کر رہی ہیں۔ اسے ماننے ہی تھی۔
عارفہ نے آئینہ سے معافی مانگی تو وہ اپنے احساسات
بیان کر گئی۔

”تمہاری ماں نے تمہاری تربیت بہت اچھے
خطوط پر کی ہے آئینہ..... لیکن اگر تربیت کا کہہ کر انسان
کی تعریف ممکن ہوتی تو مجھے اختلاف ہوتا۔ اپنے دونوں
بیٹوں کی تربیت میں نے یہی کی ہے لیکن مشارب آپنی
اچھی فطرت کے باعث میری تربیت کی لاج رکھ گیا۔
کیونکہ تربیت اکیلے بذات خود کچھ نہیں۔ جب تک
اچھی فطرت نہ ہو..... تم دونوں کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے
اچھے کے لیے اچھی بنائی گئی ہے۔“

عارفہ انہیں سراہ رہی تھیں۔ جنہوں نے انہیں
ہمیشہ عزت دی تھی۔

”شکریہ آئمہ! ایسا کئی بار ہوا جب مجھے لگا کہ
اپنوں کی زیادتی پر میں ان کے خلاف ہونے لگا ہوں
لیکن تب، تب تم نے مجھے جس طرح منی سوچ سے دور
رکھنے کی کوشش کی یہ اسی کا اثر ہے کہ آج میں سب کے
سامنے سر اٹھانے کے قابل ہوں۔ اگر جذبات میں
آکر میں ان کے خلاف ہو جاتا اور تم مجھے بھڑکانی رہتیں
تو کچھ بعید نہیں تھا میں نادرجہیسا ہی ثابت ہوتا۔“

”آپ کی بات بجا لیکن اماں نے سچ کہا کہ
انسانی فطرت ماحول اور تربیت پر حاوی رہتی ہے۔
آپ جتنے اعلا اوصاف کے مالک ہیں آپ بھی کسی
کسی بھی رشتے کے تقدس کو پامال نہیں کر سکتے.....
مجھے یقین ہے آپ پر..... آپ کے پاس بہت اچھا
دل ہے۔ جس میں سب کے لیے درو ہے۔“

”یہ تم میری تعریف کر رہی ہو یا اپنی..... کیوں
کہ تم بھی ایسی ہی فطرت رکھتی ہو بلکہ مجھ سے کہیں
زیادہ قابل تعریف ہو۔“

مشارب۔ اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔ آئینہ
مطمئن تھی کہ اس کے مزاج میں برداشت کے وصف
نے اسے آج سب کی نظر میں سرخ رو کر دیا تھا۔

☆☆

ادارہ خواتین و اہلسن کی طرف سے بیوں کے لیے عرب سرت

پس اسطرح

افش افیعی

پس اسطرح

400/- قیمت

مکملے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 735021

ادارہ خواتین و اہلسن کی طرف سے بیوں کے لیے عرب سرت

فصل غم کا

گوشوارہ

رضیہ جمیل

ادارہ خواتین و اہلسن کی طرف سے بیوں کے لیے عرب سرت

ذردموم

راحت جبین

قیمت: 1000/- روپے

ادارہ خواتین و اہلسن کی طرف سے بیوں کے لیے عرب سرت

دستِ مستحیا

مہدیما

قیمت: 400/- روپے

مکملے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 2735021

سپتیمی کر

”سلیم منزل“ کے اکھڑتے چشم و چراغ سلیم الدین کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برابری میں کرنا ہیں لیکن سلیم الدین کو اپنے والد کے دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ پسند آ جاتی ہیں۔ لیکن حمیدہ خاتون دل سے تعلیم یافتہ بہو شگفتہ بیگم کو قبول نہیں کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاجاً انتہائی بد مزاج، اکھڑ۔ ظہیر احمد کے اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں۔ شمیمہ، شکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد کے دو بیٹے عابد اور ساجد جن کی شادیاں اسما اور شمیمہ سے ہو اور تین بیٹیاں جن میں دو شکیل اور جمیل کی بیویاں ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ میا بھی جاتی ہے۔

پھر موسم آتے جاتے رہے، رتن بد لئے لگیں۔ سلیم منزل میں ابا جان، اماں جان رخصت ہو چکے تھے البتہ پھولوں اور کلیوں سے مہک اٹھا تھا۔ زیر اور شہلا گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ان کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ ہیں۔ وسیم، کلیم اور غیر کے بیٹے بیٹیاں، شگفتہ بیگم اور سلیم میاں کو دادا جان اور دادی جان کہہ کر لپٹا کرتے۔ میزہ۔ ناتا جان اور نانی جان کہتے۔

غیر اور گلشن کا ایک بیٹا سفیر اور چار بیٹیاں شفق، مہک، عاتکہ اور صبا تھیں۔ وسیم کی دو بیٹیاں عائرہ اور فائرہ ا بیٹے روحیل، فیصل اور جمیل تھے جبکہ کلیم اور نفیسہ کے دو بیٹے ہارون، شمعون اور بیٹیاں ثناء اور زیب تھیں۔ میزہ کی دو شابی اور تابندہ تھیں اور ایک بیٹا غزین تھا۔

ساجد نے شمیمہ کی اجازت سے منیبہ سے دوسری شادی کر لی تھی لیکن گھر والے اس شادی سے لاعلم تھے۔ سر شمیمہ سے تین بیٹیاں سار، زار اور عمارہ تھیں اور منیبہ سے سے تین بیٹے ارغمان، داؤد اور زین تھے۔ ساجد کے بیٹے





باپ سے ناراض رہتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے دادا کے گھر میں پہچان اور رشتے چاہئیں۔ خاص کر کے ارمغان باپ کو ناپسند کرتا ہے۔

سارا کی منگنی اسماء اور عابد کے بیٹے سعد سے ہو جاتی ہے لیکن فہد کو زارا انکار کر دیتی ہے۔ اسے فہد پسند تو خاندانی غصے اور عورتوں کو ان کا حق نہ دینے کی وجہ سے وہ فہد سے شادی کرنے سے انکاری ہے۔

ارمغان کا دوست سرد جس کی دو بہنیں ہیں، حادیہ اور سعدیہ۔ ان کے والدین وفات پا چکے ہیں۔ سعدیہ کرن ہمایوں کو پسند کرتی ہے۔

راہی اور روبیکا کی ایک بیٹی ٹی ہے جو مغربی ماحول میں بگڑ چکی ہے۔ جس کا ذمہ دار راہی، روبیکا کو سمجھتا ہے۔ ایک دوست ہے انور جس کی ان کی فیملی سے دوستی ہے۔

راہی اپنے اسٹور میں ایک پاکستانی فرجاد نامی لڑکے کو نوکری دیتا ہے جو بہت ایمان دار ہے۔ فرجاد ٹی کو دیکھا اس کو پسند کرتے لگتا ہے۔

ایک رات فرجاد راہی کے گھر پہنچتا ہے تو ٹی اس کو مدہوشی کی حالت میں گھر سے باہر لیتی ہے۔ اب آگے بڑھیں

آٹھویں قسط

”اف میرے اللہ! یہ..... یہ تو بے ہوش ہے کہیں..... کہیں..... نہیں مجھے اس سے آگے نہیں چاہیے۔ ہیلو ٹی میڈم..... ٹی میڈم ہوش میں آئیے۔ کیا کروں یار، سر کو فون کرتا ہوں.....!!“

سرد ترین رات میں فرجاد کے لیے سچو نیشن عجیب بھی ٹھی پریشان کن بھی اس نے کسی طرح گھسیٹ کر گاڑی کی بیک سیٹ پر ڈالا اور راہی کو فون کرنے لگا۔ ”خ ہوا کے جھونکے پر وہ خود بھی کانپ رہا تھا دروازہ

کے فون ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ”آخر کیا معاملہ ہوا ہے ٹی کے ساتھ اور..... وہ لڑکا..... کتنے اچھے انسان ہیں راہی صاحب ان کو

بیٹی..... کیا کہانی ہے؟“ فرجاد ٹی کو دیکھتے سوچے جا رہا تھا۔ ”یار! یہ سرفون ریسیو کیوں نہیں کر رہے۔ میرا ہے سو گئے ہوں گے پھر کیا کروں۔“

کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر دوبارہ کال ملائی۔ راہی آتش دان کے قریب اپنی مخصوص ایزی چیئر پر بیٹھا عادت سو گیا تھا۔ اور روبیکا اسے بلانے آئی تو آگ تقریباً بجھ چکی تھی۔ ٹھنڈ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خود گہرا

سے اٹھ کر آئی تھی ہمیشہ کی طرح راہی پر ناراض بھی ہورہی تھی کہ ہمیں سو جاتا ہے تو اسے اپنی نیند خراب کر پڑتا ہے۔

”راہی! اٹھ جاؤ اور بیڈروم میں آؤ۔ نجانے تم اپنا روٹین کب بدلو گے۔ اٹھ جاؤ۔ بستر میں لیٹو جاؤ میں نئے سرے سے آتش دان کو گرم کرنے سے رہی۔“ اسی وقت فون کی بیل بجی ”ارے اس وقت کس

آگیا۔ لگتا ہے۔ ٹی کا جینی سے پھر جھگڑا ہو گیا ہے۔ عجیب ہیں یہ لڑکیاں بھی۔ ہر وقت ساتھ بھی رہتی ہیں اب بھی ہیں۔“

”ہیلو..... لیس جینی!“

”ہیلو میڈم، آئی ایم ناٹ جینی میں فرجاد ہوں۔“

”واٹ فرجاد اس وقت؟“ فرجاد کی آواز پر روبیکا کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں کیونکہ رائی طرف داری اور توجہ نے روبیکا کے دل میں اچھے خاصے فرجاد کے لیے ہلکا سا حسد پیدا کر دیا تھا اور اسی ناپسندیدگی اس کی آواز اور لہجے میں اتر آئی تھی۔

”جی میڈم میں باس کے حکم پر گاڑی چھوڑنے آیا تو، تو ٹی میڈم کو دیکھا۔“

”اوہ! کم آن تم نے جی میڈم کو پہلی بار دیکھا ہے کیا۔“

”جی میڈم جس حالت میں وہ اس وقت..... مطلب بے ہوشی کی حالت میں پہلی بار دیکھا ہے۔ ار ٹی میڈم بے ہوش ہیں۔“

”واٹ.....“ اور دوسرے ہی لمبے رو بیکا گیٹ پر تھی۔

ٹی گاڑی کی بیک سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی وہ سب جانتی تھی کہ کوئی پہلی بار تو ہوا نہیں کہ گھبراتی یا پریشان وہ جب بھی جینی کے ہاں رات گزارتی ایسا ہی کچھ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب فرجاد کے سامنے ڈرامہ کرنا ضروری تھا۔

”اوہ! نو کیا ہوا ٹی، ٹی بیٹا ویک اپ، ٹی اٹھو بیٹا، یہ لڑکی انسی ہی ہے فرجاد بیٹا۔ بہت گہری نیند ہے ایک بار سو جائے تو بڑی مشکل سے نیند سے اٹھتی ہے۔ اور..... اور اسے نیند میں چلنے کی عادت بھی ہے جانے فرجاد میں ایسا کیا تھا کہ ٹی کو جگانے اور ہوش میں لانے کے ساتھ ساتھ وہ کھسانے لہجے میں بیٹی کا بچی کر رہی تھی۔ فرجاد خاصے دکھ کے ساتھ ایک ماں کو دیکھ رہا تھا جو بے ہوش بیٹی کو گاڑی سے بمشکل نکال کر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ روبیکا خود بھی بہت دھان پان نازک سی تھی بے ہوش بیٹی کو سنبھال نہیں پارہی تھی۔

یہ کس قسم کے پاکستانی مسلمان ہیں کہ اپنی اولاد وہ بھی بیٹی سے غافل ہو کر سکون سے سو رہے ہوتے کاش میرا اس لڑکی پر کچھ اختیار ہوتا تو مار مار کر تیر کی طرح سیدھا کر دیتا۔

ایسے ہی پاکستانی مسلمان لوگوں کو دین اور قومیت سے اتنا دور دیکھ کر دکھ کی شدید سر دہرا اس کے رگ میں اتر گئی تو کچھ دیر کے لیے ماحول کی ٹھنڈک بھی بے اثر ہو گئی۔

”اف! ٹی ہوش میں آؤ خود بھی گروگی اور مجھے بھی گراؤ گی۔“

گیٹ کی سیر می سے ٹکرا کر دونوں گرنے لگیں تو فرجاد آگے بڑھا مگر پھر رک گیا۔

”فرجاد بیٹا! پلیز ہیلپ می۔“ روبیکا کی درخواست پر وہ آگے بڑھا اور بمشکل جی کولا کر لاؤنچ کے صوف پر ڈالا اور کبل اوڑھانے لگی، جی ساری کارروائیوں سے اب بھی بے نیاز تھی۔ فرجاد نے ایک نظر لاؤنچ پر ڈالا

”کیا یہ لکھواری لائف ہی انسان کا حاصل ہے کہ اس کے لیے پاکستانی سب کچھ چھوڑ چھاڑ..... تان معاشرے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یا میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اب معلوم نہیں رائی سر کا شمار میرے قبیلے

”اس کی سوچوں کا رخ روبیکا کی آواز سے ٹوٹا۔

”تم بیٹھ جاؤ فرجاد، میں تمہارے لیے کافی لے کر آتی ہوں ٹھنڈ بہت ہے۔“ روبیکا نے ایک طرف ڈبے میں سے لکڑیاں اور کوئلے نکال کر آتش دان میں ڈالے فرجاد کو دیکھا جو کھڑا تھا۔

”نہیں میڈم، آپ تکلف مت کیجیے میں گاڑی چھوڑنے آیا تھا۔ یہ لیجیے چابی چلتا ہوں۔“ فرجاد نے سے چابی نکال کر میز پر رکھی اور ایک نظر بے سدھ پڑی ٹی کو دیکھا۔

اس جت دس نومے میں پیدا ہوا تھا۔ اس موقع پر چاروں بھائیوں نے اپنے بھائی کو مبارکبادیں دیں۔ ”او کے!“ روپکا نے گویا موقع غنیمت جانا خود غرضی میں نہیں سوچا کہ کہ نیا نیا پاکستانی لڑکا اتنی بچہ رات بغیر کسی سواری کے کیسے جائے گا۔ جانے کی اجازت دے دی۔ وہ بو بھل دل کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف ہی تھا کہ سامنے سے راہی آ گیا گہری جھانکی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھا تو فرجاد کو دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ ”فرجاد بیٹا تم۔“

☆☆☆

”نہیں ملتا مجھے، کسی بڑی امی یا کسی تائی امی سے، مام میں آپ کو کتنی بار بتاؤں..... اور ثمینہ امی آئی ہیں ہمارے گھر!“ ارمغان تیز آواز میں بولا اور باہر جانے کی اپنی تیاری جاری رکھی۔

”ارمغان آہستہ بولو۔“ مبینہ نے سرگوشی کی کہ کہیں وہ سن نہ لیں۔ ارمغان کوئی جواب دیے بغیر با گیا۔

منیبہ شرمندہ سی اندر آئی تو داؤد اداں دونوں سے باتیں کر رہا تھا۔

ثمینہ پیار سے اس کے معصوم چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ کتنا ارمان تھا ثمینہ کو کہ اس کا بھی کوئی بیٹا ہو۔ عمارہ انہوں نے بے شمار دعائیں اور منتیں مان لی تھیں کہ بیٹا ہو مگر جب عمارہ گود میں آ کر مسکرائی تو بیٹے کی خواہش ختم تو نہ ہو دبا ضرور گئی۔ آج سوکن کے بیٹوں کو دیکھ کر دل سے پیار اٹھ رہا تھا کہ وہ بھول ہی گئیں کہ یہ لڑکے اس کی سوکن کے ہیں ”چلتے ہیں اب!“ منیبہ کو دیکھ کر اسماء نے ظاہر کیے بغیر کہ وہ ارمغان کی بات سن چکی ہیں منیبہ سے دونوں جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں تو داؤد تیزی سے باہر گیا چند لمحوں بعد واپس آیا تو ہاتھ میں ایک چھوٹا کی البم تھی۔

”بڑی امی اور تائی جان کہاں جا رہی ہیں دیکھیں تو میں نے اپنی سب بہنوں کی تصویروں کی البم بنائی۔ دیکھیں بڑی آپا، سارا پھر زارا آپا، اور یہ عمارہ، مجھے لگتا ہے بڑی امی میری اور عمارہ کی بہت دوستی ہوگی ہے ناں۔ داؤد معصومیت سے وہ تصویریں دکھا رہا تھا جو اس نے ساجد سے واس ایپ کے ذریعے حاصل کی تھیں ان کے پرنٹ نکلا کر چھوٹی سی البم تیار کر لی تھی۔ اور اس وقت خوشی اور جوش سے تمنا تے چہرے کے سامنے دونوں کو دکھاتا ہوا ثمینہ کو بہت اچھا لگا اس نے اس کی پیشانی پر چوم لی وہ ساتھ لگ گیا۔

”بہت چاہتے ہو اپنی بہنوں کو۔“

”بہت! بہت! بہت زیادہ بڑی امی پلیز مجھ ساتھ لے چلیں ناں۔“

داؤد کی معصوم سی حرکت اور خواہش پر ثمینہ نے ایک طرف کھڑی شرمندہ سی منیبہ کو دیکھا جو ارمان حرکت پر بہت شرمندہ تھی۔

”منیبہ! میں..... میں داؤد کو لے جاؤں۔“

”تو داؤد کی ماں نے کیا قصور کیا ہے۔ صرف تمہارا شوہر ہی تو چھینا ہے۔ لے چلو اسے بھی ساتھ۔ قدموں میں جگہ دے دو تم سے خدمت کروں گی۔“ منیبہ قدرے شوخی سے مسکرائی۔

”جن کی جگہ دل میں ہو وہ قدموں میں نہیں بیٹھا کرتے منیبہ۔“ پھر دونوں گلے ملیں تو اسماء ہنس دونوں کی بلا لیں۔

”ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ تم دونوں کے پیار کو قائم رکھے آمین۔ زین بیٹا ڈرائیور سے کہو پورچ سے نکالے۔ اب ہم چلیں گے۔“

”بڑی امی اب آپ کب آئیں گی!“ داؤد بہت اداس ہو گیا تھا۔

”اوہو! اسے تو دیکھو۔ میری موجودگی میں بڑی امی سے محبت جتنی جارہی ہے۔ اور حیرت

بھی ہو رہی ہے۔“ منیبہ نے ہنس کر کہا

”میں اب نہیں آؤں گی بیٹا!“ ثمنیہ مسکرائی۔

”مگر کیوں؟ بڑی امی۔“ داؤد سہم گیا۔

”اس لیے کہ اب تم وہاں آؤ گے ان شاء اللہ!“

”یہ!..... داؤد بچوں کی طرح خوش ہو کر ثمنیہ سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

”ہاں یار ہمایوں کہاں ہو۔ ہم لان میں بیٹھے چائے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”سوری یار سرمد۔ بہت بڑی ہوں ایک بزنس میٹنگ میں ہوں آکر ڈسکس کرتا ہوں تم

بائے۔ تم لوگ انجوائے کرو۔“

سعدیہ نے سرمد کو دیکھا شرم کی وجہ سے وہ ہمایوں کا نام بھی اب سرمد کے سامنے نہیں لیتی

معاملہ بھائی پر نہ مکمل جائے۔

”بھائی کیا کہہ رہے ہیں ہمایوں بھیا آرہے ہیں کہ نہیں۔“

حادیہ ہمایوں ہی کا انتظار کر رہی تھی اندر سے وہ ریگٹ پکڑے باہر آئی۔ اس کا اور ہمایوں کا بیڈ مشن

”نہیں حادیہ۔ کہہ رہا ہے کہ ضروری میٹنگ میں ہوں نہیں آیاؤں گا۔“

سادہ سا جملہ سعدیہ کے دل میں اداسی پھیلا گیا۔ جاوید کا موڈ آف ہو گیا۔

”یہ ہمایوں بھیا بھی ناں ایسے ہی چیٹنگ کرتے ہیں۔ بزدل نہ ہوں تو ہمارے کے خوف

بتالیا۔“ وہ منہ پھلائے بیٹھ گئی تو سرمد زور سے ہنس پڑا۔

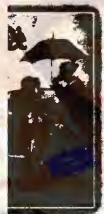
دارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 اختصارات مل

پیشہ

دستور

دل لک

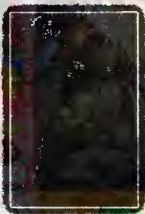
چلمن



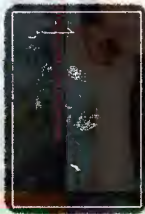
فیہمہ میرزا
قیمت - 100/- روپے



نوزیدہ سمین
قیمت - 750/- روپے



رضیہ جمیل
قیمت - 300/- روپے



نادرہ خاتون
قیمت - 300/- روپے

فون نمبر
35021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37

منگواہے
کا پتہ

”ارے، بھئی لڑکی جس پر غصہ ہے اسی پر اتارنا۔ سعد یہ کا دل کیوں چھوٹا کر لی ہو۔ سعد یہ پکڑے بہت ہیں۔ شاباش۔“

”ویسے سعدیہ میں یہ سوچ رہا ہوں۔ سوچ کیا میری یہ خواہش ہے کہ تم اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرو۔ پھر سے جانا اشارت کرو۔“

”آبھی جائیں بھیا، یا آپ بھی ہارنے سے ڈر رہے ہیں۔“

“...

”ارے وہ دیکھو کلو لنگڑی آرہی ہے۔“

”ارے بھئی، کلونگرڑی کی قسمت بہت اچھی ہے۔“

”میری دادی کہا کرتی ہیں۔ ٹھیک یاد نہیں لیکن یہ کہ روپ روئے اور بھاگوں والی کھائے کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ اس قافلے ہے کہ اتنی گٹھڑی لائف اس کو ملے۔ ہونہہ۔ ایک ہم ہیں کہ اتنے حسین ہو کر بھی رکشوں اور بسوں کے کھاتے پھرتے ہیں۔“

”اللہ سے ڈرو۔ اگر مکمل پیدا ہوگئی ہوتو۔ ایسا نہ کوئی حادثہ تمہیں بھی لنگڑا کر دے۔ پاتھار حسن مخ

پھر فوراً اپنی اس انتقامی سوچ کو کوسا کرتی۔ یہ سب ایک دو کا قصہ ہوتا تو وہ سمجھتا کہ کتنی مگر کار شیطانی ٹوٹا تھا۔ جن کا تعلق توڈل کلاس یا لوڈز ٹل کلاس سے تھا۔ مگر حسن کی دولت میں وہ کالج بھر میں اور ہر روز اسے تنقید کی توپ کے دھانے پر رکھ کر اڑایا کرتیں۔

”بھیا۔ مجھے نہیں پڑھنا..... نہ کالج جانا ہے۔“

ایک دن اس نے سچ کر کہہ دیا تو سرد دل تمام کر رہ گیا۔

”مگر مگر سعد یہ تمہارے خواب..... تمہارا ڈاکٹر بننے کا خواب جو تم بچپن سے دیکھتی آ رہا کیا ہوگا۔“ تب وہ اپنے باپ جیسے بھائی کے ساتھ لگ کر شدت سے رو دی گئی۔

”لنگڑے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی بھیا۔“

”سعدی..... میری گڑیا۔ میں تو تمہیں بہت باہمت اور سمجھ دار سمجھتا تھا مگر بیٹا۔ تم تو..... اچھا کہ میرے ساتھ بھی ایسے ہی معاملات ہیں۔ ہاں بس فرق یہ ہے کہ میں چکنا گھڑا بن گیا ہوں۔ اب سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہوں۔ ورنہ معلوم ہے تمہیں کہ یونیورسٹی میں کیا۔ کیا باتیں کر۔ لڑکیاں۔“ کل پھر کے لیے سرد کی آواز بھی دب گئی۔

”مگر، کیوں بھیا کیوں! ایسی باتیں کرنے والوں کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا کہ اگر کوئی حادثہ ان کو بھی ایسا کر دے۔“

”ایسے لوگوں کو شعور نہیں ہوتا۔ شعور ہو تو سوچیں ناں۔ کہ سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اس ہمیں بتا دیا۔ یہ ہمارے خالق کی مرضی اور مصلحت ہے۔ ہم کون ہیں جو اس کی مصلحت نہ سمجھیں یا، کچھ خالق و مالک کے ہر حکم پر سر جھکا کر اپنا ہماری بندگی ہے۔ میری بہن۔“

”سرد اسے سمجھاتا۔“ وہ سب جانتی تھی مگر پھر بھی روپے اسے تڑپا جاتے۔ تو کبھی وہ شانے پر رکھ کر رو دیتی تو کبھی تنہائی اس کی سیلی بن جاتی۔ لوگوں کی سطحی سوچ نے اس کی آنکھوں سے ڈالے تھے۔ اور ان خوابوں کی کرچیاں ہر وقت ہی چھا کرتیں۔ کبھی جب محرومیاں شدت اختیار کر خود کو سنبھال نہیں پاتی۔ ابھی وہ سوچوں میں گم تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”دروازہ کھولو..... سعدیہ۔“

اس دستک اور آواز میں جانے کیا بات تھی کہ وہ گرتی پڑتی واش روم میں گھس گئی۔

☆☆☆

”امی جی آپ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔“

منیزہ خاتون، شگفتہ کا چہرہ ہاتھوں میں لیے غور سے دیکھ کر بولیں تو شگفتہ کی آنکھوں میں پھر زپہ اتر آیا۔

”منیزہ! تو..... تو ایسے پوچھ رہی ہے جیسے..... جیسے تجھے کچھ پتا ہی نہیں میرا..... میرا زہیر نہیں سب ہیں وہ کہاں ہے۔ وہ..... وہ میرے دل کا ٹکڑا ہے..... وہ کہاں ہے۔“

منیزہ اس بار دو سال بعد آئی تھیں سب بہت خوش تھے سب ہال کمرے میں جمع تھے جہاں شگفتہ ساتھ لگائے روئے جا رہی تھیں۔

ماحول بہت افسردہ ہو گیا تھا۔ مڑی ہوئی چھڑی پر سلیم صاحب کی گرفت مضبوط تر ہونے لگی۔ معاملے میں خود کو شگفتہ بیگم کا تصور وار سمجھتے تھے۔ وسیم باپ کی حالت سمجھ رہے تھے۔

”ابا! جان..... ابا جان!“ وسیم نے سلیم صاحب کو تھا تا تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے منیزہ ما

”ابا جان! آپ..... آپ بھی اب ہمت ہارنے لگے۔“

”اولاد والدین کا حوصلہ اور ہمت ہوتی ہے جب..... جب وہ ہی نہ رہے تو!“

”تو اس کا صاف صاف مطلب تو یہ ہوا ابا جان کہ آپ کی صرف ایک اولاد ہے زبیر..... وہ ہی آپ کی اولاد اور حوصلہ تھا جو چلا گیا تو آپ دونوں کے دل سے بقیہ اولاد کی محبت اور چاہت بھی لے گیا اور یہ احساس بھی بقیہ اولاد بھی آپ کی ہمت اور حوصلہ ہے۔“

بشری خاتون خاصی حقیقت پسند اور تنگ مزاج تھیں اپنی داوی جیسی اور ان کی یہ بی بات گلشن جہاں کو بہت رسمی اور ایسی ہی کچھ مشترکہ عادات اور سوچ کی وجہ سے دونوں میں کڑوے رشتے کے باوجود بلا کی دوستی تھی۔

”اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے بشری! بالکل درست کہا آپ نے، ہم کہتے تو شکایت ہوتی سب کو۔ یعنی حد تک ادا ہر سب اچھے ہوئے سب خوش ہوئے والدہ کو ایک دم زبیر میاں یاد آگئے اور اچھا خاصا ماحول اشکوں سے جو جاتا ہے۔ اب نیزہ آجاتے عرصے کے بعد آئی ہیں تو.....!“ سچ لہجے میں نرم الفاظ بھی ملنے ہو جاتے ہیں اور یہی ہوا تھا گلشن جہاں کی لفظوں کی نئی سب نے محسوس کی غیر صاحبِ توبہ قاعدہ شرمندہ ہو گئے۔

”غفر میاں! گلشن جہاں سے کہیے کہ اس وقت یہاں سے جائیں اور امور خانہ داری سنبھالیں جو کام ان فوڈے ہیں وہ انجام دیں۔ یہ جب تک یہاں تشریف فرما رہیں گی والدہ پریشان رہیں گی۔“

”جی بہتر کلیم بھیا۔ چلیے بیگم!“ غفر میاں نے خود ماحول کی نئی محسوس کر لی تھی اور گلشن جہاں کی باتوں نے ان کی والدہ کا کتنا دل دکھایا ہوگا اس بات کا بھی احساس تھا۔ انہوں نے اٹھ کر گلشن جہاں کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی سب بڑھے اور یہ منظر سب نے دیکھا کہ گلشن جہاں نے اپنا ہاتھ حتیٰ سے میاں کی گرفت سے آزاد کیا۔ اور یہ بات بھی سب نے ہی سنے۔

”چھوڑیے ہمارا ہاتھ، آپ تو خاندان بھر کے غلام ہیں۔ بھائی صاحب کے حکم پر ہمیں محفل سے ہاتھ پکڑ کر دیا۔ اچی ہم پوچھتے ہیں کہ آخر ہماری بھی اس گھر میں کوئی حیثیت ہے کہ نہیں یا پھر ہم ملازمہ ہیں کہ ہم گھر کی سنبھالیں، بارودچی خانہ سنبھالیں اور آپ ہمیں.....“ وہ طویل راہ داری سے گزرتے ہوئے بولے جارہی ہیں۔

”گلشن بیگم آپ بات کا بیکار بیاری ہیں۔ آبا جان اتنے عرصے کے بعد آئی ہیں۔ تو اماں جان کا دل بھر گیا۔ اس میں واویلا مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور آواز کو پیچی رکھیے۔“

غفر بیگم کے پیچھے چلتے سمجھاتے جارہے تھے۔ وہ اپنے غرارے کو سنبھالتی شدید غصے میں پٹلیں۔ چہرہ سرخ آنکھیں نم تھیں۔

”واویلا..... اچی واویلا ہوتا کیا ہے یہ اب ہم آپ کو بتائیں گے بیٹے راستے سے۔“ گلشن جہاں غصے میں بی بی حواس کھودیا کرتی تھیں۔ غفر میاں کچھ دیرو ہیں کھڑے سوچتے رہے۔ پھر گہری سانس لے کر بچوں کی طرف بڑھے۔ جو غزین اور شابی تاباں کے آجانے سے بہت خوش تھے۔

”شکر ہے یار! غزین تم لوگ آئے تو۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے اور شابی تاباں تم لوگوں کا آنا تو سر پرانز ہوا رہے لیے۔“ فیصل نے سب کی نمائندگی کر دی۔

”جی فیصل بھائی۔ ہم دونوں کو تو نہیں آنا تھا۔ امی جی نے کہا گھر کون سنبھالے گا، نہ جاؤ۔ ابا جی بولے۔ امی بڑی حویلی میں میں اکیلا رہوں گا۔ مگر بھائی جان نے ابا جی اور امی جی سے چوری چوری ہمارے ٹکٹ بھی لو لے لیے تو یوں ہم سر پرانز بن کر آپ لوگوں کے سامنے۔“

کھڑی ہوئیں۔

”اماں جان کوئی کام تھا۔“ دونوں ہی خوف زدہ تھیں کہ اگر اماں جان نے حسب عادت ان کر دیں تو کزنز کے سامنے بے عزتی ہو جاتی۔ گلشن جہاں نے ناک سکڑ کر سب کو دیکھا۔

”ایک دو نہیں..... دسیوں کام ہیں گھر میں۔ سب لڑکیاں اٹھ جائے اور رات کے کھانے کا کیجیے۔“

”جچی جان! ابھی تو ہم لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے ہیں۔“

”جی جچی جان! زیب بالکل درست کہہ رہی ہے۔ میرے ہاتھوں سے تو ابھی بھی پیاز کی بو آ رہی ہے۔“

”جی جچی جان! ابھی تو ہم لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے ہیں۔“

”یہی دن ہیں لڑکیوں کو گھر داری سیکھنے کے۔ کل کلاں کو جانے کس کا نصیب کہاں جا لکھے، عادیہ وقت کام کرنے کی۔ آخر لڑکیاں ہیں آپ لوگ۔“

”لڑکیاں نہ ہوئیں گویا۔ کوہو تیل ہو گئیں کہ ہر وقت جتے رہو۔“ ایک تو گلشن جہاں کے کان اتنی تپتی تھی کہ فائزہ کے کان میں کی گئی سرگوشی بھی ان تک پہنچ گئی تھی پان چباتے چباتے تنک کے بڑی بڑی آنکھیں۔ جن پر بھی غیر میاں نے غزلیں لکھی تھیں اب بچوں کو خصوصاً لڑکیوں کو گھورنے کرتیں۔

”فائزہ خاتون۔ کوہو کا تیل بھی بننا چاہیے لڑکیوں کو، کامیاب زندگی کے لیے۔ کامل اور پھو کون پوچھتا ہے۔ غزین میاں ہماری بیٹیاں اپنے دو حیال اور تخیال میں اپنے سکھڑپن اور حسن کی وہ ہیں۔“

گلشن بیگم اپنی بیٹیوں کی تعریف میں معروف تھیں کہ ہارون، صبا کے قریب آیا۔

”ہیں واقعی! جچی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

غزین نے چپکے سے ہارون کا کان پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ صبا کو جیسے ہارون کی بات پر غصہ آیا تھا۔ غزین نظر آنے لگی۔

”جی، جچی جان! آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔“

”ہمیں معلوم ہے ہم ہمیشہ درست بات کرتے ہیں۔ ہمیں ہماری خوبیاں بتانے کی ضرورت سب لڑکیاں جانتیں اور باور رکھتی ہیں۔ ہمارا انتظار کریں۔ ہم آتے ہیں۔“

”کیجیے ایک تو انتظار کی کوئی بات وہ بھی جچی جان کا۔“

ثناء کا موڈ آف ہو گیا۔ اس دوران شانی اور تابانی ماما کی باتیں اور ان باتوں کے جواب میں چہروں کے بدلتے نقشے اور زاویے دیکھ کر ہنسی روکتی رہیں۔ ایک بار نظر تو ان پر بھی پڑی وہ سہم گئیں۔

”غزین بھیا! بولیں ناں کچھ کہ ہمیں باہر جانا ہے۔ اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے اور ہم بچن میں کریں۔“

زید نے غزین کو ٹھوک مارا کیونکہ وہ اس وقت معتبر شخصیت بنا ہوا تھا۔

”وہ بات یہ ہے ماما جان کہ ابھی تو کھانا کھایا ہے۔ رات کے کھانے میں بہت وقت ہے تب شہر گھوم آتے ہیں۔“

گلشن بیگم اپنے بھاری بھر کم وجود اور گیر دار غرارے کے ساتھ پیش۔

حید ہے عزیز میں! سرف آپ کی وجہ سے اجازت دے رہے ہیں۔
 ”بہت..... بہت شکریہ چچی جان۔“ سب کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔

”لیکن.....“ لیکن کے اسپینڈ بریکر پر سب کی خوشی کو جھٹکا لگا۔ ”لڑکیاں یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ
 ان کا کھانا ان ہی کو پکانا ہے۔ آیا جان اتنے عرصے کے بعد آئی ہیں۔“

”جی، جی جانتے ہیں۔“ لڑکیوں کے موڈ آف ہو گئے تھے بھلا ایک آدھ گھنٹے میں کیا ہو سکتا تھا۔

”ارے بھی خواتین۔ جو وقت، جو لمحات مل جائیں ناں ان ہی کو غنیمت جانا چاہیے۔ شمعوں، بجیل یا رے

ک گاڑیاں نکالو۔ اور یہ میڈم عازرہ کہاں ہیں۔“

غزین نے نوٹس کیا تھا جب سے وہ لوگ آئے تھے عازرہ نظر نہیں آئی تھی۔

”ہوں عازرہ لی اپنی آرٹ گیلری میں۔“

”تو جاؤ تا یا ر بلا کر لاؤ۔“

”نہیں، یا ر غزین بے کار ہے۔ اس نے خود کو اپنی سوچ کے قلعے میں محصور کر رکھا ہے۔ وہاں تک نہ کسی ک

سائی ہے۔ اور نہ ہی اجازت۔“

”اچھا ایسا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ غزین آگے بڑھا۔

”بے کار ہے غزین آ جاؤ، وہ آدم بے زار خاتون ہے۔ چھوڑو۔“

”ارے بھی کوشش کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ناں۔ لیٹ می ٹرائے۔“ غزین عازرہ کے کمرے کی طرف

بڑھا۔ ہلکی سی دستک کے بعد بے زاری آواز ابھری۔

”آ جاؤ، بھی تم لوگوں کو چین نہیں۔ نجانے کیوں جمیل میں پتھر اچھالتے رہتے ہو۔ کم آن۔“

غزین اس کی اجازت کے بعد دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ تو ہر طرف پھیلی تصویروں اور رنگوں کی خوشبو۔

مقابل کیا۔ اور خود عازرہ کوئی تصویر مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ دراز بالوں کی چٹیا ایک طرف جھکی تھی۔ وہ چپ

پاپ آگے بڑھا۔ ایک تصویر اٹھا کر دیکھی۔ تصویر میں دیہاتی ماحول کو پینٹ کیا گیا تھا۔ اور کس قدر خوب صورت

www.urdutube

حقیقت سے قریب تھا بالکل غزین کے اپنے گاؤں کی تصویر۔

”خبردار جو کسی چیز کو ہاتھ بھی لگایا۔ بہت بد ذوق ہوتم.....“ عازرہ مڑے بغیر بولے لگی غزین کچھ چھپا۔

”ایسا تو نہ کہو۔ میں تو ٹھیک ٹھاک بازوق آدمی ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی سوچ سمجھ عطا کی ہے۔“

غزین کی آواز پر عازرہ ہلکی کی تیزی سے ہلکی۔

”آ..... آ..... آپ غزین۔“ دل دھڑکا برش پر لگا رنگ چہرے پر آگاہا ڈھلاک دو پنا تیزی سے سر پر آٹکا۔

”آ..... آئی ایم سوری غزین..... وہ دراصل ہارون اور شمعوں جب بھی آتے ہیں میری پیشینگی پر الٹ

سیدمی تنقید کرتے ہیں تو..... تو میں کبھی اس وقت بھی وہی ہیں۔ سوری۔“ وہ واقعی خاصی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ او

ل تھا کہ غزین کی اس اجاگ آمد پر اپنی مخصوص رفتار سے بھی زیادہ دھڑک رہا تھا۔

عازرہ اس خاندان کی سب سے حسین لڑکی تھی کسی شاعر کے خیال کی طرح نازک اور لفظوں میں ڈھلی غزا

کی طرح اور اس غزل کا عنوان غزین تھا اور یہ راز سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور وہ خود سے بھی چھپا۔

بھرتی۔

”ہوں تمہارا کرہ تو واقعی کوئی آرٹ گیلری ہی لگ رہا ہے۔“

”جی، بس وہ آئیے ناں بیٹھے میں۔ میں آپ لوگوں سے ملنے لگی تھی پھوپھو اور شابی تابلی سے ملاقات ہو گئی

آپ.....!“

غزین کی ایک نظر جائزہ پر بھی دوسری اس کی بتائیں تصاویر پر۔



جان بوجھ کر تم نے ماس کیونٹیکیشن میں ایڈمیشن لیا ہے تاکہ مجھ سے دور رہ سکو۔“ زارا کا ماس کیا ایڈمیشن لینا فہد کو سلگا گیا تھا۔ اس کے مطابق زارا اس سے دور رہنے کے لیے دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں ”خیر بیٹا اس کی اپنی سوچ ہے وہ آزاد ہے جہاں چاہے ایڈمیشن لے، جو بڑھنا چاہے پڑھے، اپنی سوچ پر مسلط ہوتے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح اسماء ہی زارا کی حمایت میں بولیں جبکہ شمینہ چپ چاپ نہ تھی۔

”نہیں امی جان۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں۔ زارا بچپن ہی سے ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اس لیے میں کو اپنی منزل بنالیا اور..... اور اس نے راستہ بدل لیا۔“ وہ ہار سا گیا۔
”نہیں معلوم ہے تاکہ اب میں ڈاکٹر نہیں بن سکتی، اتنے نمبر نہیں آئے ہیں میرے تو.....“
”تو یہ کہ تم نے کہا تھا۔ اگر میں ڈاکٹر نہ بن سکی تو فرکس یا کیمسٹری میں کوئی کارنامہ انجام دو اچانک تم نے راستہ کیوں بدلا۔ خالہ پوچھیں بھی اس سے۔ کیوں کرنی ہے یہ مجھے چڑانے والی حرکتیں۔“ فہد تلخ انداز میں بول رہا تھا۔

شمینہ نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگالیا۔ شمینہ خود شکست خوردہ تھیں۔ اپنی کیفیات سے فہد کی احساسات کو ملا کر دیکھتیں تو ان کو فہد ہی درست نظر آتا۔

”زارا بیٹا بات تو فہد کی درست ہے ناں..... تم تو.....“

”پلیز امی جان! میں جیو اور جینے دو کے فارمولے کی قائل ہوں میں سوچ کی آزادی اور شخصی قائل ہوں۔ میں اپنی شخصی آزادی کا حق استعمال کر کے اپنی سوچ کو لفظوں میں ڈھال کر معاشرے کے خلاف لکھنا چاہتی ہوں..... کچھ کرنا چاہتی ہوں اس لیے میں نے یہ شعبہ چنا ہے۔“ اور پھر فہد ہوئی ”خود کو میری زندگی میں اہم سمجھنا چھوڑ دو۔“ رسان سے اپنی بات کر کے وہ باہر نکلنے لگی تو وہ اس میں آ گیا۔

”میں تمہاری زندگی میں اہم نہیں، جانتا ہوں۔ مگر تم میری زندگی میں اتنی اہم ہو کہ اب پہلے یہ نکاح ہو گا پھر ایڈمیشن۔“

”ہاں بالکل درست۔ فہد اس سلسلے میں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ سارا سب سے پہلے آ۔ شمینہ نے آگے بڑھ کر زارا اور فہد کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”ان شاء اللہ! ہم ان لائنز پر سوچیں گے۔“

”بالکل سوچیں گے لیکن اگر زارا دل سے مانے گی تو پھر۔“

اسماء نے شدید غصے میں زارا کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا۔ زارا نے مخالف پارٹی کی حمایت دیکھا۔

”تھینک یو خالہ جان! آپ نے کم از کم مجھے سمجھا تو سہی۔ میں شخصی آزادی اور سوچ کی آزادی ہ اس لیے مجھے انکار ہے۔“

زارا نے فہد کو دیکھتے ہوئے ماں کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔ فہد جیسے ڈھے سا گیا۔ اور اس ماں اور خالہ کا دل بھی بیٹھ گیا۔

”فہم حوصلہ یوں ہارتے ہو۔ زارا ہمیں نہیں جائے گی۔“ سارا نے حوصلہ دیا۔
 ”میں اگر زارا کو ذرا سا بھی سمجھتا ہوں تو سارا بھابھی، زارا اچانکی ہے۔“ فہم کی آواز کہیں دور سے آئی۔
 ”زارا..... تم..... ایسا کیسے کر سکتی ہو۔ تمہاری جان تو مجھ میں ہستی ہے اور تم فہم کو رد کر کے۔“ ثمنینہ کی طبیعت
 ب ہونے لگی۔

”ارے میری پیاری خالہ، اس کا یہ مطلب تو ہڈی ہے کہ میں..... میں اس کی باتوں میں آ کر اس کو چھوڑ
 گا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ..... آپ پریشان ہو کر اپنی طبیعت خراب مت کریں پلیز۔“
 اپنے اندر سے اشتیاق چنچوں کو دباتے ہوئے حسب معمول ثمنینہ کو سنبھال رہا تھا۔ اور اس بات پر ثمنینہ کو دکھ تھا
 وہ فہم جیسے لڑکے کو مستر دیکھے کر سکتی ہے۔ لیکن نجانے وہ کس یقین کے سفر پر آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ منزل اس
 قدر ہے۔

☆☆☆

یونیورسٹی اسٹار ہو چکی تھی۔ اسٹڈی گروپنگ میں زارا اور سرمد اپنے گروپ کا حصہ بنائے گئے تھے۔ اور یہ بات
 مد کے لیے بہت خوش آئند تھی۔ حنا کو بھی اصرار کر کے اپنا گروپ بدلنا پڑا تھا اور ان کے گروپ میں آنا پڑا تھا۔
 کو سخت بوریت ہوتی تھی، یہ نیا سبجیکٹ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 ”تو بدل لو۔ سبجیکٹ ابھی تو چینیج کر سکتی ہو۔“

گھاس پر بیٹھے ہوئے زارا نے سکون سے کہا تو حنا کو سخت غصہ آ گیا۔
 ”اچھا! میں سبجیکٹ چینیج کر لوں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا ناں۔ یعنی کہ مرے تھے جن کے لیے وہ رہے
 و کرتے۔ ہونہ۔“ حنا خفا ہو کر قریب ہی بیک رکھ کر بیٹھ گئی اور اشارے سے جوس کارنر سے لڑکے کو بلوایا۔
 ”جی ہاں!“ بارہ تیرہ سالہ بچہ کمز لڑکا پوچھ رہا تھا۔
 ”کیا ٹھونسو گی؟“ حنا غصہ سے زارا کو گھور رہی تھی جو اپنی فائل پر جھکی لپکچر دیکھ رہی تھی جو آج ہی ٹیچر نے
 تھا۔

”جو تم خود ٹھونسو گی وہی منگوالو۔ مطلب موسمی کا جوس!!“
 ”سن لیا ناں بچے.....! اب جاؤ۔“ حنا نے بے زاری سے کہا بچہ جانے لگا۔
 ”اور سنو، ایک گلاس میں زیادہ برف ڈالنا پارہ بہت پائی ہے۔“ فائل پر سے نظر ہٹا کر زارا نے حنا کو چھیڑا۔
 اُسے گھور کر اپنے بیک سے سپاری نکال کر منہ میں ڈالنے لگی۔ زارا نے حسب عادت ٹوکا۔
 ”کتنی بار منع کیا ہے۔ سپاری مت کھایا کرو۔ اور اگر کھانا ہی ہے تو تو براہ راست منہ میں مت ڈالا کرو۔“
 ”ارے آپ لوگ یہاں ہو۔ میں تلاش کرتا ہوا آ رہا ہوں۔ یہ لوٹو بس یہ زارا آپ کے لیے یہ حنا آپ
 لے.....“

سرمد نے فوٹو اسٹیٹ ٹوٹس زارا اور حنا کی طرف بڑھائے۔ حنا مسکرائی۔
 ”سرمد تم بھی ناں..... ٹوٹس تیار کر کے نیاز کی طرح بانٹ رہے ہوتے ہو۔“
 ”ہاں تو یہ اچھی بات ہے ناں۔ تھینک یو سرمد۔ آپ جوس لو گے۔“ ٹوٹس کے بتا دے کے دوران بچہ جوس
 لے کر آ گیا تو زارا نے گلاس سرمد کی طرف بڑھا دیا۔
 ”تھینک یو سوچ!! اس وقت طلب ہو رہی تھی گرمی بھی تو شدید ہے ناں آج۔“
 سرمد کے جواب دینے سے پہلے ہی فہم جو زارا کو پک کرنے ان کے مخصوص ٹھکانے پر آچکا تھا۔ اس نے
 لاس زارا کے ہاتھ سے لے کر چند کھونٹ پے اور گلاس واپس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے سخت سے انکار

”میں فہد، زارا کا فرسٹ کزن اور.....“

”اور یہ سرد ہیں فہد۔ میرے کلاس فیلو اور گروپ فیلو بھی۔“ زارا نے جلدی سے فہد کی بات کا انکسٹوٹ یو۔“ سرد نے خوش دلی سے ہاتھ بڑھایا۔

”آئی وٹس کیس میں بھی یہ کہہ سکتا۔ آئی مین کہ سیم ہیر۔“ فہد نے سرد مہری سے ہاتھ ملا کر جلدی اُا اور کیا لیں گے جس منگو اوں یا بریانی فروٹ چاٹ۔“

سرد بڑے اخلاق سے فہد سے پوچھ رہا تھا۔ جبکہ فہد کے چہرے پر اُبھرتے تاثرات زارا غور تھی۔

”ارے بس بس، سرد صاحب، آپ تو کسی ماہر ویٹر کی طرح ڈشز گنوار ہے ہیں۔ جیسے اے پبلی سٹی کر رہے ہوں۔“ فہد کے لہجے میں چھپی سرد کی ہنک زارا نے بخوبی محسوس کر لی تھی اور حتانے سے جواب دے رہا تھا۔

”فہد صاحب آپ ہماری یونیورسٹی آئے ہیں تو مہمان نوازی میرا فرض بنتا ہے۔ ناں کہ۔“

”ایکسیکو زمی سرد صاحب! میں بھی کوئی آکسفورڈ یونیورسٹی سے نہیں آیا اسی یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ میں۔“

”اوہ! اچھا اچھا میں سمجھا آپ این ای ڈی سے آئے ہیں۔“

”این ای ڈی سے تو ہم آئے ہیں۔ سرد صاحب۔“

ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا ارمغان بلند آواز میں کہہ رہا تھا سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارمغان آؤ ناں، ہمیں اپنے دوستوں سے ملو اوں۔“

معمولی سی شکل و صورت گہری سانولی رنگت والا سرد کے اخلاق کا چہرہ بہت روشن تھا۔ ارمغان چابی لہراتا ہوا آیا۔ تو زارا اور فہد کو دیکھ کر وہیں رک گیا، آگے نہیں آیا۔ وہ ان دونوں کو پہچان گیا تھا کہ بہن اور فہد کی کزن ہے۔

”کیا ہوا، رک کیوں گئے۔ آؤ ناں۔“ سرد کو حیرت ہوئی زارا اور حتا فہد بھی اسی کو دیکھ رہے تھے۔

”نہیں! سرد تم جب فری ہو تو آ جانا میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں اوکے..... بائے.....“ وہ۔

لہجے میں بولتا ہوا ہاتھ ہلاتا جا چکا تھا۔

”کچھ عجیب سا تھا ناں!“ زارا اور تنک ارمغان کی پشت کو دیکھتی ہوئی سرگوشی میں بولی تو حتا ح

گہرا سانس لے کر بولی۔

”اب اتنے ہینڈ سم بندے کو اتنا عجیب ہونا تو چتا ہے ناں۔“

”تم تو ناں.....“ زارا اپنا بیک شولڈر پر لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”تو پھر چلیں زارا.....!“ فہد اس کی طرف مڑا پوچھ رہا تھا جبکہ زارا سرد کے ساتھ اس کی بدآ

سے چڑی ہوئی تھی۔

”بھلے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ پھر سرد کی طرف مڑی۔

”تھنک یو سرد، آپ کے تعاون سے ہمیں سبکیٹ کو سمجھنے میں آسانی ہو رہی ہے۔“

”بالکل سرد تو سارا وقت لا بریری میں بیٹھ کر سر کھپا کر نوٹس تیار کرتا ہے اور حلوہ بنا کر بانٹ دیتا

یو۔“ حتا بھی ممنون ہو رہی تھی جبکہ فہد سخت بے زاری سے دونوں کو گھور رہا تھا۔

”یو آر موسٹ ویلکم آل ویز۔ اور ہاں زارا آپ سر کے پلچر کا کہہ رہی تھیں تو ایسا کریں اپنا ای میل سینڈ دیں میں.....“

”کیوں؟ یہ خواتین یہاں جھک مارنے آئی ہیں کہ سب کچھ آپ ہی تیار کر کے دیں گے ان کو۔ یہ پڑھنے لکھنے میں بہت شوق تھا ان کو صحافت پڑھنے کا تو خود نوٹس تیار کریں خود لائبریری میں بیٹھیں کتابیں کنسلٹ کریں۔ یا پھر آپ کو بھی خواتین میں پاپولر ہونے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔“

فہد کے لہجے میں زہر میں بجھے تیر..... سرمد کو زخمی تو کر گئے مگر وہ ہنس دیا۔ اس پر زارا جو پہلے شرم سے گڑھی رہی تھی اور جل گئی۔

”مجھے نہیں معلوم فہد آپ کے اس طنز کے پیچھے کیا بات ہے کیا خیال ہے یقین کریں مجھے خواتین میں پاپولر ہونے کا قطعی کوئی شوق نہیں میرے نزدیک عورت بہت محترم اور قابل عزت ہستی ہے۔“

سرمد دیکھ رہا تھا کہ زارا اپنے کزن کی باتوں سے کتنی شرمندگی محسوس کر رہی ہے۔ مگر شاید فہد کو احساس نہیں رہا تھا۔ بلاوجہ ہی کھوکھلا سا قبضہ لگا کر بولا۔

”ارے سرمد صاحب۔ ڈونٹ ٹیک آن ہارٹ، آئی واز جسٹ کڈنگ۔“ (دل پر مت لیں، میں صرف ادا کر رہا تھا۔)

”چلیں!“ زارا نے ایک بے زاری نظر فہد پر ڈالی اور پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرمد کو الوداع کہہ کر آگے گئی۔ زارا کا موڈ سخت آف تھا۔ ڈرائیونگ کرتے کرتے فہد اسے کئی بار دیکھ چکا تھا۔

”ایسا بھی کیا کہہ دیا میں نے کہ تم اتنا ناراض ہو رہی ہو۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تو زارا نے چہرہ دوسرا کر لیا۔

”فہد تم نے بھی تو آج حد کر دی۔ کیا ضرورت تھی ایسی باتیں کرنے کی۔ سرمد بہت اچھا ڈائینٹ آڈو ہے۔ سب لڑکیوں کی بہت عزت کرتا ہے۔“ حنان نے ”سب“ پر زور دے کر کہا تو فہد اندر سے تو اپنے رویے اور توں پر نامد ضرور ہوا تھا مگر زارا کا رویہ سے اسے چھ رہا تھا۔

”اوہو! تو گویا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑ لیا ہے۔ چلو اترو۔ مفت کا ڈرائیور اور گاڑی ڈلوٹی ہے اور سے فلسفہ بگھا کر بور کر رہی ہو۔“

حنا کے میک پر گاڑی روک کر ہمیشہ طرح احسان جتا رہا تھا اور وہ ہنس پڑی تھی۔

”بہت برے ہو تم..... جاؤ دفع ہو جاؤ۔“ ٹینکس میں بھی نہیں کہوں گی۔ اللہ حافظ زارا۔“

وہ اتر کر زارا کی طرف جھکی اس کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ ہو رہا تھا آنکھوں کے کنارے بھیگ چکے تھے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا باؤ ڈال کر وہ آگے بڑھ گئی۔

”میں بھی آ رہی ہوں حنا۔ کھانا کھا کر جاؤں گی۔“

زارا نے اس وقت اچانک دروازہ کھول دیا جب فہد گاڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ نیچے اترتے ہوئے گر گئی فہد بری طرح گھبرا گیا زارا نیچے گر چکی تھی۔ وہ برق رفتاری سے زارا کی طرف بڑھا۔

تم..... تم ٹھیک ہونا زارا، چوٹ تو نہیں لگی۔“ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر زارا۔

”خفے سے ہاتھ چمڑا لیا۔ خود کو سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔“

”کلی بھی ہے چوٹ تو لگنے دو، تمہیں کیا فرق پڑتا کہ چوٹ کسی کے سر پر لگی ہے یا دل پر۔“

”اچھا سواری یا تم اتر رہی تھیں تو مجھے بتا دو تیش۔“

”کسی سواری کی ضرورت نہیں فہد عابد صاحب۔ اپنی باتیں اپنے رویے اپنے دل کی نوٹ بک پر نور

دل کا درد لہجے میں اٹھ آیا۔ وہ آنسوؤں پر ضبط کرتی حنا کی طرف بڑھی جو کھڑی اس کا انتظار کر دور تک اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ عکس دھندلا گیا۔

☆☆☆

راہی گہری نیند میں بھول چکا تھا کہ اس نے فرجاد کو گاڑی گھر لانے کا کہا تھا۔ فرجادیوں باس میں کھڑا کچھ سمٹ سا گیا۔

”جی سر! آپ نے کہا تھا گاڑی چھوڑ جانا وہی چھوڑنے آیا تھا۔“
روبیکا نے کوریڈور سے راہی کو لاؤنج کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا، اسی لیے وہ برق رفتاری سے آگئی کہ کہیں فرجاد ساری بات نہ بتا دے۔

”اوہ! اچھا..... اچھا مگر بیٹا اب تو رات کے ساڑھے تین ہو رہے ہیں۔ ابھی آئے ہو کیا۔“
مندی سے صوفہ کم بیڈ کی طرف بڑھا جہاں پہلے ٹی سوئی بھی۔ روبیکا گھبرا گئی۔

”جی سر کانی ہاؤس کا کام نمٹاتے نمٹاتے دیر ہو گئی چابی میڈم کو دے دی ہے اجازت دیجیے۔“
ایک نظر بے سدھ پڑی ٹی پر ڈالی اور باہر کی جانب بڑھا۔ روبیکا نے سکون کا گہرا سانس لیا کہ فرجاد داستان نہیں سنا دی۔

فرجاد بیٹا، اتنی ٹھنڈی رات میں تم کیسے جاؤ گے۔ یہاں آؤ، تم..... یہاں ہی سو جاؤ..... ار۔ یہاں کیوں سو رہی ہے۔“

راہی نے صوفہ کم بیڈ پر سوئی ٹی کو دیکھا تو روبیکا نے فرجاد کو دیکھا۔ جو اپنی جیکٹ کی زپ کھینچ کر تنک لا رہا تھا۔ ٹھنڈ بہت بڑھ گئی تھی۔

”راہی ہر وقت تھانے دار مت بنے رہا کرو۔ بچی ہے ٹی وی دیکھتے، دیکھتے یہیں سو گئی تھی سو گئی اٹھے گی تو پھر تمہاری بیٹی چڑچڑ کرے گی۔“

روبیکا نے آگے بڑھ کر ٹی کے بال سمیٹ کر اس کے لٹکے بازو ولفاف کے اندر کرتے ہوئے کہا
بھر کو اس غافل اور مطمئن ماں کے اطمینان پر دکھ سے دیکھ کر رہ گیا۔ جس ڈرامے کا وہ بھی ایک کردار
موجودگی میں جھوٹ بول کر باپ کو مطمئن کر دیا گیا تھا۔ دکھ کی ایک شدید لہر فرجاد کو بے چین کر گئی۔
اور باخبر ماں سب کچھ جانتے ہوئے بھی جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ د
جانب بڑھا۔

”فرجاد میاں کہاں جا رہے ہو۔ اس وقت کوئی سواری بھی آسانی سے نہیں ملے گی تمہیں،“
تو.....

”کوئی بات نہیں سر! میں چلا جاؤں گا، نوپرا بلیم۔“
”ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے فرجاد، ماشاء اللہ جوان ہے۔ مرد ہے۔ یہاں تو عورت بھی..... ہے۔ کوئی پرا بلیم تو نہیں ہوگی ناں فرجاد۔“ روبیکا نظریں چراہی تھیں اور فرجاد سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کو انہیں چاہ رہی۔

”نو میڈم۔ چلتا ہوں۔“ وہ اس وقت واقعی جانا چاہ رہا تھا۔ ”واٹ ایور، فرجاد تم اس وقت جا رہے۔ آؤ تم میرے ساتھ ایکسی کی چابی کہاں ہیں روبیکا۔“

راہی کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کا ایک ہم وطن جو اتنا وفادار اور ایمان دار ہو، سردی میں خوار ہو

رائی نے باقاعدہ بچوں کی طرح فرجاد کا ہاتھ پڑا اور اسے پی سی جانی ڈھونڈنے کے لیے اسے جی ساتھ ساتھ
 رُوح میں گھمایا۔ رائی کی یہی محبت روپکا کو فرجاد کے خلاف کر رہی تھی۔
 ”یہ لو اور اس کا ہاتھ تو چھوڑ دو بچوں کی طرح گھسیٹتے پھر رہے ہو۔ اپنے ساتھ اسے بھی۔“ روپکا نے برہم
 سے چابیوں کا گچھا، رائی کے ہاتھ میں رکھا۔ اس وقت رائی طعنی لڑائی کے موجود میں نہیں تھا۔
 ”کم بیٹا کم۔“ اور پھر اگلے چند منٹ میں فرجاد، رائی کے ساتھ خوب صورت سی ہٹ نما انیکسی میں موج
 لے جس میں ہر طرف ٹی کی چیزیں اور گٹار وغیرہ موسیقی کے آلات پڑے تھے۔ رائی سینٹے ہوئے شرمندہ لے
 لیں کہہ رہا تھا۔

”وہ دراصل ٹی اور اس کے دوست کوئی میوزیکل گروپ بنا رہے ہیں مطلب اپنا بیٹ بنا رہے ہیں۔ تو یہ
 پریکٹس کرتے ہیں۔ اور کچھ بے تکلف سہلیاں ناں۔ یہ سب میرا مطلب ہے ٹی کو ان سب کی عادت ہے نا۔“
 رائی فرجاد کو یہاں روک کر بری طرح پچھتا رہا تھا۔ کیونکہ کل ہی تو ٹی کے دوستوں نے رات یہاں گزارا
 تھی خوب ناچ گانا اور ہلا گلا کیا تھا۔ بوتلیں اور گلاس کچھ اونڈھے پڑے تھے۔ کچھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ ٹیک
 مگر بڑے کارپٹ پر جگہ جگہ گرے پڑے تھے۔ فرجاد کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا وہ بے دلی سے ایک طرف کھڑا
 پ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے اندر اپنی روایات تو زندہ تھیں مگر وہ ان پر عمل پیرا نہیں تھا۔ رائی کے لہجے میں شکست
 مایاں تھیں۔ ایک عجیب طرح کی شرمندگی ہو رہی تھی نگاہیں شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔
 ”آئی..... آئی ایم سوری فرجاد بیٹا۔ وہ دراصل.....“

اس سے پہلے کہ رائی کچھ اور کہتا فرجاد نے اس کو ایک صوفے پر بٹھادیا۔
 ”کوئی بات نہیں سر میں سمجھ سکتا ہوں کہ ذرہ اپنی جگہ پر ہی آفتاب ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے سر کہ.....!“
 ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بیٹا ذرہ اپنی جگہ پر ہی آفتاب ہوتا ہے اور جب جگہ سے ہٹ جاتا ہے تو وہ صرف
 رتہ ہوتا ہے۔..... اور..... اور میں بھی ایسا ہی ذرہ ہوں جو اپنی جگہ چھوڑ کر دوسروں کے قدموں کی دھول بر
 پکا ہے۔“ اور پھر فرجاد اور رائی کے درمیان بے شمار خاموش کلمات محو گفتگو رہے۔ آواز اور لفظوں کے بغیر
 گفتگو خاموشی۔

☆☆☆

”اباجی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“ انور نے اندر آتے ہی فکر مندی سے کہا۔

”اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔“

نجمہ نے بیوی کی آواز مزید اونچی کر کے دبے لہجے میں کہا۔ تو انور نے سن لیا۔ وہ غصے سے آگے بڑھا اور اُ
 ی آف کر دیا۔ نجمہ غصے سے گھورنے لگی۔

”میرے اباجی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور تم.....“

”ہاں تو میں نے کیا کہا..... یہ ہی کہ ہارٹ اٹیک میں اگر فوت ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت
 فرمائے۔ دعا ہی دی ہے ناں۔“

نجمہ نے ڈھٹائی سے پھرتی بیوی آن کر لیا۔ تو انور سر ہٹ کر بیٹھ گیا۔

یا اللہ! مجھے معاف فرمادے اس وقت اس بزرگی اور بڑھاپے میں جب کہ والدین کو اولاد کی سخت ضرورت
 ہے میں اپنے والدین سے دور ہوں۔ ان کی خدمت کر سکتا ہوں نہ حال احوال دریافت کر سکتا ہوں۔ کیسا بد بخت
 ہوں میں۔“

انور دونوں ہاتھوں میں سر تھا رہے رو رہا تھا سارا منظر نظروں میں گھوم رہا تھا جب اس نے نجمہ کے ساتھ

سادن سے ہے ان دو ہراساں کیا۔ سوری اور سرچور دیے دی وادی۔ وہ مان سے، سادن ہونے چاہا کہ ساتھ رہیں، مگر اس خود پرست نجمہ نے جدائی ان کا مقدر بنادی اور اس کو لاکر یہاں آنے آخر غصے میں عاق کر دیا۔ مگر حساند سے، اپنی محبت شفقت سے نہیں۔ ماں بہنوں نے دوسرے میں ڈال کر منانے کی واہل لانے کی کتنی کوشش کی مگر نجمہ کی سازشوں نے کوئی کوشش کامیاب نہیں اور اسی وجہ سے انور کو ایک محبوب بیوی جس کے لیے سب کچھ چھوڑا، اب زہر لگتی تھی۔

وہ اسی طرح بیٹھا تھا کہ تینوں بیٹیاں تیار ہو کر کہیں باہر جانے کے لیے آئیں۔
”مٹی ڈیڈ کو کیا ہوا۔“ ماریہ نے انور کو دیکھا۔

”تھنگ بیٹا بس تمہارے گریڈ پا کو ہارٹ افیک ہوا ہے۔“

”کم آن ڈیڈ۔“ بی از اولڈ مین یہ تو ہوتا تھا ناں۔ اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات بالکل اپنی ماں جیسی تھی۔ اس بات پر انور نے شدید غصے سے ماریہ کو دیکھا۔

”وہ اولڈ مین میرا باپ ہے ماریہ، مانی فادر، مگر تم لوگ کیا جانو کیا سمجھو گی رشتوں کو جن پر وہ انہیں تو باپ کے باپ کی گیارہواہو گی۔ یا اللہ مجھے معاف کر دے یہ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔“ انور دکھ کی چادر کی بکھل ماری۔ یہ مکافات عمل تھا، تربیت کی خرابی تھی کہ مغربی ماحول کا نشہ کہ سرد ہوا احساسات پر جمی برف نے رشتوں کو ختم کر دیا۔

”ماریہ! ڈیڈ کو تو ہر دوسرے دن اپنی ٹیبل سے محبت کا دورہ پڑا ہوتا ہے، ہم اپنا پروگرام کیوں پر تو اسی ماحول اور معاشرے میں رہنا ہے۔“ بیٹا نے سخت سے کہا تو انور نے ایک دم اپنا لحاف سانسے کھڑی بنی سنوری بیٹیوں کو دیکھا، ڈارک میک اپ مغربی لباس میں وہ انگریز لڑکیوں طرح کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔

”نہیں رہو گی تم لوگ اس ماحول اور معاشرے میں۔ بہت جلد میں تم لوگوں کو پاکستان بھیجے گا۔ اسی لیے میں نے گاؤں سے اپنی زمینوں کے مزارع عبدالحق کے بیٹے کو بلایا ہے۔“

اس اطلاع پر چاروں ماں بیٹیاں حیرت سے کھلمنہ لیے انور کو دیکھنے لگیں۔

”یہ سب کب ہوا۔“ نجمہ غصے سے کمر پر ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔

”میں نے دن وقت مقام لکھ کر نہیں رکھا تھا کہ تمہیں بتا سکوں۔ اور سن لو تم لوگ اب میں پوچھ گا صرف بتایا کروں گا۔ اوکے۔ اور تم تینوں کہیں نہیں جا رہی ہو اور اپنے حلیے ڈریس بدلوا۔“ انور میں بو لے جا رہا تھا۔ چاروں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کم آن ڈیڈ، ڈونٹ بی ہیولانک ٹیکسل پاکستانی ابا۔“ ابا کہتے ہوئے بیٹا نے منہ غبارہ کی ماریہ اور کوئل بھی ہنس پڑیں۔

”ہوگا..... اب ایسا ہی ہوگا۔ اب میں بالکل ٹیکسل باپ بنی ہوں گا اور اس سے پہلے پانی پر سے گزر جائے۔ اب وقت آ گیا کہ میں ایک اچھا مسلمان باپ اور پاکستانی ابا بنوں۔“

”بس کر دو انور! آج تو تم نے حد کر دی ہے۔ لگتا ہے راہی کی دوستی کا کچھ زیادہ ہی اثر لے رہے ہیں دیکھ لوں گی۔ تم میرے مشورے کے بغیر کوئی کام کیسے کرتے ہو۔“

”آئی تھمک ماریہ، ہمیں اب لگنا چاہیے۔ مام ڈیڈ کی وار تو اب لمبی چلے گی۔ بائے مام ڈیڈ۔“ تینوں نے حسب عادت جانے کی اطلاع دی۔ اور چلی گئیں۔ یہ ماحول، مغربی معاشرے، فیصد پاکستانی مسلمان گھرانوں کا تھا۔ انور جیسے باپ اپنے ہی ہاتھ کاٹ کر بے بس ہو کر اپنی ہی او

”اچھا تو گویا تم نے رات رات ہی ساری کی انکیسی میں گزاری اور میں ساری رات پریشان ہوتا رہا کہ تم کہاں گے۔ تمہارا موبائل بھی آف جا رہا تھا۔“

”ہوں۔ وہ میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی چار جر ساتھ نہیں لے کر گیا تھا۔ اور پھر ہم پاکستانی اس ل اور ٹھنڈ کے کہاں عادی، یقین کرو جو سویا ہوں تو۔“ وہ رجسٹر پر نظریں جمائے بول رہا تھا۔

”سرا رانی کا لنگ یو۔“ ویٹر لڑکے کی اطلاع پر اس نے سراٹھایا۔ اور رجسٹر بند کر کے ایک طرف رکھ کر اٹھا۔

”یار ندیم چیک رکھنا یہ ویٹر خاصی گڑبڑ کر جاتے ہیں۔ میں بات سن کر آتا ہوں۔“

”ہوں۔ فکر نہ کرو، جاؤ۔“ ندیم کا ویٹر پر بیٹھ کر گلاس کے آر پار دیکھنے لگا۔ تب ہی ماریہ ٹیٹا اور کوئل پر اس کی پڑی اس نے جلدی سے بال درست کیے۔ اور چوکتا ہو کر بیٹھ گیا۔

”سرا! آپ نے بلایا تھا۔“ فرجاد، رانی کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

رانی نے ایک چوری نظر اس پر ڈالی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے

”ہاں، فرجاد بیٹا۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم سب دیکھ لینا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ رانی

میں جھکائے کچھ کہنے کے لیے رکا۔ پھر گھر اسانس لے کر فرجاد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا۔ ”ہم کبھی کبھی

ذہنی کیے گئے فیصلوں کی سولی پر تمام عمر لٹکتے رہتے ہیں۔ زندگی میں کبھی بھی ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

لے۔ چلتا ہوں۔“

بات ادھوری چھوڑ کر رانی جا چکا تھا۔

فرجاد رات والے منظر کے سحر سے اس وقت چونکا جب ماریہ ٹیٹا اور کوئل کے ساتھ دو اور ان جیسی۔ لڑکیوں

بے باک قہقہے اسے قریب ہی سنائی دیے۔ وہ ماریہ کو پہچان چکا تھا۔ اور ان کو انڈین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں

رات لمبی کو جس حالت میں دیکھا تھا اس کا دل بہت بوجھل تھا۔

”لیس، میم آرڈر کریں۔“ ندیم ایک ویٹر کے ساتھ سامنے کھڑا ٹیٹا کو دیکھ رہا تھا۔ جو ماریہ کے ساتھ فرجاد کو

رہی تھی۔

”ویل! یہ لے آؤ۔“ کوئل نے مینو کارڈ پر کھانے کی چیزیں ویٹر کو نوٹ کروائیں۔

”اور میڈم!“ ندیم ٹیٹا کو دیکھے جا رہا تھا۔

”تھنگ مور۔ آپ ذرا اپنے میجر کو بھیجیو۔“ ماریہ کی نظریں رجسٹر پر جھکے مسلسل کچھ لکھتے ہوئے فرجاد کو دیکھ

تھیں۔

”لیس میم۔“ ندیم آگے بڑھ گیا۔ ویٹر کو ہدایات دیں کہ ان میجر کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

”اوکے سرا!“ ندیم ویٹر کو آرڈر کر کے فرجاد کی طرف بڑھا۔

”فرجاد وہ خواتین بلاری ہیں۔“

”میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ میں نکل رہا ہوں سامان لانے کے لیے اسٹور میں کافی چیزیں ختم ہو چکی

“فرجاد بے زاری سے رجسٹر بند کر کے بولا۔

”فرجاد۔ انہوں نے جو آرڈر کرنا تھا کر چکی ہیں اب تمہیں بلاری ہیں تو جاؤ۔ تمہیں اب اندازہ ہو جانا

یہ کہ اس قسم کی لڑکیاں۔ دیسی ہوں یا دیسی، ذرا سی بات پر ہمزک کر تماشا کھڑا کر دیتی ہیں۔ اس لیے جاؤ

”ٹھیک کہہ رہے ہو!“ فرجاد، ندیم سے متفق ہوتا ہوا ماریہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”میں تم!“ فرجاد نے ایک نظر اس کے بے ماک انداز خوب صورت مگر حیا سے بے نیاز چہرے پر نظر ڈالی
”ہینڈسم!“ ٹیٹا نے اپنی طرف سے تو سرگوشی کی تھی مگر فرجاد نے سن لی تھی۔

”شٹ اپ!“ ماریہ نے ٹھوکا مار کر ٹیٹا کو خاموش کروایا اور خود فرجاد کے مقابل کھڑی ہو گئی، وہ پیچ
”لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں فرجاد صاحب میں ماریہ ریاضی انگل کے فرینڈ کی بیٹی.....

”میں آپ کو پہچان چکا ہوں میم، لیکن اس دن بھی آپ ہماری آڑا ہیل کسٹر تھیں اور آج بھ
نوٹ کروا چکی ہیں۔ اگر کوئی شکایت ہے تو آئی ایم ہیئر.....“ بے زار لہجے میں کہتا ہوا وہ مڑا ماریہ پ
”اس دن آپ نے بہت اچھی کافی پلائی تھی ان فیکٹ آج بھی.....“

”ڈونٹ وری میم۔ آج بھی کافی اتنی لذیذ ہوگی۔“

وہ پھر آگے بڑھا۔ مگر ماریہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

”آپ سمجھ نہیں وہ اچھوٹکی میں، میں چاہتی ہوں کہ ہم فرینڈ بن جائیں آئی لائیک یو!
ماریہ جس ماحول کی پروردہ تھی وہاں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کے بغیر گویا زندگی مکمل نہیں
جتنی حسین تھی اتنی ہی جونی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ کی لسٹ تقریباً دیران تھی کیونکہ اسے کو
تھا، اب فرجاد پسند آ گیا تھا تو جتنی تھی کہ دوستی پر اس کا حق بنتا ہے۔ وہ اپنا خوب صورت ہاتھ ف
بڑھائے، منتظر تھی۔ دوسری طرف بھی فرجاد تھا جو عورت سے بلاوجہ کی بات چیت کو ہی نا جائز سمجھ
دور کی بات تھی۔ یوں بھی اسے تو آتے ہی اپنی منزل مل گئی تھی ٹی کی صورت میں۔ اب یہ الگ بار
کی طرف جاتے سارے راستے اتنے ٹھن اور پر خارش تھے کہ وہ پل بھر کو ٹھم جاتا۔

”سوری میم میں ان سب باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میرے مذہب میں نا محرم مرد اور عورت
سکتا ہے۔ ٹائم پاس کے لیے دوستی نہیں۔ ایکسکسوی مجھے کام سے جانا ہے۔“
فرجاد کے لہجے کا سحر ماریہ پر چھا گیا۔ ہر چند کہ لفظوں کے معنی وہ نہیں سمجھ پاتی تھی پھر بھی وہ رشتے والی با
”اوکے میں اب تم سے رشتہ بنا کر ہی دوستی کروں گی۔“

ماریہ کو لگتا تھا کہ عام سا ضرورت مند پاکستانی ہے۔ اسے اپنا لینا کون سا مشکل کام ہوگا۔ یو
مام ڈیڈ کو پسند آ چکا ہے تو پھر اس کے رویے کو اہمیت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کا آرڈر آچکا تھ
دیکھتے ہوئے اسے ہی ڈسکس کر رہی تھیں یہ وہ جانتا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں میڈم۔“ ندیم کو بڑی تشویش ہو رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ فرجاد نے بے زاری سے کہا۔

”اتنی دیر تک باتیں ہو رہی تھیں۔ اور تم کہہ رہے ہو کچھ نہیں۔“

”جب بہت دیر باتوں کے باوجود کسی بات کا مطلب نہ نکلے تو سمجھو کچھ نہیں۔ اچھا میں فکر
ہو رہی ہیں سارے آرڈر پر یک کرنے ہیں۔“ وہ جلدی جلدی کچھ چیزیں اندراج کر کے پلٹا اور
لاٹک کوٹ اور مفلر اٹھایا، لپیٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت ٹی جینی، مائیکل ا
دوستوں کے ساتھ داخل ہوئی۔

ٹی سردی میں سرد اور سرخ چہرے کے ساتھ مائیکل کا ہاتھ تھامے اسی کی بات پر ہنس رہی
مٹھیاں غصے سے میچ لگیں۔ جی تو یہ ہی چاہ رہا تھا کہ ایک مکا مار کر مائیکل کے باہر نکلے دانت نکال

ختم نہیں جان سکا تھا جو خود بھی ڈانواں ڈول تھے۔

”ایک دن ہمیں اس گندمی سے ضرور نکالوں گا ٹی، ان شاء اللہ۔“ وہ ٹی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ پیچھے ماریہ، بیٹا اور کوئل کی آواز آئی۔

”ٹی، ہم لوگ یہاں ہیں۔“

”واؤ!“ ٹی مائیکل کو چھوڑ کر ماریہ کی طرف بڑھی، فرجاد راستے میں تھا۔

”ٹیک اے سائڈ مسٹر فرجاد۔“ فرجاد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اوہ! آئی آئی ایم سوری میم، پلیز کم۔“

بوکھلا کر وہ اپنی سوچوں سے باہر آیا۔ اور راستہ دے کر خود کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ سارے ویٹرز ٹی کی طرف بھاگے۔

”تم تو جا رہے تھے، گئے کیوں نہیں۔“ ندیم نے کچھ شوخی سے کہا تو فرجاد نے رجسٹر سنبھالا۔

”جہاں ٹی میڈم ہوں میں وہاں سے مل نہیں سکتا۔“

فرجاد نے ندیم کی شوخی کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

”وجہ!“ ندیم آج ٹیٹا کی وجہ سے خاصا شوخا ہو رہا تھا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے گی تمہیں وجہ بھی۔“

”مسٹر فرجاد آج مائیکل کی برتھ ڈے ہے آج کوئی کچھ بھی آرڈر کرے، کھائے پیے، آپ کسی کا کوئی مل نہیں بتائیں گے۔“

ٹی کاؤنٹر پر کھڑی کہہ رہی تھی فرجاد نے رجسٹر کھولا اور مسکرایا۔

”مل تو میڈم ہر حال میں ہر کسی کا بنے گا۔“

”واٹ!“

☆☆☆

”ابو آپ کو پتا ہے۔ بڑی امی اور تائی امی آئی تھیں۔ سچ میں وہ بہت اچھی ہیں۔ اب تو ان سے ہماری دوستی

تاں اب ہم کب اپنے گھر جائیں گے۔“ داؤد، ساجد کو ساری رپورٹ دے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ تم کب جانا چاہتے ہو۔“

ساجد نے داؤد کے بالوں میں انگلیاں بھیرتے ہوئے کہا۔ تو وہ اچھل پڑا۔

”آج اور ابھی چلیے ناں۔“

”اوکے چلو۔“ ساجد جانے کن خیالوں میں تھے کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ داؤد خوشی میں اچھلتا گاڑی تک آ گیا۔

”ساجد! کیا کر رہے ہیں یہ تو بچہ ہے۔ اسے تو کچھ معلوم نہیں، آپ بھی چل پڑے۔ کیا بتائیں گے وہاں

بچوں کو کہ یہ کس کا بیٹا ہے؟“

منیبہ تیزی سے آگے بڑھی داؤد کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے پوچھا۔

”کہ یہ میرے ایک دوست کا بیٹا ہے۔ یہ اب ہمارے ساتھ رہے گا۔“ ساتھ لگا کر پیار سے کہا۔

ساجد کو داؤد بے حد عزیز تھا۔ چاہتے تو وہ بھی یہی تھے کہ ان کے بیٹے بھی ان کے ساتھ اس گھر میں رہیں۔

”اور ابو جب سب پوچھیں گے کہ اس کا باپ کہاں ہے تو کیا جواب دیجیے گا۔“ سوال تھا کہ چبھتا ہوا حیر

حس ساجد کے دل کے آ رہا رہا ہو گیا۔ ارمغان کے اس سوال نے ان کو بے زبان کر دیا تھا۔

”رہنے دیجیے ابو، داؤد کو نہیں پر..... جب ہمارا تعارف کرانے کی ہمت پیدا ہو جائے تو.....! ارمغان نے طنز اُکھا۔

باقی آئندہ ماہ

☆☆

پہچان پھلانی



”دیکھ لو کم سب لوگ یہ ہے میرے خوابوں کی شہزادی بیچ پھلاں رانی، پانچ پھولوں کے برابر اس کا وزن ہوگا اور صورت بالکل ایسی ہوگی اس لڑکی کی جس سے میں شادی کروں گا۔“ ہاتھ میں ریوٹ پکڑے زور علی خان نے ٹی وی اسکرین پر ایک منظر روک لیا تھا۔ فیشن شو میں ادا میں دکھائی وہ کوئی انٹرنیشنل ماڈل تھی نیلی آنکھوں اور ریشم کے لمبھوں جیسے شہرنگ بالوں کے ساتھ زیر و فکر، دراز قد اور سنہرا چمکیلا رنگ۔ بچپن سے ماں کی سنائی ہوئی کہانی کی ایک شہزادی اس کے دل و دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔

”بیچ پھلاں رانی پانچ پھولوں جتنی ہلکی کیسے ہو سکتی ہے؟“ وہ بے یقینی سے ماں کی گود میں رکھے سر کو اٹھا کر پوچھتا تو وہ سمجھاتیں۔

”ارے بچے اس سے مراد یہ ہے کہ شہزادی بہت ہلکی چمکی اور اسماٹ تھی۔ اس کی آنکھیں سمندر جیسی گہری اور دھوپ میں چمکتے آسمان جیسی نیلی تھیں اور بال گندم کی بالیوں جیسے سنہری اور ریشمی تھے۔ وہ اپنے محل کے باغ میں اس ڈر سے نہیں نکلتی تھی کہ تتلیاں پھولوں کو چھوڑ کر اس کے چہرے پر منڈل لانے لگی تھیں۔ خوشبوؤں بھری اس کی کلائی میں سجنگن میں جڑنے کے لیے ستارے بے تاب رہتے تھے۔ اس کے پاؤں میں پہنی پائل کی جھن جھن تیلیوں کے پردوں کی سرسراہٹ جیسی تھی اور چہرے کی رنگت سونے جیسی۔“ وہ اسکرین پر مسکراتی ماڈل کو جھٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں اس کی حالت دیکھ کر ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

”اس الو کو دیکھو یہ نہیں جانتا کہ پاکستانی لڑکوں کے مقدر میں خالہ یا پھوپھی کے علاوہ چچا یا ماموں کی بیٹی ہی لکھی ہوئی ہے۔“ احسن نے اک سرد آہ بھرتے ہوئے ماحول کو مزید سرد کرنے کی کوشش کی اور دھمی انداز میں بات جاری رکھی۔

”میں بھی اک زمانے میں بڑے خواب دیکھا

لرنا تھا یارو الو لڑی ہتے لے فوری بعد جب ارز بھرے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے اماں کہہا کہ ”اماں کترینہ کیف جیسی لڑکی ہی میرے سر سجے گی۔ اس سے کم نہ ہو اور اس سے زیادہ پیار کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔“ تب اماں نے اپنی چپل طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے سے جواب دیا تھا کہ بیٹا تیرا منہ کچھ زیادہ لنگہ ضرور ہے لیکن ہر لنگے ہوئے منہ والا سلیمان خان ہوتا ہمارے ہاں تو ایسے منہ والوں کو کچھ اور ہی کہا ہے۔ میں نے تو بچپن میں ہی حسنہ باجی کی بیٹی تیری بات طے کر رکھی ہے۔

”یارو! یقین کرو یہ بات سن کر سب سے میں نے اپنی قمیص کا دامن دیکھا جس سے میں اس کی ہر وقت بہتی ہوئی ناک صاف کیا کر پھر آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جب خالہ اپنی گودو پاؤں میں دبا کر زبردستی اس کے سر میں جو والا سر سچ آبریشن کر رہی ہوئی تھیں۔ ان دو منہ کے علاوہ کوئی تیسرا منظر یاد نہ آیا۔ ایسے میں کیا کہ کوئی رومانٹک فیلنگ آئی؟“ مجھے یوں خیالوں گم دیکھ کر اماں نے پوچھا۔

”بیٹا ہم روشن خیال اور پڑھے لکھے لوگ زبردستی کوئی فیصلہ تم پر نہیں تو پیش گے۔ ہم نے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ بڑے ہونے پر پوچھیں اگر بچوں کی رضا مندی شامل ہوگی تو شادی بندھن میں باندھ دیں گے۔“ یہ تقریر سن کر ایک پھر چم سے کترینہ جیسی بیوی خوابوں کی دلیر کے حقیقت کی دنیا میں اتر آئی تھی لیکن اگلا جملہ تو پٹانے جیسا تھا جو ایک بار بچپن میں جیب میں چھٹ گیا تھا اور سودے کے سارے پیسوں سے جیب بھی ساتھ لے اڑا تھا۔ میرا اور میرے آس کے پانچ دس لوگوں کا تراہ الگ نکال گیا تھا۔

”احسن بیٹا خالہ کی بیٹی پسند نہیں تو ماما چمکی بھی جوان ہو چکی ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے تو بھیا سے رشتے کی بات کروں؟“ مجھے بے

مئی جس میں اس نے پورے کیا آدمے کچا
پہن رکھے ہوتے۔

”سوری ماما مجھے اس سنہری شہابی،
رنگ کا نام نہیں معلوم آپ کو تو اچھی طرح اند
کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔“ اس کی بار
ہاجرہ بیگم نے بیٹے کو گھورا۔

”ہاں بیٹا تیرے بابا تو رنگ ساز کا کا
تھے اور میں رنگ ساز کی بیوی ہوں ناں۔
دودھ اور شہد سے جو رنگ بنتا ہے۔“ انہو
بوڑھاتے ہوئے اس کے انداز میں کہا تو دو
گیا۔

”مما۔ اب میرا منہ ایسا تو نہیں آپ کو
نقل اتارنی بھی نہیں آتی۔ آپ کیا بہو پڑ
کی؟“ اب کے ممانے میز پر پڑا ایش ٹرے
اسے ڈرایا۔

”میں تمہیں کوئی دینا ملک لگ رہی
بے چاری معصومی میرا کی تعلیم اتارنا کر
گئی تھی۔“ عزیز صاحب نے جلدی سے
ہاتھ سے ایش ٹرے لے کر واپس میز پر رکھ دیا
”بیگم آپ کو تو کسی نہ کسی بہانے یہ ایٹر
توڑنا ہوتا ہے بیڈروم میں چوہا نظر آئے یا
آئے آپ حملہ کرتی ہیں تو ایش ٹرے سے
چوہے ملی کی مثال سن کر زوار نے برا سامنہ بنا
”ہاں تو اور کیا کروں عزیز صاحب! با
لب اسٹک یا مسکارا مار کر ان خوں خوار چیز وا
مذاق تو نہیں کر سکتی نا؟“ لفظ خوں خوار چن
انہوں نے زوار علی خان کو گھورا۔

”اچھا بیٹا اب آگے بتاؤ، کیوں کہ یہ
زندگی کے فیصلے ہیں اور تمہاری مرضی سے
گے، ہماری زندگی تو بڑوں کی ہٹ دھرمی کی
چڑھ چکی ہے، ہم نہیں چاہتے کہ تاریخ ایک
دہرائی جائے۔“ انہوں نے کن انگیوں سے
طرف دیکھتے ہوئے بیٹے کے کان کے پاس

جب وہ پہلی سوچی بڑی ہوتی لڑی سب کے سامنے
آتے جاتے مجھے چنگلی کاٹ کر کہتی ”موٹے۔“ بھیا
آپ سے تھوڑا سا گوشت ادھا لینا ہے آپ کے
پاس کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔“ اور سب اس کے
مذاق اور میرے موٹاپے پر فخرے کتے ہنسنے لگتے
تھے۔ بار مجھے تو اس گھڑی اپنے سارے جسم پر
چٹکیوں کی جھن جھن محسوس ہونے لگی تھی۔ تب میں نے
خالہ کی بیٹی کو غنیمت جان کر ہاں کر دی۔

شادی کی رات سب سے پہلے میں نے درجن
بھر رومالوں کا تختہ تمہاری بھابھی کو دیا کیونکہ بائل
کے انگنا سے جدائی کے غم میں وہ سہاگ رات بھی
بس شوشوں ہی کرتی رہی تھی اس کی بہتی ناک
پونچھنے کے لیے ڈیزائنر شیروانی کا دامن تو گندا نہیں
گر مسکتا تھا۔ اور اب شادی کے بعد یہ ہی کوشش رہتی
ہے کہ اسے رونے نہ دوں جیسے ہی روتی ہے آنکھوں
سے زیادہ اس کی ناک برسنے لگتی ہے لیکن ان تمام تر
احتیاطی تدابیر کے باوجود بھی ابھی اس کی آنکھوں
سے خوشی کے آنسو بھی نکل پڑتے ہیں اور یہ توازن
برقرار رکھنے میں میری مت ماری جاتی ہے کہ بھی
خوشی بھی غم سے اسے بچائے رکھوں۔“ اس کی پتاسن
کر وہ سارے پیٹ پکڑے ہنسنے ہنسنے دوہرے
ہو گئے تھے۔ اور زوار علی خان انہیں گھورتے ہوئے
سوچ رہا تھا۔

”ایسے نمونے تو میرے خیال دھیمال میں
بھی وافر پائے جاتے ہیں لیکن میں نے کسی نمونے کو
بیوی بنا کر اپنی زندگی کو نمونہ نہیں بنانا۔ شیچ پھلاں رانی
نہیں تو کوئی نہیں۔“ اس نے اپنے عزم کو ایک بار پھر
تازہ کیا۔

☆☆☆

”اور اس کی آنکھیں نیلی۔ قد پانچ فٹ دس
انچ، رنگت دودھ اور شہد سے جو رنگ بنتا ہے بالکل
وہی ہونی چاہیے۔“ اس کی آنکھوں میں اسی ماڈل کا
سراپا بسا ہوا تھا لیکن باجوڈ صوفٹ نے اسے اسے ماں کو

جا کر سرسوی کی لوہا جڑہ بیگم نے پوریوں پر اس داسے ہوئے شوہر اور بیٹے کو باری باری کھوڑا۔

”قسم لے لو ہاجرہ بیگم! اگر میں نے اپنی زندگی کی بربادی کی کہانی اپنے بیٹے کو سنائی ہو۔ میں تو زوار سے یہ کہہ رہا تھا کہ بیٹا اب ہر کوئی تو میری طرح خوش قسمت نہیں ہو سکتا کہ جسے بنا دیکھے بنا پسند کیے خدا نے میرے دامن میں ہیرا ڈال دیا ہے، ویسا ہی اتفاق تمہارے ساتھ بھی ہو جائے۔“ زوار نے حیرت سے باپ کو بیان بدلتے ہوئے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”یار بابا! اب ایسا بھی بیگم سے کیا ڈرتا؟“

”ارے بیٹا یہ ادھر ادھر کی باتیں چھوڑیں اور مجھے صاف صاف بتائیں کہ میں کیسی لڑکی دیکھوں آپ کے لیے؟“

”مما بتاتا تو دیا میں نے آپ کو کہ لڑکی کی آنکھیں نیلی ہوں۔ قد جتنا میں نے بتایا ہے اس سے زیادہ ہو نہ کم۔“ رنگت کا اگر آئیڈیا آپ کو نہیں ہو رہا تو ایسا کر سں کہ دودھ میں تھوڑا شہد ملا کر موبائل میں پکچر لے لیں اور جہاں بھی لڑکی دیکھنے جائیں اس کی رنگت اس پکچر سے میچ کر لیں۔“ ہاجرہ بیگم کا اس بھوٹے آئیڈیے پر اسے گھورتا تو بننا تھا۔ وہ ماں کی گھوریوں کے جواب میں کان کھجانے لگا۔ ”اور یہ یاد رکھیں کہ مجھے اور دو بیٹ لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں لڑکی بہت نازک سی ہوتی جا پیسے وہ جو آپ بچپن میں مجھے ایک کہانی سنایا کرتی تھیں کہ کسی بادشاہ کی ایک بیٹی تھی اور اس شہزادی کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ اس کا وزن پانچ پھولوں کے برابر تھا اور اسے اسی نسبت سے پانچ پھولوں کی رانی کہا جاتا تھا بس ویسی ہی رانی میرے گھر کی رانی ہوگی۔“ دل کی رانی والی بات وہ کھا گیا تھا کہ ماں کے سامنے اتنا رومانٹک ڈائلاگ مناسب نہ لگا۔ اس کی بات سن کر ہاجرہ بیگم کاجی چاہا کہ اپنا سردیوار سے دے ماریں۔

”میرے بچے شہزادوں کے لیے تو شہزادوں کے رشتے جاتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ماں نہیں

اللہ بے ملاؤں۔“ ان بان والی دے دتی ہے میری ناقص معلومات میں اضافہ کے لیے آپ دیں کہ آپ کے والد صاحب کس سلطنت کے پادشاہت ہیں۔ اور کہانیاں تو میں آپ کو جگو ہا کچھوے اور خرگوش اور عمرو عمار کی زنبیل والی سنائی آئی ہوں تو کیا آپ یہ نہیں گے کہ کچھ خرگوش یا ہاتھی سے میری شادی کرادیں یا ان سے جلتی لڑکی ڈھونڈیں؟“ ان کا انداز مذاق اڑانے تھا۔ زوار نے ماں کی بات نظر انداز کرتے ہو اپنی مطلوبہ لڑکی کی صفات گنوا بی جاری رکھیں۔

”یہ یاد رکھیں کہ لڑکی ہنس مکھ ہونی چاہیے۔“ اب کے ہاجرہ بیگم بڑبڑائیں۔ مجھے افلاطون قسم کی سنجیدہ اور سڑی ہوئی شکل بنا والی لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں مجھے اپنی؟ سادگی میں جو کوالٹی جا پیسے اس میں یہ بھی ہے لڑکی ٹھیک ٹھاک پڑھی لکھی ہو کم سے کم اسے ماسٹر چاہیے۔“ اب کے ہاجرہ بیگم بڑبڑائیں۔

”شکر ہے کہ مسٹر نہیں کہا ورنہ نئے پا کر میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ زوار خاموش ہ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

”بیٹا کچھ باقی تو نہیں رہ گیا؟“

”بس ماما میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا ہے آپ اپنی پسند بھی تو دیکھیں گی نا؟“ ہاجرہ بیگم بیٹے کی بات سن کر جلع بننے انداز میں کہا۔

”بیٹا! اب اس کے بعد تو لڑکی کے بال گئے ہیں بہت شکر یہ آپ کا کہ آپ نے لڑکی کے میری پسند پر چھوڑ دیے ہیں۔“ وہ ماں کے لہجے سمجھ نہ سکا۔

”لیکن ممبا بالوں کے معاملے میں بھی مجھے کی پسند پر زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔“ اس کی بات کر بابا نے جلدی سے پہلو بدلا کیونکہ زوار کی نظر کے متنبہ سر پر تھی۔ عزیز صاحب نے اس کی نظر و محور اپنے گننے سر کو بنا دیکھا تو دیر سے غیر محو انداز میں المش ٹرے میز سے اٹھا کر ہاجرہ بیگم ہاتھ میں پکڑا دیا۔

نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔
 ”ٹھیک ہے بیٹا آپ اس معاملے میں بھی اپنی
 پسند بتادیں تو میں فیتہ اپنے ساتھ بیک میں رکھ کر
 لے جایا کروں گی۔ کیونکہ فیتے کی ضرورت بہت
 پڑے گی ہلڑکی کا قد تاننا ہوگا ہلڑکی کے بال تاننے
 ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ زبان بھی تاننی پڑے۔“
 ”میں نے خاندان کی کسی بھی کالی پٹلی نیلی
 ہلڑکی سے شادی نہیں کرنی، نہ ماں کے خاندان میں
 اور نہ ہی باپ کے خاندان میں، آپ لوگ یہ سمجھ لیں
 کہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“ اس کی بات سن کر ہاجرہ
 بیگم نے بڑے رसान سے کہا۔

”بیٹا جی ہم نے تو آپ سے یہ نہیں کہا خاندان
 میں شادی کرنی ہے، یونہی تمہاری رائے لینے کی غلطی
 کر لی تھی۔ آپ یونہی خوش فہم بنے بیٹھے ہیں ہو سکتا
 ہے کہ خاندان کی لڑکیوں نے بھی اپنے والدین سے
 یہی فرمائش کی ہو۔ آپ نے تو نام لے کر منع نہیں
 فرمایا لیکن مجھے پورا گمان ہے کہ خاندان کی لڑکیوں
 نے آپ کا نام لے کر کہا ہوگا کہ ہمیں اس سنجوس کے
 ساتھ شادی نہیں کرنی جو اپنی اتنی بڑی کامیابی پر ہم
 سب کو ڈنر کے لیے ہوٹل لے گیا اور صرف آکس کریم
 کھلا کر واپس لے آیا کہ جس ہوٹل کی صرف آکس
 کریم اتنی مہنگی ہے وہاں کا کھانا کتنا مہنگا ہوگا؟ اور ان
 کے احتجاج کرنے پر جواب دیا تو وہ بھی اتنا مضحکہ خیز
 کہ تو بہ ہی بھلی۔ اب بھلا یہ بات کرنے کی کیا تک
 تھی کہ آکس کریم سے پیٹ بھر گیا ہے کھانے کی
 منجائش نہیں بچی۔ جب جیب میں منجائش ہو تو پیٹ
 میں ہر چیز کی منجائش نکل ہی آتی ہے۔“ انہوں نے
 اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

☆☆☆

زوار علی خان ہاجرہ بیگم اور عزیز علی خان کا اکلوتا
 بیٹا تھا تعلیم مکمل کر کے بہت اچھی جاب ملنے کے بعد
 والدین کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور پوچھنے پر
 جو اس نے اپنی پسند کا نقشہ ماں کے سامنے کھینچا تو وہ

”یا خدا ان یہ تمام تر خوبیوں کا مرقع لڑکی
 کہاں سے ڈھونڈوں گی۔“ خاندان میں ہر طر
 لڑکیاں موجود تھیں بڑھا کو بھی، سلیقہ مند اور
 صورت بھی شوخ و چٹپل اور پردبار و سنجیدہ بھی
 ایک، ایک کا نام لے کر ماں نے زوار سے پوچھ
 ہر لڑکی کے نام پر اس کا سرنفی میں ہلتا دیکھ کر
 بیوی دونوں پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے
 تھے۔

”مجھے تو آیا کیا شیریں بچپن سے پسند تھی
 کے لیے لیکن کبھی ذکر نہیں کیا اس ڈر سے کہ کہیں
 کے دل میں کسی اور بچی کے لیے نرم گوشہ نہ ہو
 نے بھی تو شکفتہ کی چھٹکی علیحدہ کو بیٹی بنا رکھا۔
 ہاجرہ بیگم نے اداس لہجے میں اپنے دل کا حال
 سنایا۔

”بالکل بیگم میں نے علیحدہ بیٹی کو ہمیشہ
 نظر سے ہی دیکھا ہے۔ میں نے بھی بھی آپ
 سامنے اس خواہش کا اظہار اس لیے نہیں کیا کہ
 آنے پر دل کی بات آپ کے سامنے کروں گا۔
 وہ میری بہن کی بیٹی لیکن وہ مجھے اپنے بچوں کی
 عزیز ہے۔ بس اب تو دعا ہے کہ اللہ اس کی
 اچھی کرے۔“ وہ بھی مجھے بچے نظر آ رہے تھے
 کے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے۔ ”مما
 مجھے بار بار نہیں ملے گی جو میں دوسروں کی پسند
 گزاروں مجھے شریک حیات اپنی مرضی اور خواہش
 کے مطابق چاہیے۔“ وہ یوں تو فرماں بردار
 مثال تھا لیکن شادی کے معاملے میں تو اس نے
 کاپا پٹلی تھی کہ اس کے بدلتے لہجے کو سن کر ہاجرہ
 کی نظروں میں گر کٹ کے بدلتے رنگ سامنے آئے۔

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف
 کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگے، اور جب اس
 ڈیمانڈ کی لسٹ ماں کے سامنے رکھی تو وہ
 ناخواستہ اس مہم پر نکل کھڑی ہوئیں لیکن ہر جگہ
 مایوس ہو کر واپس آتا پڑتا تھا۔ بہت خوب ص

”دیکھیں ماما! آپ اگر بازار جائیں تو؟“
 سی چیز کے لیے کئی دکانیں چھان ماری ہیں یہ سو
 بنا کہ اس بے چارے سیلزمین پر کیا گزرے گی
 قسم کے پرنٹ نکال کر آپ کو دکھا چکا ہے اور آپ
 دیتی ہیں کہ ”تمہارے پاس ورائٹی نہیں ہے،
 وہ اطمینان سے ہاتھ میں کافی کاگ پکڑے چہ
 لے رہا تھا۔“

”بیٹا تمہیں سمجھنا ہی نہیں ہے اس لیے
 بے کار ہے۔ جسے دکانوں اور انسانوں میں فرق
 نہ آئے، وہ کیا کسی کے جذبات و احساسات
 سکے گا۔“

☆☆☆

”میرے دوست منزل صاحب نے ایک
 بتایا ہے۔“ وہ چونک کر میاں کی طرف دیکھنے لگیں
 ”وہی منزل بھائی جن کی بیٹی کو میں درجہ
 قد اور کالی آنکھوں کی وجہ سے ناپسند کر کے آ
 حالانکہ ان کی بیٹی بڑی قابل اور پیاری بچی
 بھلے آدمی ہیں منزل بھائی کہ انہوں نے اس ا
 اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔“ وہ موبائل سے چپکے
 بول رہے تھے۔

”خیر ایسے بھی اعلا ظرف نہیں ہیں مہینہ؟
 پھلائے، ماتھے پر تیوریاں چڑھائے روٹھے ر
 ملتے رہے تھے لیکن اب پھلے ہفتے ان کی بیٹی ک
 بڑی اچھی فیملی میں ہو چکی ہے اور وہ بہت خوش
 ہیں۔“

شوہر کی بات پوری ہوتے ہی وہ اٹھ کر ا
 قریب آئیں اور موبائل فون ہاتھ سے اچانک
 وہ نوٹ کر رہی تھیں کہ آج کل وہ کچھ زیادہ ہی
 موبائل میں سرگھسائے گزارتے ہیں۔

”ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو ضروری ہا
 رہا تھا۔“ ان کی اڑی اڑی رنگت بتانا سکے ہی
 دے رہی تھی کہ ضرور کچھ دال میں کالا
 موٹے شیشوں والا چشمہ لگا کر ان باکس

کسی کا وزن چیتا لیس سے اوپر ہوتا۔ ہاجرہ بیگم کو اپنا
 آپ اس وقت تو بالکل کسی قصائی جیسا لگتا جب وہ
 تو گنے والی نظروں سے معصوم لڑکیوں کو سر سے پاؤں
 تک دیکھتیں انہیں لڑکیاں نظروں ہی نظروں میں
 تو لے ہوئے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ وہ راہ چلتے ہوئے
 کسی کو بھی قول لیتی تھیں جہاں سنگل پر گاڑی رکتی وہ
 غیر ارادی طور پر ناپ تول شروع کر دیتیں۔ ”ٹریفک
 پولیس والا ایک سو کے جی، گجروں والا لڑکا ستر کے
 جی، ہاتھ میں ڈسٹر پکڑے بھیک مانگنے والی لڑکی پچپن
 کلو۔“ ابھی وہ آس پاس کے راگبیروں کو تولنے کا
 ارادہ کر رہی ہو تھیں کہ گاڑی چل پڑی۔

”بس زوار علی خان! میری ہمت جواب دے
 چکی ہے تمہاری پسند کسی ایک لڑکی میں ملنا ناممکن سی
 بات ہے اور ایک سے زیادہ کا ہمارے ہاں رواج
 نہیں ہے۔“ عزیز صاحب نے پہلو بدلا۔
 ”دوسری شادی کو رواج بنانے میں کون سی دیر
 لگتی ہے؟“

میں یہ روایت قائم کر دیتا ہوں۔“ پہلا جملہ
 باواز بلند اور دوسرا چپکے سے دل ہی دل میں دہراتے
 ہوئے، میاں کے لیے ایک تنبیہ آمیز نظر ہی کافی
 تھی۔

”کہیں نیلی آنکھیں ہیں۔ تو قد چھوٹا ہے اور
 کہیں سب کچھ ہے لیکن تعلیم واجبی سی ہے کہیں باقی
 سب کچھ ایک ہی لڑکی میں مل جاتا ہے تو اس کا وزن
 زیادہ ہوتا ہے۔ میں تو تمہاری فرمائشوں کا پیمانہ
 ساتھ لیے دوسروں کی بیٹیوں کو ریجیکٹ کرنے اور
 ان کے نازک دلوں کو توڑنے جانی ہوں اور روز کئی
 لڑکیوں کو یہ ششے چنے پڑتے ہوں گے کئی کی تو
 انگلیاں بھی زخمی ہو جاتی ہوں گی۔“

آج وہ بہت دھمکی تھیں جس گھر گئی تھیں وہاں
 تین جوان بچیاں اچھے رشتوں کے انتظار میں بائبل
 کی دہلیز پر نظر پڑیں جمائے بیٹھی تھیں کہ والدین کے
 دکھ اور بیماریوں کی وجہ خود کو سمجھ کر شرمندہ، شرمندہ بھی

”پاپا کی رانی نام کی آئی ڈی تھی وہ جوں جوں
پڑھتی گئیں ان کے کانوں پر خدشات کی جویں
رینگنے لگی تھیں۔“

”میں پاپا کی رانی ہوں۔“

عزیز احمد خان نے جواباً لکھا تھا۔ ”رانی، راجہ
کے بنا ادھوری ہوتی ہے آپ نے کچھ سوچا ہے مکمل
ہونے کے متعلق۔“

”جی میرا جیون ساتھی بہت مخلص اور ہمدرد
ہوگا۔“ اس کا جواب تھا۔

”میں ابھی ابھی ایڈمی فاؤنڈیشن کو دو بریانی
اور ایک زردے کی دیکیں یتیم بچوں کے لیے دے کر
آیا ہوں۔“

یہ لائنز پڑھ کر ہاجرہ بیگم نے ملا متی انداز میں
ان کے سفید جھوٹ پر انہیں گھورا جو شرمندگی سے
بغلیں جھانکنے پر مجبور تھے۔

”اچھا اپنی کوئی پکچر بھیجنا۔“ میاں کے چار
پانچ میسجز اصرار پر مبنی ڈلیور ہوئے تو دوسری طرف
سے رانی مکر جی کی سر پر دو پنا اپنے تصویر آگئی اور میاں
کی اس سادگی یا بے دونی پر تو وہ جل بھن کر چلی
کباب ہو گئیں کہ ادھر سے ماشاء اللہ اور سبحان اللہ
کے تا برد تو میسجز مسلسل جارہے تھے جلدی میں یہ نہ کیا
کہ چشمہ لگا کر پکچر دیکھ لیتے۔ ہاں موصوف نے سوچا
ہوگا بیگم سو جائیں یا نل جائیں تو چشمہ پہن کر پکچر کے
تمام تر نقوش و انداز حفظ کر لوں گا۔ ”انہوں ناگواری
سے انہیں دیکھ کر سوچا تو وہ گھبرا کر اپنے دامن سے
بجائے عینک کے میزک شیشہ صاف کرنے لگے۔ وہ
بیچ دوبارہ پڑھنے لگیں۔“

”اب آپ بھی اپنی پکچر بھیجیں نا؟“ دوسری
طرف سے اصرار بدستور جاری تھا ہاجرہ بیگم نے
ڈھونڈ کر اپنی اور میاں کی اک حالیہ تصویر اسے بھیج
دی، تصویر میں میاں اتنے ہی دکھائی رہے تھے کہ
جتنے اصل میں تھے۔ دوسرے ہی پل ملنے والے بیچ
کو پڑھتے ہوئے ان کے لبوں پر اک طزنیہ مسکراہٹ

”یار اپنی تصویر کا کہا تھا آپ نے ا۔
والدین کی بھیج دی؟“

ہاجرہ بیگم نے بدستور متغیر چہرے کے سا
اپنی جانب گھورتے شوہر کو اک نظر دیکھ کر لکھا۔

”یہ میں ہی ہوں ڈیر! میری عمر زیادہ نہ
صرف تیرے سال ہے یہ کیمبرے کی نہیں موبائل
پکچر ہے اور فون کا کیمبرہ اچھا نہیں تھا بالوں کی سنبھ
چہرے کی جھریاں اور طبیعت کی ناسازی سب دکھ
ہے۔“

اگلے ہی پل دوسری طرف سے ان فریڈ
نہیں بلکہ بلاک کر دیا گیا تھا۔

”کر دیا آپ کو بلاک اس رانی مکر جی نے
وہ اطلاع دے رہی تھیں اور عزیز صاحب نے
میں دل میں سوچا کاش حقیقی زندگی میں بھی یہ آ
ہوتا تو میں کم از کم چوبیس گھنٹوں میں سے پچیس گھنٹے
آپ کو بلاک کیے رکھتا۔“

☆☆☆

ہاجرہ بیگم منزل صاحب کے جاننے والوں
گھر سے رشتہ دیکھ کر واپس آئیں تو کافی خوش
رہی تھیں لیکن اس خوشی کے پیچھے سے جھانکتی
پریشانی عزیز صاحب نے عینک کے بغیر ہی از
آنکھوں میں دیکھ لی تھی

”ہاجرہ بیگم! اگر لڑکی زوار کی پسند اور معیا
پوری اترتی ہے تو پھر آپ اس قدر ابھی ہوئی
پریشان سی کیوں لگ رہی ہیں؟“ وہ اس سوال
چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

”اصل میں وہ لوگ مالی طور پر ہم سے
زیادہ مستحکم ہیں۔ بیلا کے والد حیات خان
بڑے بزنس مین ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں
لوگ رشتہ دیں یہ ناممکن سی بات ہے۔ لیکن پہلی با
لحاظ سے مکمل لڑکی ملی ہے اس لیے کوشش تو کروا
یہ اور بات کہ اونٹوں سے دوٹی رکھنے والو
دروازے اونچے کرنے پڑتے ہیں۔“ انہوں

وہ وسیع و عریض محل نما گھر کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں اور انہیں یہاں اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ یوں تو وہ بہت براعتاد اور بادقار خاتون تھیں اور اچھے کھاتے پیتے گھر کی بیٹی تھیں۔ جب کہ شادی کے بعد بھی شوہر کی افسری اور خاندانی زمینوں کے باعث اک شاہانہ زندگی انہیں اپنی دستبرد میں تھی لیکن آج انہیں احساس ہوا کہ وہ جو خود کو امیر سمجھتی رہی تھیں وہ تو واہمہ تھا کیونکہ اس گھر کی ہر چیز سے جو ٹپک رہی تھی امارت تو شاید اسے کہا اور سمجھا جاتا تھا۔ پہلا حیات خان اور مسز حیات خان ان کے مقابل بیٹھی تھیں پاؤں پر پاؤں رکھے شاہانہ انداز میں چائے کے چھوٹے چھوٹے سب لیتی پیلا نے انہیں تولیے والی نظروں سے دیکھا تو ہاجرہ بیگم بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں آج احساس ہوا تھا کہ تولتی ہوئی نظریں کیسے بدن پر سویوں کی طرح چھپتی ہیں۔ انہوں نے بغور اسے دیکھا اور اللہ کی قدرت پر دل ہی دل میں سبحان اللہ کہنے لگیں۔ اس کی نیلی آنکھوں اور نازک بدن نے اسے جو خوب صورتی بخشی تھی وہ دودھ اور شہد کے امتزاج والے رنگ سے اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

”آنٹی میں صاف بات کرتی ہوں میرے لیے روزانہ کے حساب سے کئی رشتے آتے ہیں ہمارے ہم پہلے لوگ بھی اور ہم سے زیادہ باحیثیت لوگ بھی مجھ سے رشتے کی۔ خواہش ظاہر کرتے ہیں لیکن۔“ وہ لیکن کے بعد چپ ہو گئی تھی اور ہاجرہ بیگم دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھیں کہ چلو ان لوگوں سے بھی اعلا حیثیت والے لوگ موجود ہیں مطلب یہ کہ جیسا میں اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کر رہی ہوں یہ لوگ بھی۔ ان کی سوچ کا تسلسل پیلا کی جہنروں کے ترنم اور آبشاروں کے بہاؤ جیسی سریلی آواز نے توڑا۔

”میری ایک ہی شرط ہوتی ہے کہ میں لڑکے

کروں گی آپ اپنے بیٹے سے پوچھ کر ملاقات کا وقت طے کر دیں کسی بھی اچھے ہوئے ملتے ہیں اور پھر آگے کا فیصلہ کرتے ہیں۔“ وہ برائی اور خراشاں خراشاں چلتی ہوئی اپنے بڑے والے سفید پی کے ساتھ باہر نکل گئی ہاجرہ بیگم تشویش بھری نظروں سے پی کی طرف دیکھتے سوچا۔

”لڑکی مان گئی تو اس پی کو یقیناً جہیز میں گی اور اس بلی نما کتے کے شایان شان رہنے کی فکر بھی مجھے ہی کرنی پڑے گی۔“ پیلا کی ماں نے سے ٹیبلٹ میں کچھ دیکھ رہی تھیں ہاجرہ بیگم ک سخت محسوس ہوئی کہ مہمان سامنے چپ چاپ میزبان کو کھورے جائے اور میزبان اسے لفٹ کروائے۔ لیکن بڑے لوگوں کے چلن سمجھ کر بے عزتی کا زہر پیتے ہوئے چپ ہی رہیں۔

☆☆☆

”سن لو بیٹا جی ہوٹل میں وہ کنجوسی کی نہ دہراتا یہ نہ ہو ڈنر کے ٹائم اس امیر زادی کو قبو کافی پر خرچا کر پہلا امپریٹین ہی خراب کر دو۔“ بیٹے کی فطرت سے آگاہی تھی اس لیے پیلا باندھنے والی نصیحت کچھ بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کا پلو نہ ہونے کی وجہ اس کی اوپری جیب میں دی گئی۔

”ارے آپ فکر ہی نہ کریں ماما میں اپنی دلی اور بذلہ سخی کی دھاک اس لڑکی پر بٹھا چھوڑوں گا۔“ وہ بہت پر جوش تھا اپنے آئیڈیل خواہوں کی شہزادی سے ملاقات کے تصور نے اندر اس کے دل کو لگد لگانا شروع کر دیا تھا۔

”بذلہ سخی؟“ ماں کا منہ حیرت کی زیادتی کھل گیا۔ ”بیٹا آپ کی سنجیدہ طبیعت اور کنجوسی عالم ہے کہ آپ الفاظ کا استعمال بھی پیسور استعمال کی طرح کن کن کر کرتے ہیں۔“ انہیں وہ ڈانٹنگ ٹیبل پر ایک بار آلیٹ سے انصاف

زیر حیران سے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

”میں مانتا ہوں بیٹا! کہ تمہاری ماں کی رنگت جتنی ہوئی سی ہے لیکن بیٹا اتنے سالوں میں میری بھی رنگت نہ ہوئی کہ ان کا سامنا اس سطح حقیقت سے کراؤں اور انہیں منہ پر بیگم کالی کہہ سکوں۔ تم بیٹے کو کہو؟“ باپ نے حیرانی سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ہاجرہ بیگم کے دل پر دوسری چھری ٹوہر کے ان خیالات نے چلا دی تھی۔

”ارے بابا میں آلیٹ پر چھڑکنے کے لیے کالی مرچ مانگ رہا تھا آپ نے نمک چھڑکنا شروع کر دیا۔“ زوار نے کالی مرچ آلیٹ پر چھڑکتے ہوئے اپنی صفائی دی۔

”بذلتی سخی کے مظاہرے میں الفاظ کی کفایت نفعی سے باز رہنا۔“ انہوں نے تنبیہ کی۔ ”ورنہ کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔“

☆☆☆

وہ بیلا سے ملنے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر گیا غانے برینڈ ڈبلیک ڈنس سٹ کے ساتھ منگے پر فیوم سے مہلکا وہ بیلا حیات خان کا منتظر تھا اور وقفے وقفے سے ہوٹل کے داخلی دروازے کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک دم سے ہوٹل کا شیم مار یک ماحول روشنیوں سے منور ہو گیا۔ پہلی بار کسی کی گود دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بناناں کے حال ڈالنے لگی تھیں، وہ بھی بھی تو سراپا حسن۔ قریب آنے پر زوار کی بصراتوں نے من چاہا منظر دیکھا اس کی نیلی آنکھیں بچپن میں کھیلے کچھوں جیسی چمکی اور نفاس تھیں۔ ستیوں ناک پوری شان سے کھڑی میں پری چہرہ کے کھیل حسن کو عجیب سا وقار بخش رہی تھی، قدرے باہر کی طرف نکلے اعلا برینڈ کی لب شک کی شان بڑھاتے کوئل ہونٹ اور رنگت ایسی دودھیا اور سنہری مائل ہلکی گلابی کہ جیسے دودھ اور شہد کے ساتھ گلاب کی پتیوں کا امتزاج ہو۔ زوار نے پکٹتے بل کھاتے اس کے مرمریں بدن کو دیکھتے

پسرا لگ رہی ہے بانی پریاں اور شہزادیاں تو اس کے سامنے پانی بھری ہوں گی۔ زوار نے اسے پور فخر یہ انداز میں دیکھا جیسے اس کی خوب صورتی میں اس کا بھی کوئی ہاتھ ہو۔

وہ اس کے استقبال کے لیے تعظیمی انداز میں کھڑا ہوا تو سامنے کھڑی بیلا کی بلند قامتی دیکھ کر زوار کو اپنی قدرے پست قامتی کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ہونے لگا۔

”بیٹھیں زوار صاحب۔“ وہ کسی ملکہ کی شان سے لمبی گردن قدرے اوپر اٹھائے بولی تو زوار کو دوباروں کا خیال یک وقت آیا ایک تو یہ کہ مار نے بیلا حیات خان کے لہجے اور آواز و انداز کی بہت کم تعریف کی تھی اور دوسرا یہ کہ اس کے لیے اسٹریمری جوس منگوا کر دیکھوں کہ اس کی مرمریں دودھیا گردن سے گزرتے ہوئے وہ جوس کیسا نطفہ آئے گا؟ اسے یہ تو یقین تھا کہ وہ پانی بھی پیے گی نہ دکھائی ضرور دے گا۔

”کیا سوچ رہے ہیں مسٹر زوار؟“ اس کے پوچھنے پر وہ ایک بار پھر ہونٹ پن سے اسے گھورتے ہوئے کھوسا گیا پہلی بار اتنے خوب صورت ہونٹوں سے اپنا نام سنا تھا وہ اس تجربے کا حسن اور سرور سکون کی سنگت میں محسوس کرنا چاہ رہا تھا۔ اسے زوار علی خان کو کھنکار کر متوجہ کرنا پڑا۔ ہائے کھنکار کس قدر شاعرانہ انداز لیے ہوئے ہے یوں کہ جیسے شاعر اپنے کلام سے پہلے بڑی اداسے کہتی ہے۔ ”عرض کہ ہے۔“ اس کا جی چاہا اس کھنکار کے جواب میں کہے۔ ”ارشاد ارشاد۔“ لیکن خود کو سنبھالنا تھا کہ کہیں پہلا امپریشن ہی اس لڑکی پر برا پڑ گیا تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

”مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے، اس کائنات کو سب سے حسین لڑکی سے مل کر۔“ اس نے بہت عقلمند لڑاکر یہ جملہ کہا، یہ سوچ کر کہ ایسا خطاب یا کر اس کے گالوں کی رنگت میں سرخ پتیوں کی آمیزش زیادہ

سفیدی کو سرخی ختم کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے تاثرات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اور ایسے دیگر تعریفی و صنفی تبصرے وہ سنتے رہنے کی عادی ہے۔

”اگر بطور جیون سا سہمی آپ کا ساتھ مل گیا تو یہ میرے لیے اک اعزاز ہوگا۔“ وہ تو بچھا چار ہاتھا۔

اک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلائے وہ اس کی آنکھوں سے پھوٹی خوشی اور جوش دکھ رہی تھی۔

”میں نے بھی پہلی نظر میں آپ کو پسند کر لیا ہے مجھے آپ جیسے جیون سا سہمی کی چاہ بھی تھی اور شدید خواہش بھی میری طرف سے ڈن سمجھیں۔“ بیلا

کی بات سن کر خوشی کے مارے اس کا منہ ہی بند نہیں ہو رہا تھا اس نے منہ بند کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوچا اچھا ہے کہ حسب معمول کسی ڈھابے پر

بیٹھ کر کھانا نہیں کھا رہے ورنہ اتنی دیر تک کھلے رہنے والے منہ میں دو چار کھیاں تو ضرور گھس جاتیں۔ بیلا

بھی اس کی بے ساختہ خوشی اور بے اختیاری دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔

☆☆☆

مٹکنی کی تیاری ہو رہی تھی وہ بیلا کی رضامندی کے بعد مغرور سا پھر تارہتا سارے خاندان میں بیلا

کے باپ کی امارت اور بیلا کے اپسرائی حسن و نزاکت کے چرچے تھے۔ علینہ، ماموں کے بلانے پر مٹکنی کی تیاریوں میں ان کی مدد کرنے لگی دنوں سے

ان کے گھر میں تھی۔

”اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے میری بچی! تم نے تو مجھے ہر جھنجٹ سے فارغ کر رکھا ہے۔“

ہاجرہ بیگم نے علینہ کو کام میں مگن دیکھ کر عادی۔

”مامی جی! قسمت تو خوب صورت لڑکیوں کی ہی اچھی ہوتی ہے ہم جیسی عام سی لڑکیاں تو مسترد ہونے کے لیے ہوتی ہیں۔“ علینہ بہت بردبار اور

سکھمی ہوئی لڑکی تھی آج پہلی بار اس کے لبوں پر حرف شکایت سسک رہے تھے۔

ہاجرہ بیگم نے علینہ کی دھندلی آنکھوں کی

اٹھتی ہوئی اک ٹیس کو دباتے ہوئے کہا۔

”رب بہت مہربان ہے علینہ! وہ کا عام سی شکل والی لڑکیوں کے نصیب بھی

لکھتا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں ہمارے آس پاس۔“

وہ سر جھکائے بیٹھی شاید آنکھوں کی آنکھ کی کوشش کر رہی تھی۔

”بعض اوقات ہماری آنکھوں پر سن جاتا ہے اور کھوٹے سکے بھی سونے کے لگے

حالانکہ یہ چمک فٹی ہوتی ہے اور اگر فٹی کب ساری چمکیلی چیزیں سونے کی ہوا کر

ہاجرہ بیگم کے الفاظ اس کے جلتے ہوئے دا پھوار بن کر گرنے لگے۔

”علینہ کو بھی تو مٹکنی کی شاپنگ کرنا کب سے کاموں میں پھنسی ہوئی ہے ایسا

اور علینہ آج جا کر شاپنگ کر آؤ میں تو بہت ہوں۔“ وہ واقعی بہت تھک چکی تھیں۔ بیلا

ماں کا رویہ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ انہیں ان بہت سنبھل کر بات کرنی پڑتی تھی کہ کہیں

سے نہ نکل جائے۔ زوار نے بے زاری۔ طرف دیکھا۔

”یار یعنی! تم کچھ بھی پہن لو کوئی فرق والا پھر کیوں مجھے اور خود کو بھی تھکا کی ہو؟“

سن کر سانولی سلوٹی سی علینہ عرف بیٹی نے شر احساس سے ماتھے پر جھپکتے پسینے کے قطرے د

پلو سے صاف کرتے ہوئے ماموں کی طرف ہمیشہ اسے میری پری کہہ کر بلاتے تھے۔

”ارے بیلا حیات خان کے دیوا ہوش کے ناخن لیں۔ آپ ہماری پری۔

میں کچھ الناسید حانہ بولا کر دیکھو؟“

”ہونہ پری؟ آپ نے پری دیکھی شاید جب گھر میں آجائے گی تو خبر ہوا روشنیاں ساتھ لے کر آتی ہیں۔ پر یاں آ

ی دل میں سوچ کر رہ گیا تھا۔“ وہ دونوں شاپنگ کر رہے تھے۔

”یعنی پلیز یہ کلر نہ لینا۔“ وہ شوکیس میں بچے ہلکے پچ کلر کے انارکلی فرائیڈ اور چوڑی دار پا جائے کو بار بار دیکھ رہی تھی۔

”اپنے رنگ اور لباس تو بیلا جیسی لڑکیوں پر سجتے ہیں۔“ اک مختصر سا جملہ سن کر اس کے ہاتھ ہولے سے کانپے اور اس نے اپنے آنسو چپ چاپ اپنے اندر اترنے دیے۔ شاید عام شکل و صورت کی لڑکیوں کی آنکھوں میں نہ خوابوں کے رنگ سجتے ہیں نہ ہی خوشیوں کے موسم۔ بس ان کی آنکھوں میں تو ساموں کا موسم ہی ٹھہرا رہتا ہے۔ اس نے چپکے سے خود کو اپنی اوقات میں رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے سوچا۔ سچ کتنا کڑوا ہوتا ہے منہ تو کیا ساری زندگی ہی کڑوی کر دیتا ہے

☆☆☆

”ارے کالے رنگ کی میکسی؟“ ہاجرہ بیگم نے سفید ستاروں سے بھری میکسی دیکھ کر پوچھا تو اس سے پہلے یعنی جواب دیتی وہ جلدی سے بول پڑا۔

”کالے رنگ کا لباس یعنی نے اس لیے خریدا ہے کہ کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے کہ لباس کہاں پر ختم ہوا ہے اور علیہ بی بی کہاں سے شروع ہوئی ہے۔“ اس کی مذاق اڑانی ہنسی نے علیہ کے دل پر جیسے نشتر چلا دیے۔ ماں باپ دونوں نے ملاستی انداز میں زوار کی طرف دیکھا۔

”مت کیا کرو ایسی دل دکھانے والی باتیں، وہ بہت حساس اور نازک دل کی مالک ہے، اب پہروں سے تمہاری یہ بات اداس رکھے گی۔“

”انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے خود شناسی بہت بڑی خوبی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل یہ خوبی کم یاب ہوتی جا رہی ہے۔ جسے دیکھو اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار نظر آتا ہے اور اگر غلطی سے کسی کو آئینہ دکھا بھی دو تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتا

پروائی سے بولا تو والدین نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

☆☆☆

اس شام شدید گرمی اور جس کے بعد اچانک موسم خوش گوار ہو گیا تھا ہلکی ہلکی بوند باندی نے چیدر ختوں اور پٹھولوں کو اک نیا نکھار بخش دیا تھا۔ ہاجرہ بیگم شوہر کے ساتھ زوار کے سرالگ ہوئی تھیں۔ زوار اپنے کمرے میں تھا علیہ نے فوراً اٹھا کر دیکھا تو اس کی ٹیبلیمیں رمشا کی مسڈ کال آئی ہوئی تھی۔ وہ کال بیک کرتے ہوئے موسم کا لطف اٹھانے کے لیے برآمدے کی میٹریوں پر آکر بیٹھ گئی۔

”ہاں یار میں بھی ٹھیک ہی ہوں بس اب تو در سہنے کی عادت سی ہو گئی ہے یک طرفہ محبت کیسا درد دیتا ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ تمہیں تو معلوم ہے ناں کہ میٹرک سے میں زوار کو پسند کرنی آئی ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محبت شدید سے شدید ہوتی گئی اور مجھے ماموں جان کی محبت دیکھ کر سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ میری محبت نامتو نہیں رہے گی لیکن یار یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں اکثر خواہشات اور تقدیر ایک دوسرے کے مخالف چلتے ہیں اور انسان خواہشات اور تقدیر کی اس کھینچا تانی سے ٹوٹ جاتا ہے، خود سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتا ہے جیسے کہ میں تھک چکا ہوں۔ شاید اب خواہشات بھی تقدیر کے سامنے ہار مان چکی ہیں کیوں کہ اب زیادہ تنگ نہیں کرتیں۔ چند لمحے وہ دوسری طرف سے کی جانے والی نصیحت اور تسلیاں سنتی رہی۔

”اچھا چھوڑو یار یہ بتاؤ کہ منگنی میں آؤ گی نا؟“ دوسری طرف سے بولا گیا جملہ سن کر وہ ایسا قہقہہ ا کر رہی کہ جیسے کوئی چیخ چیخ کر ماتم کرتا ہے۔

”ارے پاگل جب میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں تو تم کیوں نہیں؟ مجھے دیکھو ایک ہفتے

تہیں پر ہوں اور سب تئاریاں ہوں ہوں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں بلکہ میں تو اپنی شاپنگ بھی کر چکی ہوں ہنستے مسکراتے ان کی دہن کو دعاؤں کا تحفہ دوں گی وہ دعائیں جو میرے حق میں قبول نہیں ہوتیں۔“ وہ ابھی فون پر باتیں کر رہی تھی کہ دروازے کی اوٹ میں کھڑا زوار واپس پلٹ گیا اس نے علیحدہ کی ساری باتیں اتفاقی طور پر سن لی تھیں اور اب دل پر اک بو جھ سا محسوس ہو رہا تھا۔

”کس قدر باگل ہوتی ہیں یہ لڑکیاں بھی خود کو آئینے میں بغور دیکھ کر بھی اندازہ نہیں کر پاتیں کہ انہیں اپنے قد سے اونچے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں کہ ایسے خواب تیلیوں کی صورت دسترس میں نہیں رہتے بلکہ فلک پرستاروں کی صورت دور ہی دور سے لپکاتے رہتے ہیں کہ ہمت ہے تو آؤ ہمیں پکڑ کر دکھاؤ۔

افسوس بے چاری لڑکی! تمہاری پہنچ ان ستاروں تک کیسے ہو کہ تمہارا قد ہی چھوٹا ہے خوابوں اور خواہشات کی سیڑھیاں بھی وہاں تک نہیں جاتیں۔ تمہیں اپنے جیسے ہی کسی عام سے لڑکے سے محبت کرنی چاہیے گی۔“ وہ نخوت زدہ انداز میں سوچتے ہوئے سر جھٹک کر واپس کرے کی طرف آ گیا۔

☆☆☆

بیلا کے والدین نے شہر کا سب سے بڑا ہال بک کرایا ہوا تھا ہال بیلا کی پسند کے مطابق سجایا جا رہا تھا ایونٹ آرگنائزر نے کئی لاکھ روپے لے لیے تھے لیکن وہ ابھی تک ان کے کام سے سو فیصد مطمئن نہیں ہوئی تھی زوار بھی انٹری کی ریہرسل کے لیے اس کے ساتھ تھا۔

”بیلا مجھے لگ رہا ہے کہ آپ ہر معاملے میں بہت چوڑی ہیں؟ چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی آپ کی توجہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کو زلٹ سو فیصد چاہیے ہوتا ہے۔“ زوار دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے اسے سراہنے لگا۔

”میں نے تین سال تک آنے والے ہر رشتے کو مسترد کیا ہے، جس لڑکے سے بھی ملی ہوں مجھے وہ

پسند نہیں آیا۔“ وہ اپنے حصول معرورانہ انداز گردن اٹھائے بولی تو زوار کا سینہ فخر سے کچھ چوڑا ہو گیا۔ ”یار تو، تو بہت ہی خوش قسمت لڑکی کوئی بات تو تم میں ایسی انوکھی ہے جو اس وقت اور خوب صورت لڑکی نے تمہیں ایک ہی ملاقات میں لیا ہے۔“ وہ سامنے لگے شیشے میں خود کو دیکھتے ہوئے اپنے بال سیٹ کرنے لگا۔

”بیلا جی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ نے بڑے رومانٹک انداز میں اسے دیکھتے اجازت مانگی تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”آپ نے پہلی نظر میں مجھے دیکھتے انتخاب کر لیا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو اندر سب سے زیادہ کون سی چیز پسند آئی؟“ وہ کسی خوب صورت جملے کا۔ لیکن جو کچھ بیلا حیار نے کہا وہ تو اس کے جسم و جاں کے پر نچے اڑ چکاتے سر اور ڈوبتے دل کے ساتھ وہ سب پر جو وہ بنا کی لحاظ بنا کی احساس کے کہے جا رہی تھی ”جی زوار صاحب! میں بہت ہی صبر لڑکی ہوں اور مجھے لگی لپٹی رکھنے کی عادت نہیں ہمارے ہاں ہائی کلاس کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی جیسی میں ہوں۔ آپ کے ہاں کی ٹل کلاس میں منافقت عام ہے محبت کسی اور سے اور شادمانی اور سے کر کے عمر بھر محبت کو سینے میں چھپائے کو سینے سے لگائے زندگی گزار دیتی ہیں۔“ اس نے بتا رہا تھا کہ کچھ ایسا بولنے والی ہے جو سننے کا شاید وہ خود میں نہ پا رہا تھا اس کی سہمی ہوئی۔ ان آوازوں سے خوف زدہ تھیں کہ وہ بول پڑے۔ ”میں بڑی سچائی سے اعتراف کرتی ہوں مجھے تلاش بھی کسی بہت ہی عام سے آدمی کی ہے اتنا چھوٹا ہو کہ مجھے دیکھنے کے لیے اسے بڑے۔ جس کی رنگت ایسی ہو کہ میری کھلی کھلی گومزید نمایاں کرے جیسے سفید رنگ کے آسمانی ہلکا فیر دزی یا ایسا ہی کوئی دوسرا رنگ سفید نہ دیتا ہے نہ ابھرتا ہے لیکن اگر سفید کے

رہے دو سفید مزید صبر جاتا ہے تو میں نے اپنی حویلی کے نکھار کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے۔“

وہ سن سنا جاتا رہا تھا اس لمحے اسے اپنی ساری حیات کی سلامتی پر افسوس ہو رہا تھا۔ کیا تھا اگر میں گونگا ہو جاتا لفظ کہیں کھو جاتے اور میں گویائی سے محروم خوش فہمیاں دل میں بسائے یونہی عمر تمام کر دیتا یہ سوال ہی نہ کرتا۔ کیا تھا اگر میں بہرا ہو جاتا اور میری مردہ سماعتوں کو یہ کھولتا ہوا لادایوں نہ جلاتا، کیا تھا اگر میں اندھا ہو جاتا میری بصارتوں کو یہ منظر نہ دیکھنے پڑتے۔ کیا تھا اگر میں دیوانہ مجذوب ہوتا اور ہنسنے ہنسنے پتھروں کی چوٹیں سہتا رہتا۔ میری بصیرت کو یوں تذلیل کے چابک نہ کھانے پڑتے وہ سمجھا تذلیل بس اتنی ہی تھی لیکن اس کی جلی جیسی نوکیلی آنکھیں اس کی روح میں شکاف ڈال رہی تھیں۔

”پھر تین سالوں میں جو بھی لڑکے ملے جتنے بھی رشتے آئے سب ہی قابل ترین، ذہین و لائق فائق تھے مجھے اوپر سے خالی اور بے وقوفی کی حد تک کم فہم انسان کی تلاش تھی ذہین لوگ تو قدم قدم پر مل جاتے ہیں لیکن ماشاء اللہ آپ جیسے نمونے تو فی زمانہ نایاب ہی ہو چکے ہیں۔“ وہ اپنی طرف سے اس کی تعریف کر رہی تھی۔ روشن اور جھلکاتے ماحول میں جہاں ایک نہایت ہی رومانٹک میزک دھیمے سروں میں بج رہا تھا اور چند لمحے پہلے اس میزک کی لے پر زور علی خان کے پیر خود بخود ٹھہرنے کے لیے تیار تھے اب وہی موسیقی کبھی سانپ کی پھنکار لگ رہی تھی تو کبھی کسی برساتی ڈڈو کی پکار۔

”میں جانتی ہوں یہ سب سننا آپ کے لیے آسان نہیں ہے لیکن آپ کو بتائے بنا بھی چارہ نہیں کیونکہ آپ کو مستقبل میں میری اس عادت کے ساتھ

نباہ کرنا پڑے گا۔ میں ایک عیسائی عار سے مل بسلا اور اس عارضے کا انگریزی نام کافی مشکل ہے آہ سمجھ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ امید نہیں کہ آپ سمجھ سکیں لیے آسان اردو میں بتاتی ہوں کہ اسے نرسیت دیا جاتا ہے اس بیماری کی وجہ میری مام اور ڈیڈ لٹلکات ہیں میری مام بہت حسین خاتون ہیں میرے ڈیڈ ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ مام کو یہ ڈیڈ نے نظر انداز کیا جب دوسری عورتوں کا جھکاؤ ڈبا طرف دیکھ کر میری مام جلتی اور کڑھتی رہتی تھیں تو اکثر یہ ہی سوچتی تھی کہ مام نے بد صورت یا عام سی کے مرد کو اپنا جیون سماجی چنا ہوتا تو ان کا یہ انجام نہ تب ہی میں نے خود سے عہد کر لیا کہ اک ایسا شخص ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی جو مجھ سے ہر لحاظ سے ہوتا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے نظر جھکا کر بات کرے میرے مقابل کسی دوسری عورت کو لانے کا تصور بھی نہ کرے میری اسی خواہش کو سائیکا لو جسٹ نرسیت کہتے ہیں خود پسند ہوں اور یہ بات تسلیم بھی کرتی ہوں۔“

وہ خاموش ہوئی تو زور علی خان نے اپنے سولہوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے آئیڈیلزم کو گھر سے پکڑ کر دو تین ڈبکیاں چلو بھر پانی میں دیں اور بنور بدلی ہوئی سوچ و نظر سے بیلا حیات کی طر دیکھا، پہلی زور رنگت پر غازے کی تھیں، اندر کی طر چپکے ہوئے رخساروں پر چھیلی ہوئی ویرانی، اوپری ہر کی موٹائی اتنی تھی کہ اس پر چائے کا کپ بغیر سارے رکھا جاسکتا تھا۔ بدن اتنا ساپٹ کہ جیسے آٹھ نو سا پچی یا خوبہ سراؤں کا گھریلو جلیہ، جب وہ فنکشنز واپس آ کر دن بھر کی اضافی پہنی ہوئی چیزوں چھٹکارا یا لیتے ہوں گے۔ اب اس کی نظر لمبی مخروط

پچن اور آپ

اس ماہ صائمہ سحر کو ”پچن اور آپ“ میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی جانب سے صائمہ سحر کو تین ماہ کے لیے ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے۔

ہوئے بندر جیسا لگ رہا تھا۔
 ”کچھ کر دوزدار علی خان!“ اس نے خود کو بچا
 کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہی موقع ہے اگر یہ موقع
 سے نکل گیا تو تمام عمر بے سری ڈگڈگی پر سر میں
 رہو گے۔“

”وہ اس کا ہاتھ پکڑے خرابیاں خرابیاں چلتی
 ڈانس کے اسٹپس سمجھانے لگی تھی کہ اچانک زوہ
 خان نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور وہ
 ہی دیکھتے چکے ناظر پر گر گیا۔

☆☆☆

شہر کے سب سے بڑے پرائیویٹ ہاسپٹل
 کمرے میں جب اس نے اپنے والدین کی پر
 میں ڈوبی آوازیں سنیں، تب جھٹ سے آنکھیں
 دیں کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ چند منٹ
 اس نے آنکھیں بند رکھیں تو اس کے والد پر
 برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ان کی تو ساری زندگی
 کمائی ہی ایک بیٹا تھا۔ بلا اسے ہاسپٹل میں ایڈمر
 کے اس کے والدین کو اچانک اس کی طبیعت کی خراب
 اطلاع دے کر واپس جا چکی تھی اس نے زوار کے
 میں آنے کا انتظار بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

”میرے چندا! کیا ہو گیا تھا اچانک تمہیں
 ماں کی فکر میں ڈوبی ہوئی آواز اور باپ کا الجھا ہوا
 اسے پریشان کر گیا ان دونوں کے پیچھے وہ معصوم
 لڑکی علیہ سر جھکائے کھڑی تھی چہرے پر ش
 پریشانی واضح کھسی تھی اور اس کی آنکھیں ح
 معمول جیسی لگ رہی تھیں۔

”ماما، بابا آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں با
 ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ چند گھنٹوں میں
 آپ کو ڈسچارج کر دیں گے بس ذرا سی تھکاوٹ
 کمزوری تھی اور بھوک کی وجہ بھی تھی میں نے صبح سے
 کھایا نہیں تھا شاید اسی وجہ سے بی پی کچھ کم ہو گیا تھا۔
 وہ چند منٹ انہیں سلی دیتا رہا تب ان کی ہ
 میں جان آئی۔“ اس وقت تمہاری بیماری ہمارے۔

آنے والی انگلیوں پر پڑی تو ڈر لگنے کی حد تک ہڈیوں پر
 مشتمل ان انگلیوں نے سگریٹ کی ڈیبا پر نظر آنے
 والے ڈھانچے کی یاد دلادی تھی۔ ڈھانچہ اگر پورا نظر آتا
 تو اس کے ہاتھ یقیناً ایسے ہی ہوتے۔“ اس نے جلد
 بچنے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

”چلیں عظیم صاحب! آپ زیر ہر سٹل سرخ
 کرائیں کل فنیشن ہے اور ابھی تک کوئی تیاری نہیں
 ہے۔“ اس نے بڑے شاہانہ انداز میں ایونٹ
 آرگنائزر کو مخاطب کیا تو وہ جلدی جلدی سینک
 کرنے لگے۔ زوار علی خان کو بیلا حیات خان سے
 عجیب قسم کی دھشت ہونے لگی تھی۔

”میم آپ کے فرائڈ کو اٹھانے کے لیے زوار
 صاحب کو آپ سے پیچھے رہنا پڑے گا اور جب آپ
 اسٹیج پر بیٹھ جائیں تب یہ بھی آپ کے ساتھ بیٹھ
 جائیں گے۔ زوار صاحب آپ کے لیے قدرے
 اونچے گدے والا صوفہ رکھا گیا ہے تاکہ آپ کے اور
 بیلا میم کے قدم بہت زیادہ فرق نظر نہ آئے۔“ وہ
 زوار کی طرف دیکھ کر مضحکہ اڑانے والے انداز میں
 بولا تو اس کا چہرہ احساس توہین سے جل اٹھا۔

”ہونہہ میں اس کے باپ کا نوکر ہوں کہ
 فرائڈ پکڑ کر پیچھے پیچھے چلوں گا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”جس میوزک پر آپ دونوں نے کپل ڈانس
 کرنا ہے وہ لگاتے ہیں تاکہ آپ دونوں کچھ ٹائم
 زیر ہر سٹل کر لیں۔“ مدیم سامیوزک بجنے لگا۔

”ناصر صاحب! ہمارے اونچے طبقے میں تو یہ
 ڈانس بچپن سے ہی بچے کو سکھا دیا جاتا ہے لیکن زوار
 صاحب کے لیے یہ سب نا مشکل اور نیا ہے ان
 کے ہاں تو لڈی ڈالی جاتی ہے۔“ وہ مذاق اڑانے لگی
 اسے کل کر ہنستے ہوئے زوار نے پہلی بار دیکھا تھا
 سو کھٹے سے پوچھے منہ میں سے لمبے لمبے دانت یوں
 جھانک رہے تھے جیسے کوئی بچہ کھڑکی سے آدھا باہر
 لٹک کر بندر والے کی ڈگڈگی کا تماشا دیکھ رہا ہوتا ہے
 اس وقت اسے اپنا آپ بھی تو اس ڈگڈگی پر ناچتے

زیادہ دھمکی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح اٹھتے ہی پیلا کا فون آگیا۔

”زوار! سوری میں رات کو جلدی سو گ

کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ اس خاص دن د

جامنے کی وجہ سے میری آنکھوں کے نیچے

جائیں اور میرے حسن میں دیکھنے والوں کو

طرح کی کمی محسوس ہو۔“ وہ خاموشی سے اس کی

سن رہا تھا۔ ”ویسے مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ

آپ کو اچانک ہوا کیا تھا؟“ اس کے سر سر

انداز میں پریشانی سے زیادہ تجسس تھا۔ زوار کو

رات بھر جاگ کر فیصلہ کر چکا تھا بلکہ فیصلہ تو ا

اسی وقت کر لیا تھا جب اس نے جان بوجھ کر

آپ کو گرا دیا تھا، یہ سوچ کر کہ ساری عمر کے

سے آج کا گرنا کہیں بہتر ہے۔ پیلا جواب

وقوف سمجھ رہی تھی بلکہ کہہ بھی رہی تھی اس کے

گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ یہ ایک

سمجھے منصوبے کے تحت تھا، اس نے اگلے م

کمل کرتے ہوئے پوچھا۔

”پیلا جی! کیا رشتے کے وقت آپ کو ب

نے کچھ نہیں بتایا تھا؟“ اس کے سوال نے پیلا

دیا تھا۔

”کس معاملے میں کیا کوئی مسئلہ ہے آ

ڈبل پریشانی کا باعث ہے جس رات مہارانی کا بہت
بڑا فنکشن ہے۔ ہم اس وقت تمہاری پیاری اور کمزوری
افورڈ نہیں کر سکتے۔ ابھی تو ہم نے گھر میں لڈی کی
پریکٹس بھی کرنی ہے۔ چلو شاباش، جلدی سے ٹھیک ہو
جاؤ میرے بچے۔“ انہوں نے سہارا دے کر زوار کو اٹھایا
اور سینے سے لگا لیا۔ باپ کے کندھے پر سر رکھ کر اس
نے بغور علیحدگی کی طرف دیکھا۔ کیسا ممکن پن ہے اس
کے سانولے سلونے چہرے پر اور اس کے رخساروں پر
بسی پلکوں کا گھٹنا سایا کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ یہ بیکی بیکی
آنکھوں والی پیاری سی لڑکی اور اس کی بے لوث محبت
مجھے پہلے نظر کیوں نہیں آئی۔ پیلا سچ کہتی ہے میں بھی کتنا
بے وقوف ہوں برسوں سے یہ لڑکی مجھے ٹوٹ کر چاہ رہی
ہے اور میں نے کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ اک
تیٹی خزانے کو چھوڑ کر میں کھوٹے سکے کی تلاش میں
بھٹک رہا تھا۔

”زوار بھائی! اپنا خیال رکھا کریں میں دوپہر کو
بھی آپ کے کمرے میں کھانا لے کر آئی تھی لیکن
آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اسی لیے تو آپ کی
طبیعت خراب ہو گئی ہے کہ وقت پر کچھ کھاتے ہی نہیں
ہیں۔“ زوار کو آج پہلی بار اس طرح اسے اپنے لیے
فکر مند دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا اس کا جی چاہ رہا
تھا کہ وہ یوں ہی اس کے لیے فکر مند ہی دونوں ہاتھ
ملتی ہوئی سر ہانے کھڑی رہے اور وہ غرے دکھاتا
رہے۔ زوار نے خود ہی اپنے ہاتھ سے ڈرپ اتار کر

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بہنوں کے لئے خوب صورت ناول

☆ فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم	راحت جبین	قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	قیمت: -/400 روپے

2216361 37- اردو بازار، لاپی فون

دوسری طرف سے وہ تیرائی سے پوچھ رہی تھی۔

”مجھے دلی افسوس ہے کہ میری ماں نے آپ سے ایک کڑوا سچ چھپایا ہے۔“ زوار کے انداز میں شرمندگی تھی۔

”پلیز مجھے سچ سچ بتائیں کہ آپ لوگ کیا چھپا رہے ہیں؟“ پہلی بار اس کے انداز میں تشویش درآئی۔

”بیلا جی میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہ رہا ہوں مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا گیا کہ مجھے کبھی بھی مرگی کے دورے پڑتے ہیں اور اکثر آگ یا پانی کے پاس جاتے ہی میں بے ہوش ہو کر گر جاتا ہوں عموماً مجھے اس طرح گرنے سے کافی سنگین چوٹیں بھی آتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ ایک لاعلاج مرض ہے، اب مجھے اس بیماری کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہوگا۔ میں آپ کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اپنے سے کم ترین انسان کو اپنے جیون میں شامل کرنے کا عظیم ظرف رکھتی ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ میری اس بیماری سے باخبر ہو کر بھی آپ اپنی سابقہ عظمت کو زندہ رکھتے ہوئے مجھے قبول کریں گی۔ میں اپنی تمام عمر آپ کا احسان مند رہ کر گزاروں گا۔ کبھی کسی معاملے میں آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا اور یہ بھی میرا وعدہ ہے کہ آپ اپنے اس فیصلے پر پچھتائیں گی کبھی نہیں۔“ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی بھی بات سے اسے یہ شک ہو کہ وہ اس رشتے سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ بیلا نے اس کی بات ختم ہوتے ہی دوسری طرف سے ہٹا کچھ کہے فون بند کر دیا تھا۔

زوار نے موبائل فون کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر شرارت سے ایک آنکھ دبا کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔ اس نے اپنا کندھا تھپک کر خود کو شاباش دی۔

”کیا ہوا ہے زوار بھائی خیریت تو ہے مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ علیہ ناشتالے کر کمرے میں آئی تو اسے موبائل فون کی طرف مسکرا

را تھا مارے دھچکا ہوا اور اب بڑے سوتے میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے ماموں اور مائی کو چاہیے۔“ وہ اپنی طرف اس کی محبت لٹائی مسکرا نظروں کو بھی بے یقینی سے دیکھ رہی تھی اور اس چہرے پر صاف لکھا تھا کہ اسے زوار کے توازن ٹھیک نہ ہونے کا شک نہیں یقین ہو چکا۔ زوار نے اس کے یوں گھبرا کر کمرے سے نکل پھرتے ہوئے سوچا۔

”پہلے یار زوار علی خان آج تجھے بہت سے کرنے ہیں سب سے پہلے تو بیلا کے گھر والوں کا ڈیوٹ فون آنے سے پہلے اپنے معصوم والدین کو اعتماد میں لے اور انہیں یہ سمجھانا ہے کہ یہ سارا ڈرامہ کرنے کی صرف یہ ہے کہ وہ ان کی پسند علیہ کی محبت کو سمجھ کر کر چکا ہے اور یہ سوچ کر کہ علیہ ہی ایسی لڑکی ہے سارے گھر کو خوش رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور کئی سالوں سے دل ہی دل میں اسے چاہتی آ رہی اس نے بیلا سے جان چھڑائی ہے۔“ اب وہ سچ بتا کر کو بے عزتی کی پستیوں میں تو نہیں گرا سکتا تھا۔ شک اک نفسیاتی مریضہ نے اسے پل بھر میں ان پستیوں کی جانب دھکیل کر ساری زندگی وہیں رہنے دیا تھا لیکن وہ علیہ کی محبت کو سہارا بنا کر پستیوں سے نکل چکا تھا اور۔ یہ باتیں اس نے اپنے ہی کہیں چھپائی تھیں۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بناتے ہوئے آئینہ کے لیے لائٹ عمل تیار کرنے لگا۔ ”ابھی اپنی بیچ پھلاں رانی کو ساتھ لے جا وہی سچ کلر کا اتار ملی فراک بھی خریدنا ہے چوڑی پاجامے اور فراک میں تو وہ بالکل شہزادی لگے گی اس نے تصور میں علیہ کو اسی لباس میں دیکھا۔ اب اپنے والدین کو راضی کر کے پھپھو کی طرف رشتے بات کرنے بھی بھجوانا تھا۔ وہ گنگنا تے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

☆



انہوں نے عرض کیا کہ۔ ”پھر میں رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔“
”اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہیں (اس بارے میں) حکم اور ملے؟“

انہوں نے عرض کیا ”تو پھر میں اپنی قیاس سے کام لوں گا اور اجتہاد کروں گا اور تک پہنچنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھوں۔ یہ جواب سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا سینہ ٹھونکتے ہوئے شاباشی دی اور فرما: ”شکر اس اللہ کے لیے جس نے اپنے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جو اسے پسند ہے۔ (جامع ترمذی)“

سیپ موتی
♥ جن لوگوں کو آپ کی موت کا غم انہیں زندگی میں خوشی ضرور دیں۔
♥ آرزو نصف زندگی ہے اور بے موت۔

♥ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ اللہ تمہاری خواہشات سے بہتر ہوتے ہیں۔
♥ ہتھوڑا شیشے کو پچور پچور کر دیتا لوہے کو ایک کارآمد چیز میں ڈھال دیتا ہے کہ ہم لوہا ہیں یا شیشہ۔
♥ ہر خوب صورت چیز حاصل کرنے نہ کرو، کیونکہ چاند ستارے آسمان کی خوب لیے ہیں، دامن بھرنے کے لیے نہیں۔
نوریز شمر بٹ، ہانیہ عمران۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے.....
اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔ کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کر دے۔ عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ (سورہ المائدہ ۸)

عدل و انصاف اور حدیث نبوی
حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”قاضی (حاکمان عدالت) تین قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک جنت کا مستحق ہے اور دو دوزخ کے مستحق ہیں۔ جنت کا مستحق وہ حاکم عدالت جس نے حق کو سمجھا اور فیصلہ کیا اور جس نے حق کو سمجھنے کے باوجود ناحق فیصلہ کیا وہ دوزخ کا مستحق ہے اور اسی طرح وہ بھی دوزخ کا مستحق ہے جو بے علم اور نادان ہوئے کے باوجود فیصلے کرنے کی جرات کرتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

عدل و انصاف کی حقیقت
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قاضی بنا کر یمن کے لیے روانہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ اور قضیہ پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟“
انہوں نے عرض کیا کہ ”میں اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کے مطابق فیصلہ کروں گا۔“
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر کتاب اللہ میں تمہیں (اس بارے میں) کوئی حکم اور ہدایت نہ ملے؟“

ایک مزدور کا واقعہ

ایک رات سلطان محمود غزنوی رات کے وقت معمول کے مطابق گشت پر تھے اور ایک تندور کے پاس کسی شخص کو سویا ہوا دیکھا تو اس کو اٹھا کر پوچھا کہ وہ کون ہے۔ جواب میں اس شخص نے بتایا کہ وہ غریب مزدور ہے، دن بھر مزدوری کرتا ہے اور رات کو اس تندور کے پاس ہی سو جاتا ہے۔

سلطان نے پوچھا کہ اس سردی میں اس کی رات کیسے گزرتی ہے تو اس مزدور نے جواب میں جو کہا اس نے سلطان کو ہلا کر رکھ دیا۔

مزدور نے کہا: ”جناب نصف رات آپ کے انداز میں گزرتی ہے اور بقیہ نصف آپ سے زیادہ اچھے انداز میں گزارتا ہوں۔“

سلطان نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ وہ کیسے؟

مزدور نے جواب دیا: ”جب تک تندور گرم رہتا ہے تو میں آپ جیسی نیند سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور جب تندور ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو اٹھ کے اللہ کی عبادت شروع کر دیتا ہوں جو آپ کے مقابلے میں وقت کا بہتر استعمال ہے۔“

تبسم بشیر حسین..... ڈنکے

سفرِ اطمانے کہا

● خوشی کا راز وہ نہیں جو تم دیکھتے ہو۔ خوشی زیادہ حاصل کرنے میں نہیں، بلکہ کم میں لطف اندوز ہونے میں ہے۔

● سب سے مہربانی سے ملو کیونکہ ہر شخص اپنی زندگی میں کسی جنگ میں مصروف ہے۔

● سوال کو سمجھنا، نصف جواب کے برابر ہے۔

● تمہارا دماغ سب کچھ ہے۔ تم جو کچھ سوچتے ہو وہی بن جاتے ہو۔

گڑیا..... میانوالی

انا قابل یقین

ایک عورت نے اپنی سیملی کو فون کیا تو وہ بہت رورہی تھی۔

پوچھنے پر کہا: ”آج میرے میاں آفس جانے لگے میں نے کہا مجھے دو ہزار روپے دیتے جائے مجھے میک اپ کروانے جانا ہے۔ میاں کچھ دیر میرے چہرے کو دیکھ رہے اور پھر جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر دیے ہوئے کہا: ”یہ پیسے رکھ لو، دو سے کچھ نہیں ہوتا۔“

شنا کاشف..... ملتان

غور طلب

● لوگوں کو بے وقوف بنانے سے کہیں زیادہ مشکل کام، لوگوں کو اس بات پر قائل کرنا ہے کہ وہ بے وقوف بنائے جا رہے ہیں۔

● اگر نیٹوں کا اثر چہروں پر نظر آنے لگتا تو معاشرے کا ہر فرد نقاب کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

● مرد کا گناہ وقت کے تالاب میں کنکر کی طرح ڈوب جاتا ہے جبکہ عورت کا گناہ ساری عمر کنول کے پھول کی مانند سطح آب پر رہتا ہے۔

● ہماری پوری نسل کو یہ سبق بڑھایا جا رہا ہے کہ ج

کام مرد کر سکتے ہیں۔ وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں اب ان عمل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ عورت کو مردوں کے کام کرنے کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا بلکہ عورتوں کے ذمے وہ کام لگائے گئے ہیں جو مردوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

سحر تبسم سحری..... مغل پورہ

مجھے بجھاؤ تو

مجھے بجھاؤ تو سوچ لیتا!

تمہارے گھر میں اداسیاں جب

سیاہ راتوں کو تن پر اوڑھے

سکھن اندھیرے چمڑکنے آئیں

تو کیا کر دیگی؟

(شاعر محسن نقوی)

(سلی رب نواز... ودھیوالی بھکر)



یا سین فرید کی ڈائری میں تحریر
 داغ دہلوی کی غزل
 کوئی خوشی تو ہوئی ہے کہ ہنستے آتے ہو
 گئے تھے کیا کسی مروت پر آشنا کے تم

سب ہی اجاب سے کیا
 دشمنوں سے ہنس کے ملتا تھا
 وہ عادی دھوپ کا تھا
 اسے اپنوں نے شاید
 چھاؤں میں مارا

مزا ہو حشر میں دونوں ہوں ایک بار طلب
 ہمارے ساتھ چلو سامنے خدا کے تم
 کسی طرح نہیں ملتے بغیر دل کے لیے
 یہ دھنگ سیکھ گئے کس کی التجا کے تم

فضہ نور کی ڈائری میں تحریر
 فراق گورکھ پوری
 راز کو راز ہی رکھا ہوتا
 کیا کہنا اگر ایسا ہوتا

مجھے جو ناز ہو اپنی بے گناہی پر
 کہا انہوں نے سزا دار ہو سزا کے تم
 مری زبان جلائے سے کیا طے گا اثر
 کہ جانتے ہی نہیں ہتکنڈے دھلکے تم

کٹے کٹے کٹیں راتیں
 ہوتے ہوتے سویرا ہوتا

کیا جو شکوہ عزیزوں نے میرے قائل ہے
 کہا انہوں نے کہ قائل نہیں قضا کے تم

رات کی رات کہی میرا گھر
 تیرا رین بسیرا ہوتا

تمہارے شعر میں گرمی ہے کس قیامت کی
 جلتے ہوئے ہو مگر داغ انتہا کے تم

میں ہوں، دل بے تنہائی ہے
 تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

طاہرہ خاتون کی ڈائری میں تحریر
 سحر علی کی نظم

کچھ تو محبت کر کے دکھاتی
 کچھ تو زمانہ بدلا ہوتا

چھاؤں،

منزل منزل دل بھٹکے سکا
 آج تمہی نے روکا ہوتا

جسے اپنا نیت کے
 زہر نے زندہ نہیں چھوڑا
 جسے بیگانگی کچھ راسخ تھی اتنی
 آشنا کر ہو نہ محبت
 دل پہ اپنی سب اذیت
 وہ اپنے دوش پر بار و فاعل کر

ہم بھی فراق انسان تھے آخر
 ترک محبت سے کیا ہوتا

تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ

اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اپنی اب تک زندگی سب کچھ آپ کے تینوں پرچوں سے سیکھا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ مشکل سے نظر ہٹاتے آگے بڑھے اور محمود بابر فیصل کے لیے دعائے فرست کی۔ ”حمد و نعت“ کے بعد انٹرویوز کو پھلانگتے سیدھے پہنچے اپنی من پسند مشائخ علی کے پاس ”جڑیاں“ بہت پسند آئی۔ مشاڈیر آپ تو میری رٹ ہو آپ کی ہر تحریر بہت دل سے پڑھتی ہوں رن میں جلدی جلدی لکھا کریں۔

”زندگی تم ہی ہو“ نفیسہ سعید کا مکمل ناول بھی بردست رہا ان کی بھی ہر تحریر بہت اچھی ہوتی ہے۔ زیادہ طویل نہ لکھا کریں۔ ”ہوائیں رخ بدل نہیں“ یہ قسط دلچسپ لگی بے حد اور پچھلے ماہ سے زیادہ ظرافت پکڑ گیا پلیز زیادہ زیادہ لکھا کریں۔ مجھے ناول بہت پسند آ گیا ہے۔ افسانے سب ہی تقریباً بند آئے۔ سب نے سبق آموز لکھا۔ ”لذت عشق“ کی تمام اقساط جمع کر لی ہیں اب پڑھوں گی اور ان شاء اللہ جلد ہی تبصرہ کروں گی۔ ”کرن کتاب“ ی کرن میں ہی لگا دی چلو اچھا ہے۔ چھوٹوں کو نجانا پڑتا تھا۔ پتا نہیں کہاں گم ہو جاتی تھی؟

ج: تبسم بشیر! اپنی تحریروں کے بارے میں بکرن کے نمبر 021-32726617 پر معلوم کر سکتی ہیں۔ کرن کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

ماہنامہ بشیر حسین..... ڈنگہ

ٹائٹل اس دفعہ بہت خوب صورت تھا اسی طرح کے لائٹ ٹائٹل دیا کیجیے۔ ”کرن کتاب“ بھی آپ

نے تمارے میں ہی کتابیں لکھ دیں۔ اچھا لگا۔ اس کے بعد ایک نظر فہرست پر دوڑائی۔ ابھی پچھلے ہی خط میں ہم نے بشری ماہ کو یاد کیا تھا اور آپ نے آئے۔ آپ کا اور بشری ماہ دونوں کا ہی شکریہ۔ ”ادارہ“ میں محمود بابر فیصل انکل کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اس کے بعد حمد و نعت پڑھی ”بیاد محمود“ بہت خوب صورت الفاظ۔ انٹرویوز ”نعمان اعجاز“ سے ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے اس لیے سو سو رہی۔ ایک بات کہوں ان اشارے سے مل کر ہم بور ہو چکے ہیں۔ ”آواز کی دنیا“ میں نہیں پڑھتی۔ میری بچی سنیے، میں حبیبہ عزیز کو سنا۔ ”مقابل آئینہ“ میں ”الفت نھرہ ہراج“ کو جان کر اچھا لگا۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ اور ”شب غم کی سحر“ کی اقساط بھی بس ٹھیک ٹھاک چل رہی ہیں۔ مکمل ناول میں نفیسہ سعید کا ”زندگی تم ہی ہو“ کچھ متاثر نہ کر سکا۔ ”موراپیا“ بشری ماہ کی تحریر زبردست رہی۔ ہمارے لیے اور بھی تحریریں لکھیں۔ ”لذت غم عشق“ ایک زبردست ناول اسے اختتام کو پہنچا دیں گڈ صائبہ فریسی جی اتنے اچھا ناول لکھنے پر شاباش! ناول ”غم ہے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ نے بھی ناولٹ کا اینڈ اچھا کیا اچھا ہوا جو زیادہ طویل نہ دیا۔ ”جڑیاں“ فضا محسن علی کی اسٹوری ناول رہی۔ افسانے سارے بیٹھ رہے کشف بلوچ کا افسانہ سب پہ بازی لے گیا۔ ”کرن کتاب“ فوزیہ شمر کے جوابات پسند آئے۔ انکوری کے متعلق کافی معلومات ملیں۔ ”بیوی بکس“ میں بالوں کے متعلق لکھیں۔ مجموعی طور پر شمارہ شان دار رہا۔

ج: ماہاجی! آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہیں ان شاء اللہ جلد ہی پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ کرن کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

حمیرا اکرم..... خُند و محمد خان

میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں کرن کو پڑھ تو دو سالوں سے رہی ہوں۔ پر خط لکھنے سے ڈرتی ہوں، میرا مطلب ہے ردی کی ٹوکری سے ڈرتی ہوں پر یہ والا شمارہ اتنا اچھا تھا کہ ہمیں ردی کی ٹوکری ہی بھول

ن اور ہم، مجھ سے خط سے، میرا اب ایسے ہیں تبصرے کی طرف۔ ٹائٹل گرل، اچھی لگ رہی تھی، حمد، نعت ہمیشہ کی طرح اچھی رہیں ”یادیں نہیں جا میں گی“ میں فرح علی کی یادیں پڑھ کر اچھا لگا۔ نعمان اعجاز سے ملاقات سو، سو رہی۔ ”میری بھی سنیے“ میں حبہ عزیز سے مل کر بہت خوشی ہوئی کہ جب مجھے بہت پسند ہیں۔ ”آواز کی دنیا سے“ اشعر آغا سے ملاقات کرنا کچھ خاص نہ لگی ”مقابل ہے آئینہ“ میں الفت زہرہ سے مل کر بہت اچھا لگا سارے جوابات بہت مزے کے تھے، شاہین رشید سے درخواست ہے کہ عروہ حسین کا انٹرویو بھی شامل کریں۔ اب بھاگے اپنے فیورٹ ناول ”لذت غم عشق“ کی طرف بہت اچھا اینڈ کیا آپ نے صائمہ جی، آخر عدی اور عروہ ایک ہو ہی گئے، تنزیلہ نے بھی بہت اچھا اختتام کیا، امش نے آخر اپنے غرور کو توڑ کر چار فٹ دس انچ کی سونیا کی محبت کے آگے گھٹنے ٹیک ہی دیے، واہ زبردست، نگہت جی کے ناول ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ میں اب دلچسپ موڑ آیا ہے اب ناول اچھا ہو گا امید ہے۔ رخ جی کا ناول ”شبِ نم کی سحر“ میں اتنے کردار ہیں کہ ساتویں قسط ہے پراگھی تک کوئی مقصد ہی نہیں نکل رہا ناول کا۔ مجھے تو بہت بور کر دیتا ہے یہ ناول پڑھتے پڑھتے۔ نفیسہ جی کا مکمل ناول ”زندگی تم ہی ہو“ بازی لے گیا، اف آپ نے خیام کو اتنے سال کا انتظار کروایا، ایسی محبت تو قسمت والوں کو ہی ملتی ہے آخر میں سیکل کو بھی اپنی محبت مل ہی گئی۔ بشری ماہا کا مکمل ناول ”مورا پیا“ ٹاپ پڑھا، بہت براہو لہیا کے ساتھ اور بدلہ لینے کے چکر میں عروج نے عباد کی سچی محبت کو ٹھکرا دیا۔ آخر میں سب ٹھیک ہو گیا شکر ہے، منشا کے ناول، ”جھجک جی“ میں کوئی خاص بات نہ تھی، ایویں تھا۔ افسانوں میں ”قرۃ العین کا پہلا خواب“ بیسٹ رہا، بہت اچھا سبق تھا اس میں شاپنگ کرنے والیوں کے لیے، سدرہ حیات کا اپنائیت کے رنگ بہت پسند آیا، مستقل سلسلے اچھے رہے، ہمیشہ کی طرح۔ ”کرن کتاب“ تو اس مرتبہ بہت پسند آئی فوزیہ کو ”پچن اور آپ“ میں انعام کی حق دار ٹھہرائے جانے پر مبارک باد، پران کے

جوابات پھ پھ پیسے سے ہے۔
ج: حمیرا اکرم جی اردی کی ٹوکری ہمار ہے۔ جو خط ہمیں موصول ہوتا ہے اسے ہم ضرور ہیں۔ آپ قارئین کی رائے ہمارے لیے ہے۔ ”کرن“ کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

گڑیا..... میا نوالی
سب سے پہلے میری آپ سے گز میری امی جان کے لیے دعا کرتی ہے کہ اب جو ار رحمت میں جبکہ عطا فرمائے اور ان کے فرمائے آمین۔ پانچ جولائی کو ان کی ڈی۔تھ اب چار ماہ گزرنے کے بعد بھی ہمیں یقین امی ہمیں چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ اب آتی ہو جانب۔ سب سے پہلے ”حمد و نعت“ سے منور کیا۔ اس کے بعد انٹرویو کی جانب بڑھی کا انٹرویو شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ ”مقا“ میں الفت زہرہ کے جوابات اچھے لگے فیورٹ ناول ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ واقع ہیں لیکن یہ کیا کیا! تیمور خزینہ کو بتاتے پچ دے گا اور سونیا یقیناً ڈاکٹر کو پیسے کے ذریعہ بات بتانے سے منع کر دیں گی دیکھیں نیکہ مکمل ناول میں بشری ماہا کا ”مورا پیا“ شکر ہے عروج کو اپنی ماما کی طرح انتظار تھا اور اسے اپنی محبت مل گئی تھی۔ ناولٹ ابھی افسانوں میں سدرہ حیات کا ”اپنائیت“ دن رہا۔ باقی تمام رسالہ ابھی نہیں پڑھا۔ ”نام“ میں ثناء شہزاد کی کمی محسوس ہوئی۔ کرا انداز میں شائع کرنے کا شکریہ لیکن ایک الگ کتاب ہوتی تھی کوئی رسالہ پڑھتا تھا لیکن اب جو رسالہ پڑھے گا تو کتاب بھی میں ہوگی کیونکہ ہمارے گھر میں بھائی میرا کوشش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے کون پڑے ج: گڑیا جی! سب سے پہلے ہمار کی جانب سے آپ کی امی کے لیے منا

ہے لہہ حوی اور سے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔
 ”شب نم کی سحر“ اس تحریر میں دو کرداروں کو
 فوکس کیا ہوا ہے۔ ایک ٹی اور دوسرا فرجاد کو۔ سعدیہ
 اور سرمد باقی سلیم منزل کے کردار بھی اب تھوڑے
 تھوڑے سمجھ میں آ رہے ہیں۔ یقیناً آگے جا کے یہ
 تحریر بھی دل میں جگہ بنا لے گی۔

”ہوا میں رخ بدل گئیں“ تیمور غزنی باپ بن
 گیا ہے تو خوشی کی بات مگر یہ کیا ظلم ڈھانے لگا ہے۔
 منشا محسن علی کی ”مہجرواں“ جتنی یہ تو کمال ہی ہو گیا۔
 ہرن موللا۔ ہیر و من جس کام میں ہاتھ ڈالا وہی فٹے
 منہ ہو گیا۔ ویسے اچھی کاوش تھی۔

افسانے چاروں اچھے لگے کیونکہ ہر ایک میں
 ایک نصیحت، سبق تھا۔ ”اپنائیت کے رنگ“ آنکھوں
 میں پانی بھر آیا۔ ہائے میری پیاری بھابھی۔ مستقل
 سلسلے سارے ہی اچھے تھے۔

”نارے میرے نام“ خوب محفل جچی تھی۔ یہ بہت
 اچھا کیا جو ڈائجسٹ کے ساتھ ہی ”کرن کتاب“
 لگادی۔ اب زیادہ محفوظ رہے گی ویسے یہ آئیڈیا دیا کس
 نے ہے اور اتالیٹ کیوں۔ حلے دیر آئندہ درست آئندہ۔

”چکن اور آپ“ سب کچھ بیٹھا تھا۔ مگر میرے
 بیٹے حسین کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ کہتا ہے پھوپھو جانی
 آپ مجھے کہوں بھول گئیں میں بھی تو فراموش کر کے آپ
 سے گزرتی بنواتا ہوں۔ کیوں نہیں لکھا۔

ج: فوزیہ جی! حسب معمول دلچسپ اور بھرپور
 تبصرہ، کرن کی تمام کہانیوں اور مستقل سلسلوں پر.....
 بہت شکریہ۔ چلیں آپ کے بیٹے حسین کا تذکرہ ہم
 نے اس خط میں کر دیا۔ آپ بھول گئیں اپنے بیٹے کو
 ہم اپنے بھتیجے کو نہیں بھولے۔

فائزہ بھٹی..... چٹوکی

ٹائٹل اچھا تھا..... فہرست کے بعد آگے کی
 طرف سفر جاری رکھا۔

بابر صاحب جیسے لوگوں کا جانا ہی شاید ان موسموں
 کو اداس کر جاتا ہے..... بعض لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں

عانی، انیس جنت الفردوس میں جلد عطا فرما میں
 - کرن آپ کے گھر میں اس قدر پسند کیا جاتا
 میں یہ جان کر بہت خوشی ملی۔ کہانیوں پر تبصرہ
 را ساتھ، امید ہے کہ آئندہ تمام کہانیوں کے
 میں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔

یہ ٹمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس..... گجرات
 ادارہ پڑھا محمود بابر فیصل کی مغفرت کی دعا
 - واہ خوش کیا شاہین جی بغیر کہے نعمان اعجاز سے
 ت کروادی۔ ”میری بھی سنیے“ حبہ عزیز مجھے لگا
 کرن کی قاری ہے۔ مگر یہ تو اداکارہ ہیں۔

”آواز کی دنیا“ کووینٹنگ پر رکھا اور ”مقابل
 آئینہ“ کی ہستی الفت زہرا کی باتیں سننا شروع
 اور پھر ان کی شگفتہ باتوں نے پور نہیں ہونے
 سب سے پہلے تو آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ
 مجھے کرن کتاب مطلب ”چکن اور آپ“ میں جگہ

حیرت سے دل کی دھڑکنیں رپل کی پٹری پر چلنے
 کہ اتنی جلدی جگہ مل گئی آئی ایم سو پپی اینڈ
 س۔ چلیے اب سب سے پہلے فیورٹ لاسٹ
 پڑھتے ہیں۔ ”غم ہے یا خوشی“ آخر چار فٹ دس

اسیر محبت ہو گئی امش کی۔ خیر تحریر کا اینڈ بہت اچھا
 - آٹھ مہینوں سے دونوں میں لڑائی ہی لڑائی تھی
 بھلا کرے تنزیلہ جی..... آپ کا تھوڑا سا رومینس
 ق دار تو اب بنتے ہی تھے مگر ناں جی بار بار میری
 یاں دینے کے باوجود جو ذرا خیال کیا جائے۔

دوسرا ناول ”لذت غم عشق“ پڑھا۔ واجبی سا
 تھا۔ تو عفاف ہی دل آویز تھی۔ مانی کا مجھے سمجھ
 آیا۔ اس کا کیا کردار تھا دل آویز کی زندگی میں۔
 کی تم ہی ہو۔ ذرا جو تحریر نے متاثر کیا ہو۔ لگتا ہی

یہ نفسہ سعید کی تحریر ہے۔ ایسے لگ رہا تھا۔ کوئی
 اسٹوری ہے۔ سوری جی۔ ”مورا پیا“ خیر تحریر بھی
 ہ جگہوں پر ڈرامائی سچ لیے ہوئے تھی۔ ہاں لہیا
 جاری کا دکھ ہوا۔ ویسے بھی اللہ اپنے مخصوص
 کو چن لیتا ہے اور پھر رنج کے دکھ ان کو عطا کرتا

ان کی یاد میں جب کسی کا لکھا ہوا آئینہ پر دھتی ہوں تو بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ ان محبت نبھانے والوں میں ہم بھی شامل ہوتے..... اس وقت نہیں تھے تو اب جا کر شامل ہو جائیں۔ کیا ہمیں آپ لوگ ”ویل کم“ کریں گے۔ اگر بھی زندگی میں آتا ہوا تو.....؟ ”غم ہے یا خوشی“ اتمش دیکھا ہمیں پہلے سے ہی معلوم تھا۔ تم نے آخر میں یہ فیصلہ کرنا ہے..... سونیابی بی اب تو خوش ہوتا.....؟ انجوائے کرو ماسٹر جی واقعی میں آپ سا کوئی ”قصہ گو“ نہیں ہوگا۔ تنزیلہ ریاض مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے پر ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ غزنی صاحب یہ ظلم نہ کرنا..... بعد میں تم کو ہی مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ ہمارا کیا ہے تمہارے بعد کسی اور کو پڑھ کر دل بہلا لیں گے۔

حزہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تم آخر چاہ کیا رہے ہو..... مگر ایک بات مانو..... دو کشتیوں کا سوار ہمیشہ ڈوبتا ہی ہے۔ رخ چوہدری کا ناول اس دفعہ بھی ماثمائی رہا۔ یا شاید مجھے ہی وہ خاص متاثر نہیں کر پا رہا۔ ”لذت غم عشق“ اچھا رہا یہ ناول بھی..... ”مختصر جزیائیں“ واہ یعنی تمہارا تو وہ والا معاملہ تھا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے بہت نکلے میرے ارمان مگر پھر بھی کم نکلے

ارے یہ جو دشمن اول ہوتے ہیں نا..... یہی جان کا روگ بن جاتے ہیں..... اور یہ ”مدیرائیں“ تو بڑی ظالم لکھنیں۔ تمہارا ذرا سا بھی احساس نہ کیا۔

”مورا پیا“ کہانی اچھی تھی۔ پڑھ کر مرزا آیا، جانے ہم غصے میں یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارا غصے میں کیا جانے والا عمل..... کتنوں کو لے ڈوبے گا..... ایک ذرا سی بات آئندہ نسلوں تک چلی جاتی ہے۔ دکھوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے..... یہ دکھ زیادہ تر بے قصور لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔ نفیسہ سعید کا ناول بھی بہت اچھا تھا۔ خیام کی محبت تو دل جیت گئی۔ ارے حقیقت کی دنیا میں اب کہاں کسی کے لیے عمل تعمیر کروائے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہانیوں میں ہی کوئی ایسا

قارنٹ آفیسر تم بھی اچھے لگے ہمیں۔
ج: فائزہ جی! کرن کی کہانیوں بہت شکریہ۔

کرن عمران احمد..... سیرا چوہدری
مختبر میں ہونے والی میری بھیجی گئی ڈیجھ نے ہمیں سوگوار کر دیا۔ اس شمارے میں اپنا خط نہیں بھیج پائی۔ تمام کی اپیل ہے۔ میں اپنا ایک افسانہ بھیج ضرور بتائے گا کہ آپ کو کتنا ہے یا نہیں۔
ج: کرن جی! ہمارا ادارہ آپ لیے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت جگہ عطا فرمائے آمین۔ آپ اپنی کہا میں فون کر کے معلوم کیجیے۔

عظمیٰ چوہدری..... گو جرج
ٹائٹل گرل کی مغروری ادا کافی کے بعد ”لذت غم عشق“ پڑھنا شروع سوڈ۔ پی پی اینڈ بیک اچھی اسٹوری جلد ہی ہو گیا۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ غزنی یہ اچھا انصاف ہے۔ بڑا انصاف! راگ الاپ رہے تھے۔ لیکن محبوبہ بیوہ خزیانہ کے ساتھ یہ نا انصافی ہم برداشت گے۔ دھرنا ہو گا دھرنا ہو گا۔ جینا ہو گا مرزا اور ڈیر آپنی شہرینہ کو عقل کی بات سمجھا کر لے کر مرزا سے۔ لیکن کم خیر مرزا بھی نہ منہ ہی کیوں لگاتا ہے۔ اتمش غلام حسین ضرورت ہی تھی غرور کرنے کی جب آج کی طرف تھا۔ اچھا انفارمیشن ناول تھا والدین شرمندگی کے بجائے لڑکیوں پر معاشرے میں انقلاب ہی آ جائے گذشتہ ”شب غم کی سحر“ بھی اچھا ناو خالص اردو اچھا کامی نیشن ہے۔ الخ اتنے زیادہ ہیں دماغ کا وہی بن جاتا۔

سب سے زبردست ہوں۔ سب سے زبردست ہوں۔
 کے ”ریگ“ دوہی پڑھے ہیں اور دونوں اچھے تھے۔
 ”اور نقل ٹوٹ گیا“ میں ساس کچھ زیادہ ہی مظلوم
 تھی۔ ”مقابل ہے آئینہ“ الفت زہرہ نے اچھے
 جوابات دیے۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔
 ج: ثناء جی! کرن کی کہانیوں کو پڑھنے کا بہت
 شکریہ اشعار اور اقتباس اگر کرن کے معیار کے مطابق
 ہوئے تو ضرور شائع کریں گے۔

مریم رحمانی..... خانپور

اکتوبر کے ٹائٹل میں جو چیز سب سے زیادہ پیاری
 لگی وہ تھی ماڈل کی نیل پالش ویسے خود بھی ماڈل پیاری
 تھی۔ نعمان اعجاز میرے فیورٹ ایکٹر ہیں ان کو پڑھ کر
 اچھا لگا۔ جب عزیز میرے لیے نئی تھی۔ نگہت عبداللہ کے
 ناول میں حمزہ تو دو ڈیڑ کیوں کے بیچ بھنسانے تھا اب لگتا ہے
 کہ تیمور کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔ نہ جائے رفتن
 نہ پائے ماندن۔ بشری ماہا کے ناول میں اچھا ہوا کہ عباد
 نے عروج کے بدلے کوٹا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تزیلہ ریاض
 نے بہت اچھا اختتام کیا عین حقیقت کے مطابق۔ منشاء
 جی کی کہانی اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ
 نفیسہ سعید نے جدائی کا دورانیہ زیادہ ہی لمبا کر دیا تھا۔
 افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ ”مسکراتی کرنیں“ ہمیشہ
 کی طرح مسکراتی ہوئی تھیں۔ میں کرن میں پہلی دفعہ
 شرکت کر رہی ہوں۔ پلیز! میرا خط ضرور شائع کیجیے گا
 ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی اور بھائی سے
 لگا کی شرط ہار جاؤں گی۔ میں شاہین رشید سے کہنا چاہتی
 ہوں کہ آپ میری فیورٹ شخصیت ہیں آپ سے ملنا
 میری سب سے بڑی خواہش ہے۔

ج: مریم جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کا خط
 شائع نہ کریں۔ ہم اپنے قارئین کی ہار برداشت نہیں کر
 سکتے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی کرن کی کہانیوں پر
 تبصرہ کر کے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔

☆☆

نہیں۔ سب سے زبردست ہوں۔ سب سے زبردست ہوں۔
 کی بات نہ مانو“ تھا اس کے بعد طوبی اور نوفل
 اول نام نہیں یاد، اچھا تھا۔ ”گل کہسار“ فرح
 خانوں بر ناول تھا بہت زبردست تھا۔ ”بیلا“
 سن علی۔ ”مہجور ٹیشن“ مصباح علی سید بھی بہت
 پسندیدہ تھی۔ ”مہجور ٹیشن“ مصباح علی سید سے پوچھنا
 نہیں۔ ڈسٹری کا نام بتادیں جہاں سے نت
 نام ڈھونڈتی ہیں۔ خط شامل ہونے کی لاسٹ
 بتادیں۔ کرن کتاب علیحدہ زیادہ اچھی ہے۔
 شاعری کا شوق ہے یہ نظم میں نے خود لکھی ہے
 پلیز تھوڑی سی جگہ دے دیں باقی کرن بھی ایک
 بیسٹ اینڈ بیسٹ ہے۔

ج: تحفظ جی! نہیں..... نہیں پلیز دھرمنا نہیں
 گے۔ ہم آپ کی رائے رائے تک پہنچا دیں گے۔
 تک آپ کی نظم کی بات ہے تو ہم معذرت خواہ
 ہمارے یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے کہ جس
 ذاتی غزلیں یا نظمیں شائع کی جائیں۔

ثناء ذوالفقار نورے والی رحیم یار خان
 اکتوبر کا ٹائٹل پیارا تھا۔ سب سے پہلے انٹرویو
 ہے۔ جب عزیز بنی ادا کارہ ہیں لیکن ان کا انٹرویو کچھ ماہ
 بھی پڑھ چکے ہیں۔ لیکن یہ بھی اچھا تھا۔ نعمان
 سے ملاقات بھی اچھی لگی۔ ”آواز گی دنیا“ زیادہ
 میں نہیں پڑھتی لیکن اشعر آغا نے اینڈ میں بہت
 بات کہی کہ دنیا فانی ہے اور فانی چیز کے بارے
 کیا لکھتو سوچنا۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ تیزی
 آگے بڑھ رہا ہے۔ حمزہ کو ربیکا سے جلد جان
 رانی چاہیے ورنہ ربیکا ضرور مسئلے پیدا کرے گی۔
 ورا پیا“ بہت اچھا ناول لکھا بشری ماہانے۔ اینڈ
 عباد اور عروج نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ ”زندگی تم
 ہو“ اچھا ناول تھا۔ ”مہجور ٹیشن“ منشاء علی نے
 لکھا ان کی تحریروں کا مجھے ہمیشہ انتظار رہتا ہے
 جو مزا ان کی سنجیدہ تحریر پڑھ کر آتا ہے وہ
 جزیں پڑھ کر نہیں آتا پلیز آپ سنجیدہ استوری ہی
 میں اور جلدی سے کوئی مکمل ناول بھی لکھیں۔

کرت گئے

بھٹی بکس، فیشن اور اسٹائل، صحت، کچن اور آپ، ٹیکنالوجی اور کرن کا



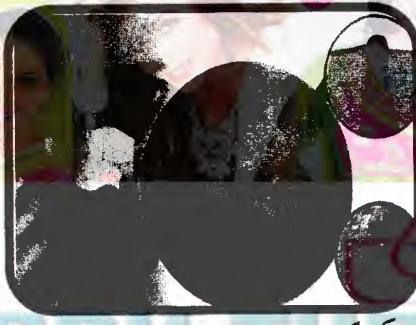
جس سے جلد چمک اٹھتی ہے۔

شہد

قدرت کی بیش بہا نعمت شہد
بیکٹیریل ہے بلکہ انٹی سپک بھی ہے۔
ہو کر چکنائی نکال کر بلیک ہیڈز کا خاتمہ
سے پیدا ہونے والے بلیک ہیڈز کے خاتمہ

جز ہے۔
نمی پہنچاتا
جلد کھمتری
ہے۔

افلت
جلد کی چمک
شادابی اور
اٹھے کی۔



خوب صورت نظر آتا ہر عورت کا خواب ہوتا اور
ہمارے حساب سے تو یہ اس کا حق بھی ہے۔ اگر آپ کی
جلد اچھی ہے تو یہ آپ کی دلکشی کو مزید بڑھاتی ہے۔ جلد کی
گھبلاہٹ کا ذکر عموماً چہرے کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔
نوجوان لڑکیاں اور خواتین جلد کے مختلف مسائل کا شکار رہتی
ہیں لیکن بلیک ہیڈز ایسا مسئلہ ہے جس سے اکثریت متاثر
ہوتی ہے۔

سامات میں جب
مردہ خلیات اور چکنائی بھر
جاتی ہے تو وہ بلیک ہیڈز کی
شکل میں ابھر کر چہرے کو بد نما
بناتے ہیں۔ بلیک ہیڈز کو
صاف کرنے کا ایک طریقہ تو
فیشل ہے لیکن آپ چاہیں تو

آسان نسخوں پر عمل کر کے نہایت کم لاگت میں اپنے
چہرے سے بلیک ہیڈز کا صفایا کر سکتی ہیں۔

بیکنگ سوڈا

بیکنگ سوڈا بلیک ہیڈز کی صفائی میں بطور
ایکسفوئیٹ استعمال ہو کر مردہ خلیات کو باہر نکالتا ہے اور
جلد صاف اور شفاف اور ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ جلد کے پی
ایچ لیول کو نیوٹرلائز کرتا ہے۔ یہ جلد کو کم روغن پیدا کرنے
پر مجبور کرتا ہے۔ اس میں پانی ملا کر بلیک ہیڈز پر لگانے
سے بلیک ہیڈز صاف ہو جاتے ہیں۔

دار چینی

یہ مفید مسالا اپنی انٹی بیکٹیریل خاصیت کی وجہ
سے بہترین فیس ماسک کے طور پر کام آتا ہے۔ اس فیس
ماسک کے ذریعے بلیک ہیڈز کی صفائی ہو جاتی ہے، ساتھ ہی
جلد پر بنے چمکے اور کیل مہاسوں کا بھی خاتمہ کرتا ہے۔ اسے
آپ باڈی اسکرپ کے طور پر بھی استعمال میں لاسکتی ہیں

ہے۔ اس میں موجود پروٹین جلد کی ٹونک کر
جھریاں ختم کرتا ہے۔ جلد کو کسنے کی صلاح
سامات کے کھلنے کی شرح کو کم رکھتا ہے۔ ا
خاص طور پر چکنی جلد والی خواتین کے لیے مو
بار سفیدی کے ذریعے بلیک ہیڈز کا صفایا کر
بلیک ہیڈز دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔

سبز چائے

بلیک ہیڈز کی صفائی میں کئی گھنٹے
بجائے آپ سبز چائے سے بلیک ہیڈز کا
کر سکتی ہیں۔ انٹی آکسیڈنٹ سے بھرپور
چکنائی کو بننے سے روکتی ہے اور حرید بلیک
ختم کر دیتی ہے۔ دو گرین ٹی کے بیگز ابال
پھر روٹی کی مدد سے گرین ٹی کو بلیک
لگا دیں۔ تھوڑی دیر بعد نرم فیس واش۔
چہرہ صاف ہو جائے گا۔

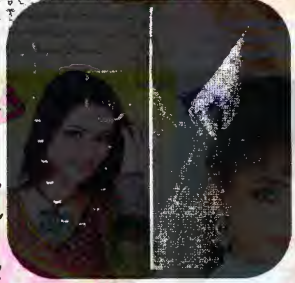
لیے ہم مختلف ماہرین سے مشورہ کے بعد ان مسائل کا حل تجویز کریں گے۔

س: سردیوں کی آمد ہے اور میری جلد بہت خشک
 مردیوں میں زیادہ مسئلہ بن جاتی ہے، اس کے لیے
 علاج بتادیں؟
 ح: آپ اپنی غذا پر خاص توجہ دیں اور سردیوں
 جراثیمی ہے تو اس کا استعمال زیادہ سے زیادہ
 اس کا جوس بنیں اور کسی بھی اچھی لیمنی کا گلیسرین
 استعمال کریں اور یہ نسخہ بھی استعمال کریں۔
 ☆ نیم کا جوس دو چمچے، کالی مرچ ایک چمچ، کرلیے کا
 چمچ، کیڑا کا جوس ایک گپ۔ یہ سب گھونٹ لیں۔
 س: پہلے میری رنگت صاف تھی مگر اب دھوپ کی
 خراب ہونی جا رہی ہے، اس کا کوئی حل بتائیں؟
 شاز یہ اعجاز..... فیصل آباد
 ح: رنگت نکھارنے کا نسخہ درج ذیل ہے:-
 ☆ گلاب کی چٹاں چند عدد، سونف ایک چمچ، پودینہ
 چمچ، جھونپی الائچی دو عدد، مصری حسب ضرورت، بادام
 عدد۔ ان تمام چیزوں کو ملا کر گرائنڈ کر لیں اور پانی میں
 گھس کر سے تک باقاعدگی سے بنیں۔
 س: میرے ہونٹ ہر وقت خشک رہتے ہیں اور ان
 ہونٹ بھی کالی ہے۔ سردیوں میں خشک ہونٹ بہت
 تکلیف دیتے ہیں۔ برائے مہربانی کوئی حل بتادیں؟
 شاز یہ اعجاز..... کراچی
 ح: سردیوں کے موسم میں پانی بہت کم پیا جاتا ہے۔
 چہرے سے جسم میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے اور جلد خشک
 بن جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانی کا استعمال کریں۔ اس
 علاوہ ہونٹوں پر گلیسرین لگائی رہا کریں۔ جب ان کی
 دور ہوگی تو یہ خود بخود گلابی ہو جائیں گے۔
 س: میری عمر تیس برس ہے اور میرے چہرے پر
 بڑھاپے کی علامتیں آ رہی ہیں، اس کا کوئی حل بتائیے؟
 ممتاز مظہر..... بکری
 ح: آپ وٹامن، اے، بی، سی جن سبزیوں اور
 سبزیوں میں موجود ہوں زیادہ استعمال کیجیے۔ ساتھ میں

جوس اور ناریل کا پانی بنیں اور یہ ٹونک استعمال کریں۔
 ☆ میٹھی پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، دہی دو کھانے
 کے چمچ، ہلدی ایک چمچ۔ ان سب کو ملا کر چہرے پر
 لگائیں، پندرہ بیس منٹ مساج کریں پھر چہرہ دھو لیں۔
 س: میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں، ان کا
 کوئی علاج بتائیں؟
 البینہ محمود..... جنگ
 ح: آپ پانی زیادہ بنیں اور نیند پوری لیں۔
 حلقوں کے لیے ٹونک مندرجہ ذیل ہے۔
 ☆ الیو پرائیل ایک چائے کا چمچ، بادام کا تیل دو
 قطرے، زیتون کا تیل دو قطرے۔ ان تیلوں کو اچھی طرح
 سے ملا لیں اور آنکھوں کے گرد ہلکے سے مساج کریں،
 پندرہ سے بیس منٹ تک لگا رہنے دیں پھر دھو لیں۔
 س: میری عمر چوبیس برس ہے، چہرے پر بال
 بہت ہیں۔ ہر بیس دن بعد قریب ایک کروانا پڑتی ہے۔
 ح: اسے دھو لیں۔
 ح: آپ کے ہوسکتا ہے کہ جریڈز میں مسئلہ ہو تو
 آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے معائنہ کروائیے۔ ہوسکتا ہے کہ
 آپ کے ساتھ ہارمونز کا مسئلہ ہو پھر بھی آپ یہ ٹونک
 استعمال کر کے دیکھیے۔
 ایک چمچ میٹھی دانہ پاؤڈر تھوڑے سے دودھ میں
 رات بھر بھگو کر رکھ دیں پھر اس کا لیس چہرے پر لگا کر ہلکا
 سا مساج کریں اور دس منٹ بعد دھو لیں۔
 س: میرے چہرے پر جھانیاں بڑھ چکی ہیں، طرح
 طرح کی کریمیں استعمال کیں، کوئی فائدہ نہیں ہوا؟
 علیزہ شاہ..... پشاور
 ح: جھانپوں کے لیے کالونی کو دودھ میں بھگو کر رکھ
 دیں، جب وہ خشک ہو جائے تو اسے بیس کر جھانپوں پر
 لگائیں۔ باقاعدگی سے استعمال کریں، جھانپاں ختم
 ہو جائیں گی۔

کتاب

عام کو بنائے خاص



شام کی
تقریبات
کے لیے آپ
اپنے
لباسات میں
آرائشی جڑاؤ یا
بروج کا

دیگر اشیاء میں استعمال ہوتے ہیں۔
چند سالوں سے زہور سے آراستہ
حصہ ہیں۔ بڑی جوتا ساز کمپنیاں جوتوں
سجا کرنت نئے ڈیزائن مارکیٹ میں
ہیں جنہیں لوگوں کی پسندیدگی بھی مل رہی
سے جڑے بروج سے سادہ جوتوں کو خاص
اگر آپ خود بھی بروج اول بدل کر جوتوں
جوئے خریدنے نہیں پڑیں گے۔ شادی،
دے جانے والے گل دستوں پھولوں
آرائشی بروج اور خوب صورت اور رنگ
جار ہے ہیں جن سے ان کی خوب صورتی



استعمال کر کے لباس کو ایک شان دار لک دے سکتی ہیں۔
اگر آپ سادہ سیاہ شلوار قمیض پر سیاہ دو پٹالیں اور دوپٹے کو
لٹکانے یا جمانے کے لیے ایک سائیز پر خوب صورت سفید
گلینوں سے جڑاؤ بروج لگائیں اور پھر دیکھیں کہ آپ کا
عام سال لباس کس قدر خاص اور شان دار بن جاتا ہے۔ اگر
آپ کو دفتر میں دیر ہوگئی اور گھر جا کر تیار ہونے کا وقت
نہیں ہے تو پرس میں سے کوئی اچھا سا بروج لٹکالیں اور
لباس پر لٹکالیں۔ یہی لباس ایونٹ ڈریس میں تبدیل
ہو جائے گا۔

ایسا نہیں ہے کہ جب لگاتے بروج کو آپ صرف شام
کے لباس کے ساتھ ہی استعمال کر سکتی ہیں۔ دن میں جو
لباس پہنتی ہیں آپ اس میں بھی ان کا استعمال کر کے عام
لباس کو خاص بنا سکتی ہیں۔ بروج کے حوالے سے اچھی بات
یہ ہے کہ یہ سستے ہوتے ہیں اور آپ افروز کر سکتی ہیں۔ تو پھر
کیوں نہ اپنی وارڈ روب کو اپ ٹو ڈیٹ رکھیں۔ موجودہ
رجحان کو مد نظر رکھ کرنت نئے بروج کو اپنے وارڈ روب کی
زینت بنالیں۔

آج کل بروج نہ صرف کپڑوں میں بلکہ تیاری کی

ہے اور ساتھ ہی محبت کا زبردست اظہار بھی
اکثر خواتین بالوں کے کلپس میں،
کرتی ہیں۔ آپ کو بازار میں بے شمار
گے جنہیں بالوں میں لگا کر آپ اپنی
بنا سکتی ہیں۔ اگر بالوں کو طریقتے سے سنو
اوپر بنانے کے بعد اس میں بروج لگا دیا
کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

☆☆

کرت کتاب



ج کل تقریباً ہر دوسرا شخص اس مسئلے سے دوچار ہے۔ دراصل انسانی جسم میں PH VALUE کی ایک توازن سطح پر برقرار رہنا نہایت ضروری ہے۔ مقررہ سطح سے زیادہ PH VALUE کا ہونا جسم میں تیزابیت کی زیادتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آئیے آج آپ کو چند ایسی ہی عام غذاؤں کے بارے میں بتائیں، جن کے استعمال سے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

شامل کر کے سوف کا شربت تیار کیجیے اور اس کا باقاعدگی سے استعمال کیجیے۔ یہ تیزابیت سے نجات دلانے میں کارگر ثابت ہوگا۔ سوف ہانسنے کے دیگر مسائل کا بھی بہترین حل ہے۔



ہے ان کے لیے کیلا بہترین انتخاب ہے۔ یہ غذا کی نالی کے اطراف میں ایک حفاظتی تہ بناتا ہے جس کے باعث پٹے میں جلن اور تیزابیت کی شکایت میں آرام آتا ہے۔ ساتھ ہی یہ ہانسنے کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔

سونف

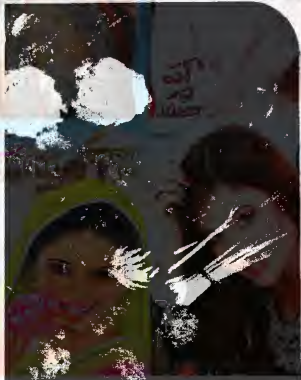
تیزابیت کے علاج میں سونف کو انتہائی موثر سمجھا جاتا ہے۔ آپ اسے دن میں کسی بھی وقت کھا سکتے ہیں۔ یہ آپ کے جسم میں PH VALUE کو متوازن سطح پر برقرار رکھتا ہے۔ اچھے ہوئے پانی میں ایک مٹھی سونف اور حسب ذائقہ شہد

ادرک

تیزابیت کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے ادرک کا استعمال صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس میں سوزش سے مقابلہ کرنے کی تمام تر خصوصیات پائی جاتی ہیں جو تیزابیت کے باعث معدے میں ہونے والی جلن اور بے چینی سے نجات دلاتی ہے۔ ادرک کا استعمال ثابت (یعنی

ہری سبزیاں

ہری سبزیاں مثلاً اسپارکس، بند گوبہ
استعمال معدے کے مسائل سے دوچار



بنا کسی چیز میں شامل کیے (یا قہوہ بنا کر بھی کیا جاسکتا ہے۔
ادرک کی چائے نہ صرف ذائقے میں بہترین ہے بلکہ
انتہائی صحت بخش بھی ہے۔

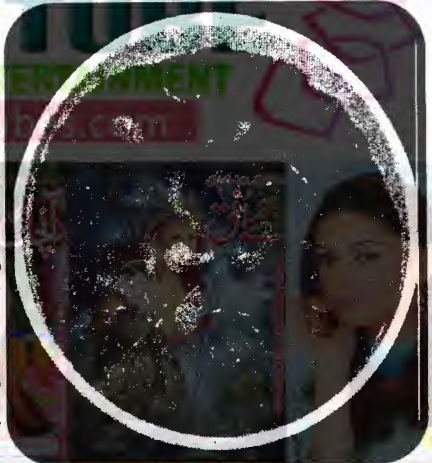
جننی کا دلیہ

جننی کا دلیہ جسم میں تیزابیت پیدا کرنے والے
اجزاء کو جذب کرتا ہے۔ یہ معدے کے اطراف میں ایک



نہایت مفید ہے کیونکہ یہ سبزیاں ہضم کرنے
اور PH VALUE متوازن رکھنے میں
ہیں تاہم ان سبزیوں کے ساتھ چکنائی
ڈریٹنگ کا استعمال کرنے سے گریز کرنا چا
کریں اور اس کے بجائے انہیں کاٹ کر ہا
دیں اور اس میں لیموں کا رس اور ذرا سا اول
کریں۔

آپ چاہیں تو تھوڑے فلیور کے اضافہ
صحت بخش جڑی بوٹیاں جیسے تلسی اور اوریکا
کر سکتی ہیں یا پودینے کے پتے شامل کر لیں
اور لال مرچ کے استعمال سے گریز کریں یہ
کر سکتی ہیں۔



حفاظتی تہ کے طور پر بھی کام کرتا ہے۔

بہتر ہے کہ کم چکنائی والے دودھ یا پانی کے ساتھ
چکنی بھر دار چینی کا استعمال کیا جائے، یہ انتہائی موثر ثابت

☆☆

کتاب

وائی فائی کی اسپید بڑھانے کے آسان طریقے

انٹرنیٹ کی سست رفتار آج کل پاکستانیوں کے لیے مسئلہ ہے۔ اکثر افراد اس سے پریشان بلکہ ڈہنی بخلا ہٹ کا شکار ہوتے ہیں۔ اب اس میں کب تک تری آتی ہے وہ تو معلوم نہیں۔ آپ کو انٹرنیٹ کی رفتار سے شکلات کا سامنا ممکنہ طور پر ہوتا ہے گا۔ تاہم کچھ ٹپس ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے وائی فائی کی رفتار کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ آئیے ہم آپ کو ایسی کچھ ٹپس دیتے ہیں جس سے آپ کے وائی فائی کی اسپید میں حیران کن اضافہ ہو جائے۔



✽ وائرلیس سکنلر نشر کرنے والی ڈیوائسز سے دور رہیں۔ وائرلیس سکنلر کو متاثر کرتے ہیں تو روٹر کو ایسے اسپیکر سے دور رکھیں یا اگر بے بی مانیٹرنگ استعمال کرتے ہیں تو بھی وائی فائی روٹر کو اس سے دور رکھیں۔

✽ پاس ورڈ کا استعمال

اپنے گھر کے براڈ بینڈ نیٹ ورک کو ایک پاس ورڈ کے ذریعے تحفظ دینا بھی رفتار کو بڑھاتا ہے۔ اگر پر نظر رکھیں کہ کون سی ڈیوائسز آپ کے نیٹ ورک کو استعمال کر رہی ہیں کیونکہ جتنی زیادہ ڈیوائسز ہوں گی انٹرنیٹ کی رفتار اتنی کم ہوگی۔

✽ اپنے روٹر کو ری بوٹ کرنا معمول بنائیں

روٹر کو ری بوٹ کرنا رفتار بڑھانے کے لیے ایک محفوظ طریقہ ہے تاہم ہر بار میٹروپولی کرنے سے وائی فائی کی رفتار سست پڑ سکتی ہے اس لیے ایک شیڈول بنائیں جو روزانہ یا ہفتہ میں ایک دفعہ روٹر کو ری بوٹ کر دے۔

✽ سکنل بوسٹر حاصل کریں

زیادہ طاقت کے انشٹا طاقت ور سکنلر بھیج سکتے ہیں جن سے روٹر کے عام انشٹا محروم ہوتے ہیں۔ سکنل بوسٹر کی مدد سے آپ وائی فائی کی رینج اور مضبوطی کو بھی بڑھا سکتے ہیں۔ ایک اور روٹر لے لیں، دوسرے روٹر کو گھر میں کئی بھی جگہ رکھ کر آپ وائی فائی سکنلر کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے میں مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

✽ پرفیکٹ اسپاٹ پر روٹر کو رکھنا

روٹر کو رکھنے کا بہترین مقام عام طور پر گھر کے میاں ہوتا ہے اور وہ بھی کسی میز یا شیلف پر۔ اپنے روٹر کو دیواروں سے دور رکھنا مددگار ثابت ہوتا ہے کیونکہ پھر آپ انشٹا سیدھا اوپر کر سکتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ گھر کے درمیان روٹر کو رکھ کر آپ ڈیڈ اسپاٹس سے بچ سکتے ہیں۔

✽ الیکٹرونک ڈیوائسز سے دور رکھنا

بیش تر افراد اپنے روٹر کو ٹیلی ویژن یا ٹیلی فون کے قریب رکھ دیتے ہیں مگر اس کے نتیجے میں سکنلر متاثر ہوتے ہیں۔ ٹی وی اور فون کے ساتھ ساتھ روٹر کو دیگر برقی ڈیوائسز جیسے ایل ای ڈی لائٹس، اسپیکر، مانیٹرنگ اور اے سی پاور کورڈ سے دور رکھنا بہتر ہوتا ہے۔

2- جب بھی ساس طفر کے نشتر آپ اتارنے کی تیاری کریں تو آپ کو چاہیے کہ ان دل پر لیے بغیر ان کا جواب ہلکے پھلکے مزاحیہ دیں۔ اگر آپ نے جواب دینے کی عادت بنا کر لی کہ ساس کی جانب سے طفر کے تیروں کا آہستہ ختم ہونے لگے گا۔

3- اگر ساس حد سے زیادہ بدسلوکی کرے ان کی باتوں کا خود جواب نہ دیں۔ اپنے درخواست کریں کہ وہ باتوں ہی باتوں میں اختیارات کے بارے میں ساس کو سمجھا دیں۔

4- ساتھ ہی بہو کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیے ساس کی جانب سے کبھی گئی ساری باتیں اپنے بتائے، اس طرح گھر کا ماحول مزید خراب ہوگا اس کے اپنی ساس کے ساتھ تعلقات مزید خراب ہیں۔

5- ابتدا سے ہی اپنے شوہر پر حکومت نہ بجائے ساس کو مختلف معاملات میں آگے رکھے اپنے شوہر کے ساتھ اکیلے گھومنے پھرنے یا شاکل لکل جائے بلکہ کبھی کبھار ساس کو اپنے ساتھ۔ ان کے ساتھ اکٹھے شاپنگ کرے، ان سے بات کرے گھر کو جوڑے رکھنے کے طور پر پتے سیکھ کرے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو کم ہیں، اگر آپ نے بھی بطور بہو ایسا ہی کیا تو آخر نہیں کہنا پڑے گا کہ ”میری ساس ڈرامہ کوئین تو ساس بالکل راس نہیں آتی۔“

عموماً ڈراموں میں ساس بہو کے کرداروں کو بہت مٹی انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ ان ڈراموں کو دیکھ کر خواتین اور لڑکیوں کے دلوں میں ”ساس“ کا خوف بیٹھ جاتا ہے۔

ساتھ ہی شادی شدہ لڑکیوں کو بھی ساس کی جانب سے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مضمون میں ان ہی مسائل پر بات کرتے ہوئے لڑکیوں کو کچھ تجاویز دے رہے ہیں۔

1- اگر ساس نے کوئی غصہ دلانے والا کام کیا ہے تو بہو کو الزامات کا کھیل شروع کرنے سے قبل ہی یہ سوچ لینا چاہیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ بیرونی حالات پر آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے، آپ صرف خود کو ہی قابو میں رکھ سکتی ہیں۔ اپنی ساس کو تہدیل کرنے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں، اس کے بجائے یہ سوچیں آپ ان حالات میں خود کو کس طرح ڈھال سکتی ہیں، اگر اس طرح سوچ رکھ کر خود کو بدلنے کی کوشش کی تو دیکھیے گا کہ کس طرح آپ کے گھر کے حالات بدل جائیں گے۔

ساس کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے تو ترکی بہ ترکی جواب ہرگز نہ دیں۔ ان میں موجود مٹی پہلوؤں کی جانب ہی غور نہ کریں۔ کوشش کریں کہ ان کے مثبت پہلوؤں کو دیکھیں، ان کی اچھائیوں کو ذہن میں لے کر آئیں۔ اس طرح آپ فوراً غصہ کرنے اور جواب دینے سے خود کو روک پائیں گی۔ جن معاملات کی وجہ سے جھگڑا ہوتا ہے، ان پر ساس کی رائے لیں۔ اپنے گھر کے طور طریقوں کو ساس پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ساس کے طور طریقوں کو اپنانے کی کوشش کریں۔ مختلف معاملات میں ان کی رائے ضرور لیں اور اس رائے کا احترام بھی کریں۔ عموماً مشرقی ساسوں کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ بہو ان کے بیٹے کو ان سے جھین رہی ہے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے اپنے شوہر کو بھی سمجھائیں کہ وہ اپنی ماں کو پہلے کی طرح ہی وقت دیں۔

کھانے پینے کی اشیاء میں معز صحت کیمیکلز اور گندے
نی کی وجہ سے اب دنیا بھر میں Organic اشیاء کے

استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن
زار سے خریدنے میں یہ مہنگی پڑتی
ہیں لہذا صحت کے لیے تازہ سبزیاں
اور پھل خود اگانے کا رجحان تیزی
سے بڑھ رہا ہے۔ آپ بھی اپنی
سبزیاں اور پھل خود اگائیں اور معز
صحت کیمیکلز اور زہر پلے پانی سے
بیدا کی ہوئی سبزیوں اور پھلوں سے
محفوظ رہیں۔



ڈالیں تاکہ بیج دب جائے۔

ان کو اگاتے وقت باغبانی کے چند اصولوں کا اگر خیال
نہ رکھا جائے تو ہماری کی گئی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ کبھی بیج
نہیں بھونٹے، کبھی پودا سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے یا پھر پھل، پھول
س پر کم آتے ہیں۔ بیج تو یہ ہے کہ پودا لگانے کا درست
نڈاز ہی پودے کی زندگی کا سبب بنتا ہے پھر بیج کو بونے کا
نڈاز بھی مختلف ہوتا ہے۔ کچھ بیج گہرائی میں بونے جاتے
ہیں اور کچھ کو ایک انچ زمین کے نیچے دبا دیا ہی کافی ہے۔

اگر آپ کے گھر میں کیاری نہیں ہے تو گھلوں یا
چھوٹے کنٹینرز میں بھی پودے لگا سکتی ہیں بلکہ کپڑے
دھونے کے تسلی بھی اس کے لیے مناسب ہوتے ہیں۔ اگر
آپ پودے لگانے سے پہلے چند اصول ملحوظ خاطر رکھیں تو
کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو اس میں ناکامی ہو۔

1۔ درست گیلے کا انتخاب بھی پودوں کی بڑھوتری
کے لیے ضروری ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں ایک سے زیادہ
سوراخ ہوں تاکہ اضافی پانی آسانی سے خارج ہو سکے۔
پانی کی زیادتی جڑ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

2۔ درست پودے کا انتخاب بھی ضروری ہے کہ آپ
جہاں پودا رکھنا چاہ رہی ہیں وہاں روشنی اور کتنی دیر تک دھوپ

آتی ہے۔ بعض پودوں کو زیادہ دھوپ اور بعض کو کم دھوپ کی
ضرورت ہوتی ہے لہذا جگہ، موسم اور درجہ حرارت کے
مطابق پودے منتخب کریں۔

3۔ مٹی اور کھاد کے مرکب میں
مناسب مقدار میں پانی کا
موجودگی ضروری ہے۔ کون سا
پودے کے لیے گھلا تیار کیا جا رہا
ہے، اس کے مطابق پانی ڈالیں
اگر بیج ڈالنا ہے تو مطلوبہ گہرائی میں
بیج ڈال کر اس کے اوپر نرمی سے مٹی

4۔ پانی کب تک اور کس وقت ڈالنا چاہیے۔ آ
بہار کا موسم ہے تو ہفتے میں ایک دن پانی ڈال سکتے ہیں
گرمی کے موسم میں پانی کی زیادہ ضرورت صرف اس لیے
نہیں ہوتی کہ گرمی سے پانی بھاپ بن کر اڑ رہا ہے بلکہ
اس لیے زیادہ پانی چاہیے کہ یہ پودوں کو بڑھنے میں مدد
دیتا ہے۔ چھوٹے گھلوں میں گے پودوں کو دن میں
مرتبہ صبح، شام پانی ڈالیں البتہ بڑے گیلے میں دن میں
ایک مرتبہ پانی ڈالیں۔

پانی اس وقت تک ڈالیں جب تک کہ گیلے کے پے
سوراخ سے پانی باہر نہ نکلنے لگے۔ اس طرح پتا چل جائے
کہ پانی نیچے جڑ تک پہنچ گیا ہے اور پودے کی جڑ خشک نہیں
ہے، صرف پتوں پر پانی ڈالنا کافی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ
دھوپ میں پودوں کو پانی نہ دیں بلکہ صبح اور شام میں جب
دھوپ نہ ہو اس وقت پانی ڈالیں۔ یقیناً اگر آپ ان اصولوں
کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے گھلوں میں پودے لگائیں گی
کوئی وجہ نہیں کہ آپ کا گھر سبز اور شاداب نظر نہ آئے۔

☆☆

تبرے تھے اس ڈش پر؟

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟

ج: ”پہلی ڈش ”کوفتہ پاک“ بنائی تھی پوچھیں جناب گمراہوں کے کیا تبرے تھے۔ تو تقریفیں موصول ہوئی تھیں مابودلت کو۔ شاید بات کا یقین نہیں تھا کہ ہم اتنی اچھی کوکنگ کر سکتے س: ”کون سی رائٹر کو پڑھتے وقت کھانا دہ

ج: ”ہم تو بس جینے کے لیے ہی کھاتے ہیں، بقول ہماری فیملی کے کہ..... ہم اتنا کم کھاتے ہیں کہ ہم سے زیادہ تو ایک چھوٹا بچہ کھانا کھاتا ہوگا۔
س: ”گھر کے کام خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی



اس سے متعلق یادگار واقعہ؟

کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان ٹیکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟

ج: ”کھانا تو نہیں البتہ دودھ یا چائے دھواں ہوئی۔ مطلب اہل کر چو لہے میں مگری، ا ”بشری رحمن“ کو پڑھتے وقت چائے کو کب ا کب وہ چو لہے میں مگری، کچھ پتا ہی نہیں۔ چ پین سے دھواں اٹھنے لگا جب پتا چلا اور مہر۔ مٹاؤں، میں نے جب اسی وقت دوبارہ چائے بھی اہل کر چو لہے میں مگری۔ میں محو ہو جاتی ہو

ج: ”سب سے چھوٹے ہونے کے باعث گھر کچن کے کاموں میں ہماری دلچسپی صفر ہے بس شوقیہ ڈشز کبھی کبھار بنالیتی ہوں اور جہاں تک بات پڑھنے کے شوق کی ہے تو شاید مجھے میرے اسی شوق نے ان کاموں سے دور رکھا ہوا ہے۔“

س: ”پہلی ڈش کون سی بنائی اور گمراہوں کے کیا



بھر بیٹھ کر آرام سے پڑھا۔

س: ”ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے کا بنے، کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تجربے ہوتے ہیں؟“

ج: ”جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں بس شوقہ کو کنگ کرتی ہوں، تو آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے کچھ کہا ہو، کوئی نقص نکالا ہو۔ ہاں کبھی کبھار کچھ تھوڑا اسپاؤسی بن جائے اور کھانے والا سوس کر کے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنے لگے تو..... وہ ہماری گھوریوں کو دیکھ کر بتا کچھ کہے پانی کا گلاس منہ کو لگا لیتا ہے۔ وہ چاہے بھائی ہو یا کوئی اور.....“

س: ”ایسے کون سے آپ کے رشتہ دار یا شوہر کے دوست احباب ہیں جن کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جانا گوارا لگتا ہے؟“

ج: ”نہیں جی، ایسا آج تک نہیں ہوا کہ کسی مہمان کی آمد پر مجھے کچن میں جانا گوارا لگا ہو۔“

س: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ”ان“ کے دل میں اترنے کا راستہ محد سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کرتی ہیں؟“

ج: ”آہم..... آہم..... ارے صاحب! ہم تو ابھی تک سنگل ہی ہیں اور جہاں تک اس خیال سے اتفاق کرنے کی بات ہے کہ ”ان“ کے دل کا راستہ محد سے ہو کر گزرتا ہے تو..... میرے خیال میں تو دل کا راستہ آنکھوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ مطلب آنکھوں سے ہی کوئی دل میں اترتا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد پھر اس دل میں رہنے کے لیے محد کو خوش رکھنا پڑتا ہے، سمجھ میں آیا۔“

س: ”کون سی ڈش دیکھ کر آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو فضا جاتا ہے اور پھر ان کا رول مل گیا ہوتا ہے؟“

ج: ”نہیں جی..... ہمارے ساتھ تو کبھی ایسا نہیں

ہوا۔ جو بھی بتایا، کبھی کسی کو دیکھ کر غصہ نہیں آیا۔ ہاں اب بارہما کی فرمائش پر مٹر پلاؤ بتایا تو اس میں کچھ املی کار زیادہ پڑ گیا تھا اور وہ کچھ کھٹے ہو گئے اور ہماری ماما کو چیزوں سے ایسا ہی بھر ہے کہ جیسا کہ انڈیا کو پاکستان سے۔“

س: ”سسرال میں پہلی چیز کیا بتائی؟“

ج: ”جب جائیں گے سسرال تب دیکھیں گے کیا بتائیں۔“

س: ”گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی ڈش جو آ کرنا گوارا گزرتی ہے؟“

ج: ”ڈشیں تو میں اپنی پسند کی ہی گھر والوں کو بتاتا کھلاتی ہوں۔“

س: ”آپ کے خاندان کی ایشی ڈش کیا ہے؟“

ج: ”بہت سی ہیں..... خاص کر ہماری فیملی کا ”ساگ“ کرمی، بکڑے اور کو فٹے..... بہت دور دور کا خاندان میں مشہور ہیں۔“

س: ”لوگ زیادہ تر کس چیز کی فرمائش کرتے ہیں؟“

ج: ”جہاں تک بات میری ہے تو میرے گھر والوں کو میرے ہاتھ کی بنی ہوئی کچا بہت پسند ہے۔“

☆☆



اسی مکسر کے کباب بنا کر ایک
گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔
بیسن کو پھینٹ لیں نہ زیادہ
گاڑھا نہ زیادہ پتلا۔ بیسن میں
تیل گرم کر کے قیمہ کے کباب
بیسن میں ڈبو کر ڈیپ فرائی
کر لیں۔

☆☆

قو کھیب:

ٹنڈے کو پھیل کر ہر ٹنڈے
سے چار کٹ لگائیں۔ قاش
نہیں ہونی چاہئیں۔ پھر کڑ
تیل ڈال کر تھوڑے تھوڑے
ڈال کر لائٹ براؤن کر لیں
دوسرے برتن میں تیل گرم
پیاز فرائی کریں۔ پیاز
ہو جائے تو ادورک بہن کا پیسہ
کر ڈر اساجون لیں پھر سرسہ
ہلدی، نمک ڈال کر تھوڑا
چلائیں پھر ٹائر ڈال کر کر پا
ہونے تک بھونیں۔

جب مسالا مٹی چھوڑ دیے
مرچ ڈال دیں اور آج بھوک
اس کے اوپر فرائی ٹنڈے۔
جائیں۔ ایک چمچہ چلا دیں
ٹنڈوں پر مسالا اچھی طر
جائے۔ اب گرم مسالا چھڑکا
منٹ کے لیے دم پر لگا دیں
سے گارنش کر کے سرو کریں۔

☆☆

ایک کلو

(ایک جیسے چھوٹے

چھوٹے ہوں)

ایک پاؤ (باریک کاٹ لیں)

آدھا کلو (باریک

کاٹ لیں)

دس عدد

(کاٹ لیں)

ایک کھانے کا چمچہ

ایک چائے کا چمچہ

آدھا چائے کا چمچہ

حسب ضرورت

آدھا چائے کا چمچہ

گارنش کے لیے

حسب ضرورت

اشیاء:-

ٹنڈے

پیاز

ٹائر

ہری مرچ

ادورک بہن

کا پیسٹ

سرخ مرچ

پسی ہوئی

ہلدی

نمک

گرم مسالا

(پسا ہوا)

ہر ادھنیا

تیل

آدھا کلو

آدھا چائے کا چمچہ

آدھا چائے کا چمچہ

حسب ذائقہ

آدھا چائے کا چمچہ

آدھا چائے کا چمچہ

دو عدد (پانی میں

بھیکے ہوئے)

اشیاء:-

قیمہ

ادورک

بہن

نمک

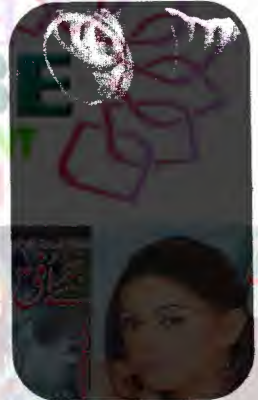
سرخ مرچ

سیاہ مرچ

ڈبل روٹی

کے سلائس

قو کھیب:-



① بیسن میں نمک، سرخ مرچ، کھانا
والا سوڈا، ہلدی اور زرد رنگ ملا دیں۔
قیمہ کا پانی خشک کر لیں۔ اب اسی قیمے
میں ادورک بہن، نمک، سرخ مرچ اور
سیاہ مرچ ڈال دیں۔ ڈبل روٹی کے
سلائس بھی مکسر میں شامل کر دیں۔

اشیاء:

چکن ڈرم انگلس بارہ عدد
کچری پاؤڈر ایک چائے کا عدد
لہسن کا پیسٹ ایک چائے کا چمچ
بھنا کٹا زیرہ ایک چائے کا چمچ
تیل فرائی کے لیے
نمک حسب ذوق
تازہ لیموں کا رس ایک چوتھائی کپ
کالی مرچ حسب ضرورت
کونکہ ایک عدد

توکھیب:

چکن ڈرم انگلس کو نمک، کچری
پاؤڈر اور لہسن کا پیسٹ لگا کر ایک گھنٹہ
میری میٹ کریں پھر ان کو آٹھ سے
دس منٹ تک اسٹیم کر کے ٹھنڈا کر لیں
اور گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں یہاں
تک کہ سنہری ہو جائیں۔ پھر ایک برتن
میں ڈرم انگلس رکھیں۔ اس کے بیچ
کونکہ رکھیں اور تیل ڈال کر تھوڑی دیر
ڈھک دیں تاکہ بارہی کیو کا دھواں
آجائے۔ کئی کالی مرچ بھنا کٹا زیرہ اور
لیموں کا رس چمڑک دیں۔ پراٹھے،
چپانی یا کچے کے ساتھ پیش کریں۔



اشیاء:

چاول ابلے ہوئے ایک کپ
چکن ابلے ہوئے دو کپ
نمک ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ ایک چائے کا چمچ
چاٹ مسالا ایک کھانے کا چمچ
زیرہ ایک چائے کا چمچ
ہری مرچ دو عدد
ہرا دھنیا ایک کپ
چکن پاؤڈر ایک چائے کا چمچ
چلی کارلک ساس تین کھانے کے چمچے
بریڈ کریمب ایک کپ
اٹلے دو عدد

توکھیب:

چاول، آلو، چکن اچھی طرح میٹ
کریں اور تمام مسالا ڈال کر کس
کریں کباب کی ہیپ دے کر اس
پر اٹلے لگائیں اور بریڈ کریمب لگا کر
ڈیپ فرائی پیش کریں۔

اشیاء:

آلو (ابال کر) آدھا کلو
میش کر لیں
کالچ جز (باریک) ایک کپ
چوپ کر لیں
ہری مرچیں تین عدد
(چوپ کی ہوئی)
بھجڑکا پاؤڈر آدھا چائے کا
سیاہ مرچیں (کٹی) آدھا چائے کا
ہوئی

ادریک آدھا چائے کا
(چوپ کر لیں)
میدہ حسب ضرورت
سویا دو کھانے کے
(چوپ کر لیں)
لیموں کا رس ایک کھانے کا
نمک حسب ذائقہ
اٹلے (بھنٹ لیں) دو عدد
مرمرے حسب ضرورت
تیل حسب ضرورت

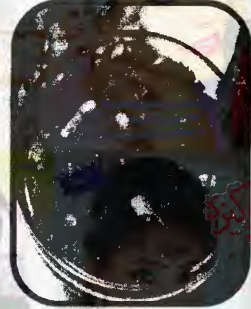
توکھیب:

آلو میں کالچ جز، کٹی ہوئی سیاہ مرچ
ہری مرچیں، بھجڑکا پاؤڈر،
ادریک، لیموں کا رس، نمک، لہسن
کرکس کر کے بھڑکتائیں۔ میدے
رول کر کے اٹلے میں ڈپ کر
مرمرے سے کوٹ کریں اور تھوڑا
فریج میں رکھیں اور گرم تیل میں در
آج پر فرائی کریں اور گارلک سوکڑ
ساتھ پیش کریں۔

☆☆

اشیاء:-

ثابت لال مرچ آٹھ سے دس عدد
مومک پھلی
تل ایک سے دو
کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
گڑ
ایلی کا پیٹ
ایک کپ
حسب ذائقہ نمک



اشیاء:-

اٹھ سے
چھ عدد
ڈبل روٹی کے
چار عدد
سلاکس

دودھ حسب ضرورت
چینی
سکھی
آدھا کپ
حسب ضرورت
چھوٹی الائچی چوٹائی چائے کا چمچ
پسی ہوئی

قو کیب:-

① اٹھوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں
اور ڈبل روٹی دودھ میں بھگو دیں۔ پتلی
میں سکھی ڈال کر اس میں اٹھ سے چھوٹی
الائچی، دودھ میں بھگوئی ہوئی ڈبل
روٹی اور چینی ڈال دیں۔ پھر اس کو
اچھی طرح بھون لیں جب اچھی طرح
بھن جائے اور سکھی چھوڑنے لگے تو
خشک میوہ جات سے گارنش کر کے سرو
کریں۔



اشیاء:-

دو کھانے کے
چمچے
ایک کپ
چار عدد
ایک کپ
حسب ضرورت
کو کو پاؤڈر
کاسٹر شوگر
اٹھ سے
کو کوٹ پاؤڈر
سکھی

قو کیب:-

کو کو ایک بنانے کے لیے سب سے پہلے
اٹھ سے، چینی اور سکھی کو ہاتھ کی مدد سے
پیٹ کر لیں پھر تین میں ڈال کر پکائیں
اور ساتھ ہی چمچ چلاتے رہیں۔ اس
کے بعد کو کوٹ پاؤڈر شامل کر دیں
چمچ چلاتے رہیں پھر اس میں کو کو پاؤڈر
ڈال دیں اور آخر میں ٹرے پر سکھی لگا
اس کپھر میں ڈال دیں اور خشک
کر کے سرو کریں۔

یاسین فرید
تسہانی کا بوجھ اُٹھائے کب تک پھول
توڑنا سونا لگے ہے مجھ کو دنیا کا یہ
پیار کبھی میں مولے تھا اب سونے کے
گھر سے باہر کیسے نکلوں پاس نہ پیسہ در
سیدہ لوبا سجاد

بات پر بات پھر یاد آئی
کہہ چکا اگرچہ سادگی بات
ایک دن ہم نہ ہوں گے دنیا میں
اور رہ جائے ہماری بات

مدف طاہر
ہیں یہ رنج ہے ہم گھر بنا نہیں پا
اگرچہ عمر ہمیں ہو گئی کھاتے ہو
مصم خالد

دل و جان سے گزر جانا چاہتا ہوا
آنا سے جنگ کرنا چاہتا ہو
مکیں کا منتظر ہوں راک مکان ہو
در پچھ ہوں میں کھٹنا چاہتا ہو

ایشال فاطمہ
مجھ ہی پہ قہر جو ٹوٹا تو اس میں حیرت
مرا بھی ہاتھ تھا اس کو خدا بنانے

طاہرہ خاتون
پڑھ کے آیت الکرسی جب میں شب کو سوتا
مجھ کو خواب نازوں میں ناگینیں نہیں
کیسا دودھ بے برکت آگیا ہے اب ہم
رزق سب کو ملتا ہے، برکتیں نہیں

حوا فشین
کرتا ہوں جب طلعہ خود کو بچو
تنہائی کا میں جتن مناتا ہوں دھو

زبیرہ خان
تم ہو کلیم حبيب دیوانے بات انوکھی کہتے ہو
پاؤں کا بھی ارمان ہے دل میں خوف بھی ہے بولی کا
یاسین سکول
اندھیرے بعد تعاقب میں میرے رہتے ہیں
میں ان میں گھر کے اُجالوں کی بات کرتی ہوں
ماہا حسین

صرف وہ ایک شخص کسی طرح مل جاتا
مجھے منظور تھا پھر جتنے تنہا رہے ہوتے
شاہدہ ظہور

اپنے تیرے تو سنبھالو کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں
سارہ کلن

یہ عجیب ہے محبت کہ زمانہ جانتا ہے
نہ ملو اس کی مانتا ہوں نہ وہ میری مانتا ہے
کوئی اس سے جا کے پوچھے اے کیا ملا پھر کے
میں بھی خاک چھانتا ہوں وہ بھی خاک چھانتا ہے
ندا اویس

ہر دھڑکے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں
فضہ، ندا طابق

اپنی آنکھوں کے سمند میں اُتر جانے دے
تیرا عزم ہوں مجھے ڈوب کر مرنے دے
آسید جاوید

دل و جاں ہیں اُداس سے میرے
اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

حق اقبال
تم بارسا سہی مگر اتنا تو سوچ لو !
کچھ دیکھ ہی لیا تھا جوں بد گل ہے اب

مدف خاتون
خود کو پھر ترک محبت کی مزادی میں نے
پھر کوئی یاد تری دل سے منادی میں نے

ہیکج

ایک خاتون نے اپنے شوہر سے اٹھلاتے ہوئے
چھا۔

”میں نے سنا ہے کہ جنت میں مردوں کو حوریں
میں کی تو عورتوں کو کیا ملے گا؟“

شوہر نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔ یہ
کچھ صرف مظلوم طبقے کے لیے ہے۔“

فوزیہ ٹبرٹ..... سبکرات
رہنمائی

ایک صاحب ایک روز گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کی بیگم
بہانے کر کے گردشی کا پھندہ ڈالے لے کر سی پرکھڑی ہیں اور رتی کا
سراسر اجماع کے پٹے سے بندھا ہوا ہے۔

”بیگم کیا کر رہی ہو؟“ وہ پریشان ہو کر چلائے۔
”میں اس گھر کے حالات سے تنگ آ کر خودکشی
کر رہی ہوں۔“ ان کی بیگم نے جواب دیا۔

”لیکن خودکشی کے لیے تو پھندہ گلے میں ڈالا جاتا
ہے۔“ انہوں نے گویا بیگم کی رہنمائی کی۔

”پہلے میں نے پھندہ گلے میں ہی ڈالا تھا لیکن اس
سے میرا دم گھٹنے لگا۔“ بیگم نے جواب دیا۔

تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ
سلاڑھ آٹھ سے نو

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ریڈیو پر سچ ساڑھے آٹھ
بجے کلاسیک موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ پروڈیوسر
جب کے ایک جاننے والے نے انہیں فون کیا اور کہا۔

”موسیقی بہت خراب ہے، یہ آپ کیا بجا رہے ہیں؟“
پروڈیوسر صاحب نے بے ساختہ جواب دیا۔

”ہم دراصل ساڑھے آٹھ سے نو بجا رہے ہیں۔“
کشن چوہدری..... سبکرات

ہولیس والے
ایک پولیس انسپکٹر کی شادی تھی۔ بارات جاری تھی

اور وہ اپنے دوست کے ہمراہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ چچے
آنے والی باتوں کی بس کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے
دوست سے کہنے لگا۔

”چچے جو بس آ رہی ہے وہ مجھے مشکوک لگتی ہے۔ کہ
سے یہاں تک برابر ہمارا چچا کر رہی ہے۔“

مختر غلام محری..... مظلوم
طویل عمر کا راز

ایک صحت مند شخص کی زندگی کے سو سال پورے
ہو گئے تھے۔ اخباری نمائندے نے اس سے پوچھا۔ ”آپ
کی صحت کا راز کیا ہے؟ آپ اپنی سو سالہ زندگی کس چیز کی
مرہون منت سمجھتے ہیں؟“

پوڑے نے جواب دیا۔ ”اکیس سال کی عمر میں میری
شادی ہوئی۔ میرے اور میری بیوی کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ
کسی اختلاف اور بحث کی صورت میں، ہارنے والا ایک گھنٹے
کے لیے ٹھٹھکے لکل جایا کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ تازہ ہوا کے
انہی برسوں نے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے۔“

اقرا ممتاز..... سرگودھا
راہ گھوڑ

ایک راہ گیر نے دوسرے راہ گیر کو روک کے کہا۔
”معاف کیجیے گا۔ میرا خیال ہے، میں نے آپ کا چہرہ
کہیں دیکھا ہے؟“

”شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ میں اپنا چہرہ
ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔“

کرن عمران احمد..... ساہیوال
نکرو

ایک آدمی سانگیل چلا رہا تھا کہ اچانک اس کی نگر
ایک چھوٹے لڑکے سے ہوئی تو لڑکا تیز آواز میں رونے
لگا۔ آدمی نے جلدی سے اسے ایک روپیہ تھمایا اور چپ
ہونے کو کہا۔ لڑکے نے جلدی سے پوچھا۔

”انکل پھر کب ملو گے؟“

نہیں چھوڑتے، مایوسی کی جگہ بھی تیز ہوا ہو، یہ سب کو بچھنے نہیں دیتے۔

(محمود ظفر اقبال ہاشمی..... قرطاس ا)

اقراء عزیز..... گاؤں دریا

انسان کی نیت

کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی نیت سمجھ نہ سکتا۔ وہ اس کا دل چیر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے ذہن اتر سکتا۔ سب سے بڑھ کر کسی دوسرے کے متعلق کرنے والا خود غلط ہو سکتا ہے۔ وہ غمی نہیں۔ اس اترتے وحی نہیں آتی۔ اسے خدا کا تحفظ حاصل نہیں اس کا حق ہی نہیں کہ کسی دوسرے فرد کے متعلق کو کرے۔ رائے ہمیشہ دوسرے کی رائے کے بار جاتی ہے۔

اس سے بڑھ کر اس کی شخصیت، آخ اور نیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا اسے غضب کو بھڑکانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ (ابو یحییٰ..... تہ فائزہ ب)

انسان کی تباہ

جستجو میں کبھی کبھی انسان اپنے در جاتا ہے اس کو یاد آیا اس کا باپ اسے ہمیشہ کچھ حاصل کرنے کی جستجو میں ان لمحوں اور خیال رکھنا جو انسان کی زندگی میں بڑے اہم تھے تو ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے امر بنا دیتے ہیں اور کبھی ایسے انسان کی زندگی میں ٹھہر جاتے ہیں تو پھر بڑ ہے۔ انسان ایک دورا ہے پر آکھڑا ہوتا ہے ہے تو کبھی فنا۔

(وقت جو ٹھہر گیا.....)

محسن چوہدر

ناسور

یہ سچ ہے کہ وقت ہر زخم کا مرہم بن جاتا ہے۔ کوئی بھی زخم کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، وقت کا بہاؤ اسے بہا لے جاتا ہے۔ لیکن کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں، جن پر کھریٹ بن جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سخت ہو جاتی ہے پھر جب اس بے رحم وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم ایسے زخموں کو کھرچنے لگتے ہیں تو ان سے دوبارہ لہور سننے لگتا ہے اور وہ زخم ہمارے دل کا ناسور بن جاتے ہیں۔

(خوشبو کا سفر..... شمیم طارق)

فوزیہ شمر بٹ..... سبکدوش

یہ محبتیں

”میں تو بس اتنا جانتی ہوں مایا کہ جو تکلیفیں ہمیں توڑ کر اللہ سے جوڑتی ہیں۔ انہیں ہرگز کو سنا نہیں چاہیے، ان کے حق میں دعا نہیں کرنی چاہئیں کہ انہوں نے آپ کو کمزور، بے فیض سہاروں سے محروم کر کے آپ کو اکیلا چھوڑا۔ آپ کو توڑنا کہ آپ ٹوٹے ہوئے وجود سے جھکیں، تو سامنے اللہ دکھائی دے۔ وہ اللہ جو تب بھی وہاں موجود تھا، جب ہم بت سجائے دلوں میں، آسمان میں اڑتے تھے اور وہ اب بھی وہاں موجود ہے جب ہم ٹوٹے پروں سے زمین پر گر کر چکنا چور ہوں آخر یہ ٹوٹا ٹھکڑا اور کب تک؟ مگر نہیں..... ہم ذرا سے سنبھلتے ہیں، تو پھر اٹھ کر پھر سے نت نئے چہروں کو دیکھتے ہیں ورنہ اہم دلس نکالے نہیں ہیں ہم آج بھی جا ہیں، تو اپنے راستے ہدایت والوں کی طرف موڑ دیں اور یقین جانو، رب کی مقرر کردہ حدود میں ہی سکون ہے۔

مصباح مشتاق..... اے دل راز داں

گڑیا..... میا نوالی

امید اور خوش گمانی

اگر دو نئے یار بنانے ہیں تو امید اور خوش گمانی سے اچھے یار بھلا اور کون ہو سکتے ہیں یہ دونوں یار ہی منزلیں اور نئے آسمان ڈھونڈنے کے لیے آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ یہ دونوں ایسے بھن ہوتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے انسان کے ہاتھ میں منزلیں اور آسمان رکھ دیتے ہیں۔ کبھی انسان کو تنہا